UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی

MAUL-202

Tarjuma Nigari Aur Ablaghiyat

(ایم –اے اردو ' سال دوم)

چھٹا پرچہ

ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY,

HYDERABAD

MAUL-202

(ایم –اے اردو ' سال دوم)

چھٹا پرچہ

ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

Uttarakhand Open University, Haldwani-263139 (Nainital)

Phone: 05946-261122, 261123 Tool free No. 1800 180 4025

Fax: 05946-264232, E-mail: info@ uou.ac.in,http://uou.ac.in

ایڈمنسٹریٹو و اکیڈمک انتظامیہ

پروفیسر سبھاش دھولیا

وائس چانسلر' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی ۔

پروفیسر ایچ ۔پی شکلا

ڈائرکٹر'اسکول آف لینگویجز' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی ۔

پروفیسر گرجا پانڈے

رجسٹرار ' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی ۔

ڈاکٹر اختر علی

کورس کو آرڈینیٹر و اکیڈمک ایسوسی ایٹ ' شعبہ اردو

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی 'ہلدوانی ۔

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے حاصل اجازت (ایم-او ۔یو) کے بعد رجسٹرار ' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی '

ہلدوانی کے ذریعہ ری پرنٹنگ کاپی کی شکل میں شائع کیا گیا۔ اشاعت- جولائی ۲۰۱۳

(BKID-099)

ایم۔ اے ' اُردو ' سال دوم

فاصلاتی تعلیم

چھٹا پرچہ

ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

گچی باؤلی' حیدرآباد - 500032

زیر اہتمام : نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

وزیٹر

عزت مآب صدر جمہوریہ ہند بھارت رتن ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

چانسلر

پروفیسر عبید صدیقی

وائس چانسلر

پروفیسر اے ایم پٹھان

رجسٹرار

جناب فاروق احمد کے اے ایس

فینانس آفیسر

جناب وائی جینت راؤ آئی اے اینڈ اے ایس

کنٹرولر امتحانات

ڈاکٹر ایس اے وہاب قیصر

نظامت فاصلاتی تعلیم

EPABX : 040-23006612-15, Fax : 040-23006121

ڈائرکٹر

پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد Ext : 305

پروفیسر

ڈاکٹر مظہرالدین فاروقی Ext : 304

ریڈر

ڈاکٹر پی۔ فضل رحمٰن Ext : 126

اسسٹنٹ ڈائرکٹرس

ڈاکٹر علی رضا موسوی Ext : 121

جناب شہید خان Ext : 123

لکچرر

ڈاکٹر نکہت جہاں Ext : 330

اسسٹنٹ رجسٹرار

جناب مہیش کمار ویراگی Ext : 125

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر کے۔ آر۔ اقبال احمد، ڈائرکٹر و صدر شعبۂ فاصلاتی نظام تعلیم

مدیر ترجمہ نگاری : ڈاکٹر ابوالکلام، اسسٹنٹ ڈائرکٹر

ابلاغیات : ڈاکٹر محمد ظفرالدین، ریڈر و صدر، شعبۂ ترجمہ

کورس کوآرڈی نیٹر : ڈاکٹر نکہت جہاں، لکچرر، شعبہ فاصلاتی تعلیم

نصابی کمیٹی برائے ایم اے اردو (فاصلاتی تعلیم) :

پروفیسر مغنی تبسم	پروفیسر غیاث متین
پروفیسر سیدہ جعفر	پروفیسر بیگ احساس
پروفیسر اشرف رفیع	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
پروفیسر لئیق صلاح	ڈاکٹر عقیل ہاشمی
پروفیسر انورالدین	ڈاکٹر مجید بیدار

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

طبع 2011

طباعت EMESCO BOOKS, HYDERABAD – 29.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی انداز میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

مزید معلومات کے لئے ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032 سے ربط پیدا کریں۔

مضمون نگار

ترجمہ نگاری :	پروفیسر قمر رئیس	دہلی یونیورسٹی، دہلی (ریٹائرڈ)	اکائی 1
	ڈاکٹر ابوالکلام	اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 2,12,15
	ڈاکٹر خلیق انجم	جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی	اکائی 3,11
	ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس	لکچرر، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 4
	ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی	اسسٹنٹ لائبریرین، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد (ریٹائرڈ)	اکائی 5
	پروفیسر نصیر احمد خاں	جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 6
	ڈاکٹر ارجمند آرا	لکچرر، دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 7
	ڈاکٹر ظہیر علی خاں	لکچرر، دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 8
	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	ڈپٹی چیف پروڈیوسر، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی (ریٹائرڈ)	اکائی 9
	پروفیسر رحمت یوسف زئی	حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد (ریٹائرڈ)	اکائی 10
	ڈاکٹر محمد خالد المبشر الظفر	لکچرر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 13
	جناب جمیل شیدائی	فری لانس رائٹر، حیدرآباد	اکائی 14
ابلاغیات :	پروفیسر شاہد حسین	جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 16
	جناب آفتاب عالم بیگ	لکچرر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 17
	پروفیسر محمد انور الدین	حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 18
	ڈاکٹر شاہد پرویز	ریجنل ڈائرکٹر دہلی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 19
	جناب کبیر احمد	اسٹیشن ڈائرکٹر (ریٹائرڈ) آل انڈیا ریڈیو، حیدرآباد	اکائی 20
	جناب معین اعجاز	اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر (ریٹائرڈ) آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی	اکائی 21
	جناب انجم عثمانی	اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر، دوردرشن کیندر، نئی دہلی	اکائی 22
	ڈاکٹر رضوان الحق	دہلی یونیورسٹی، دہلی	اکائی 23
	ڈاکٹر وارث احمد خاں	ڈپٹی ڈائرکٹر، EMPC اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی	اکائی 24
	پروفیسر اسد نظام	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 25
	پروفیسر یوسف کمال	سابق ڈائرکٹر A.V.R.C، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	اکائی 26
	پروفیسر شافع قدوائی	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	اکائی 27
	ڈاکٹر محمد ظفر الدین	ریڈر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدآباد	اکائی 28

فہرست

اکائی نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ نگاری		
اکائی 1	ترجمے کا فن اور اس کی قسمیں	7
اکائی 2	ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات	13
اکائی 3	ترجمے کے بنیادی مسائل	29
اکائی 4	ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات	44
اکائی 5	ترجمے کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل	55
اکائی 6	ترجمے کی روایت واہمیت اور اصطلاحی ولسانیاتی مسئلے	67
اکائی 7	اردو میں ترجمے کی روایت واہمیت	80
اکائی 8	اردو میں ادبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	94
اکائی 9	نثری اور اور منظوم ترجمے میں فرق	108
اکائی 10	اردو میں علمی وفنی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	120
اکائی 11	اردو میں دفتری وقانونی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	130
اکائی 12	اردو صحافت میں ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل	139
اکائی 13	اردو میں سائنسی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	151
اکائی 14	اردو میں مذہبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل	167
اکائی 15	انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ۔ چند مثالیں	181
ابلاغیات		
اکائی 16	ابلاغیات اور اس کی قسمیں	202
اکائی 17	اردو صحافت: اخبارات کا آغاز وارتقا	221
اکائی 18	اخبار نویسی کے اصول	234
اکائی 19	انٹرویو کی تکنیک	249
اکائی 20	ریڈیو: آغاز وارتقا	258
اکائی 21	ریڈیائی نشریات اور ان کی قسمیں	270
اکائی 22	ٹیلی ویژن: آغاز وارتقا اور نجی کاری	282
اکائی 23	ٹیلی ویژن کی مختلف نشریات	291
اکائی 24	ٹیلی ویژن اور اس کی اہمیت	305
اکائی 25	ہندستان میں تعلیمی ٹیلی ویژن	313
اکائی 26	اشتہارات	322
اکائی 27	نئی ترسیلی تکنالوجی	331
اکائی 28	تعلقاتِ عامہ	341

پیش لفظ

پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت جنوری 1998 ء میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں اس یونیورسٹی کو روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرنے کا استحقاق بخشا گیا۔ اُردو ذریعہ تعلیم کی ملک کی واحد اور منفرد یونیورسٹی ہونے کے ناطے اُردو یونیورسٹی نے ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تمام تر اُردو آبادی کا احاطہ کرنے اور اس کے فیوض وبرکات سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یونیورسٹی میں فاصلاتی طریقہ تعلیم کو اولیت دی گئی اس لیے کہ اُردو والے ملک کی ہر ریاست میں آباد ہیں اور یونیورسٹی کے ثمرات اُن تک پہنچانے کے لیے فاصلاتی نظام سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ اس نظام تعلیم کی اپنی خصوصیات اور امتیازات ہیں جن میں ایک اہم اور کلیدی نکتہ یہ ہے کہ اس میں ہر کورس کے تمام طالب علموں کو مکمل نصابی مواد فراہم کرنا لازمی ہے۔ گویا کسی کورس کے آغاز سے قبل نصابی کتب کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام انجام دینا ہوگا۔ اور جب تمام علوم ومضامین کا نصابی مواد اُردو میں مطلوب ہو تو یہ کام مزید دقت طلب اور دشوار گزار ہو جاتا ہے۔ شروع ہی سے یہ چیلنج اُردو یونیورسٹی کے پیش نظر رہا ہے جس سے نپٹنے کے لیے جولائی 1998ء میں ٹرانسلیشن ڈویژن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بظاہر یہ شعبہ ترجمے کی ذمہ داریوں تک محدود معلوم ہوتا ہے لیکن ٹرانسلیشن ڈویژن کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اپنے نام سے مترشح ہونے والے دائرہ کار سے کافی آگے بڑھ کر کام کرتا رہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ شعبہ اُردو یونیورسٹی کے لیے درکار نصابی مواد کی تیاری اور اشاعت کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ تعلیمی پروگرام کے فوری آغاز کے لیے ابتدا میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا بی اے اور بی ایس سی کا نصابی مواد مستعار لیا گیا اور جزوی ترمیمات کے بعد شائع کرلیا گیا۔ اس کے بعد تراجم پر توجہ کی گئی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کی بی کام کی 54 کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا گیا۔ اُردو میں پہلی بار کامرس میں گریجویشن سطح کی نصابی کتابیں تیار ہوسکیں۔ کمپیوٹنگ کورس کی 12 کتابیں بھی انگریزی سے ترجمے کے بعد شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ ٹرانسلیشن ڈویژن نے انگریزی اور ہندی کے ذریعے اہلیت اُردو کے دو سرٹی فیکیٹ کورس، فنکشنل انگلش کے ایک سرٹی فکیٹ کورس اور ٹیچ انگلش کے ایک ڈپلومہ کورس کی کتابیں ماہرین کے مرتبہ نصاب کے مطابق تیار کیں۔ اسی طرح یونیورسٹی اب فاصلاتی تعلیم کے گریجویشن سطح کے نصاب کی تیاری میں بھی مصروف ہے تاکہ اس یونیورسٹی کے طلبہ کی ضروریات کے مطابق عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کتابیں تیار ہوسکیں۔

پوسٹ گریجویشن کی سطح پر فاصلاتی طرز پر اُردو یونیورسٹی میں سب سے پہلے ایم اے اُردو کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا جس کے لیے مختلف جامعات کے سنئیر اساتذہ نے نصاب تیار کیا۔ یہ نصاب سال اول اور سال دوم کے آٹھ پرچوں پر مشتمل ہے۔ نصابی کمیٹی کا خیال تھا کہ اُردو زبان پر عبور کے لیے فارسی زبان وادب سے کسی حد تک واقفیت ضروری ہے۔ نیز قومی یونیورسٹی کے طالب علموں کو قومی زبان سے بھی قریب تر رکھنے کی ضرورت ہے' چنانچہ ایم اے سال اول میں فارسی اور ہندی کا ایک مشترکہ پرچہ شامل کیا گیا ہے۔ اُردو زبان وادب کی تاریخ' دکنیات' کلاسیکی نثر ونظم' جدید ادب' فکشن' ادبی تحریکات و رجحانات سے متعلق مختلف اہم عنوانات پر ملک کی یونیورسٹیوں سے وابستہ قابل اساتذہ کرام سے اسباق لکھوائے گئے ہیں۔ طالب علموں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوسکے مشاورتی جماعتوں اور سفارش کردہ کتابوں سے بھی استفادہ کریں گے۔

اگر آپ زیرنظر کتاب میں کوئی غلطی یا کمی محسوس کریں تو ہمیں ضرور مطلع کریں تاکہ ماہرین سے مشورے کے بعد آئندہ اشاعت میں ترمیم کی جاسکے۔

اے ایم پٹھان

(پروفیسر اے ایم پٹھان)

وائس چانسلر

اکائی 1 : ترجمے کا فن اور اس کی قسمیں

ساخت

1.1 تمہید

1.2 فنِ ترجمہ نگاری

1.3 ترجمے کی قسمیں

1.3.1 تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کا ترجمہ

1.3.2 تخلیقی ادب کا ترجمہ

1.3.3 شاعری کا ترجمہ

1.3.4 نثری تخلیقات کا ترجمہ

1.4 علمی اور معلوماتی کتابوں کا ترجمہ

1.5 خلاصہ

1.6 نمونۂ امتحانی سوالات

1.7 فرہنگ

1.8 سفارش کردہ کتابیں

1.1 تمہید

ترجمے کے لغوی معنی ہیں دوسری زبان میں بدلنا یا ایک زبان سے دوسری زبان میں مطلب ادا کرنا۔ ایک اصطلاح کے طور پر بھی ترجمے کا مطلب اس سے مختلف نہیں ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر اب تک دنیا میں علوم کی ترقی اور اشاعت میں ترجموں کا بہت اہم رول رہا ہے۔ زمانۂ قبل مسیح میں افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں نے جو کچھ قدیم یونانی زبان میں لکھا وہ ترجموں کے ذریعے ہی دوسری زبانوں تک پہنچا۔ اسی طرح اسلام کے عروج کے دور میں بوعلی ابن سینا، موسیٰ الخوارزمی اور البیرونی نے عربی زبان میں جو علمی کتابیں لکھیں وہ پہلے لاطینی اور پھر دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر ساری دنیا میں پھیلیں۔ آج بھی دنیا کی مختلف زبانوں میں اعلیٰ معیار کی جو علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی جا رہی ہیں وہ ترجمے کے ذریعے ہی دنیا کے دوسرے ملکوں میں پہنچ رہی ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں ترجمے کا بہت اہم حصہ رہا ہے۔

1.2 فنِ ترجمہ نگاری

ترجمہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر آدمی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کر سکتا۔ اس کام میں طبیعت کا میلان اور شوق ہونا ضروری ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں صرف لفظی مفہوم بیان کر دینے کو مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔ ترجمے میں مترجم کی سوجھ بوجھ، خوش ذوقی اور دونوں زبانوں کے الفاظ کی معنوی اور صوتی خوبیوں کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر ترجمہ کامیاب نہیں کہا جائے گا۔

بے شک ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہے۔اس کے لیے ایک خاص صلاحیت' خاص ڈسپلن (Descipline) اور کچھ خاص اور مستند معلومات درکار ہوتی ہیں۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کامیاب ترجمے کے لیے مترجم کو درج ذیل شرطیں پوری کرنی چاہئیں۔

الف

مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت ہونی چاہیے۔ ہر زبان کی اپنی باریکیاں' خوبیاں اور نفاستیں ہوتی ہیں۔ان کی پوری سمجھ ہونی چاہیے۔یہی نہیں بلکہ ترجمہ کرتے ہوئے ایک زبان کی خوبیوں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔

ب

ہر زبان میں محاوروں' کہاوتوں اور روزمروں کا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔ ہر ادیب اور عالم اپنی مادری زبان میں لکھتے ہوئے ان کا استعمال کرتا ہے اور ان کے وسیلے سے اپنی تحریر کو رواں اور دلکش بناتا ہے۔مترجم کو اصل تخلیق / مقالے کی زبان اور ترجمے والی زبان کے محاوروں اور کہاوتوں پر یکساں قدرت ہونی چاہیے۔

ج

ہر قوم کی زبان میں اس کی تہذیب کی لطافت اور نزاکت چھپی ہوتی ہے۔اس کو اہل زبان ہی جانتے ہیں۔خاص طور سے تخلیقی ادب یعنی شاعری' افسانہ وغیرہ میں تہذیبی عناصر زیادہ جگہ پاتے ہیں۔مترجم اپنی مادری زبان کے تہذیبی پہلوؤں سے یقیناً واقف ہوتا ہے لیکن جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس کی تہذیبی فضا سے بھی اس کی واقفیت جس حد تک ممکن ہو ضروری ہے۔

د

اگر ترجمہ کسی غیر تخلیقی تحریر' یعنی علم و فن کی کسی تصنیف کا ہو رہا ہے تو اس کے لیے اس علم یا فن کی اصطلاحات کا علم بھی ضروری ہے اور یہ علم اصل زبان اور ترجمے والی زبان دونوں کا ہونا چاہیے۔ورنہ ترجمہ ناقص رہے گا اور اس کا مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔فن ترجمہ نگاری کے ایک ماہر گوپال شرمانے ''ترجمہ اور تکنیکی اصطلاحات'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "Technical terms should be so mover into the texture of translation that the genius of language is not distorted."
>
> یعنی تکنیکی اصطلاحات کو ترجمے کے تار و پود میں اس طرح سمویا جانا چاہیے کہ زبان کی فطری روح مسخ نہ ہو۔''

اس کام میں بڑی دشواری اس وقت پیش آتی ہے' جب ترجمے والی زبان میں اس علم یا فن کی اصطلاحات موجود نہ ہوں۔اس صورت میں موزوں و مناسب اصطلاحات کی تلاش کی جاتی ہے اور اگر موزوں اصطلاحات نہ ملیں تو ان کو وضع کیا جاتا ہے اور اصطلاحات بنانے یا وضع کرنے کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جن کی پابندی ضروری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فن ترجمہ نگاری کی تعریف بیان کیجیے۔
2. فن ترجمہ نگاری میں کامیاب ترجمے کے لیے کیا شرائط ہونی چاہئیں؟

1.3 ترجمے کی قسمیں

انگریزی میں ترجمے کے فن پر تھیوڈر ساوری نے ایک کتاب شائع کی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ ترجمے کے فن' اصولوں اور اس کے طریق کار پر عالموں اور مترجموں نے مختلف طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔تھیوڈر نے ان کا خلاصہ اس طرح کیا ہے۔

1- ترجمے میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
2- ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہو۔
3- ترجمہ بالکل اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
4- ترجمے کو ترجمے ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
5- ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
6- ترجمے میں اصل متن سے حذف و اضافہ ممکن نہیں۔
7- نظم کا ترجمہ منظوم یا نثر میں ہوسکتا ہے۔

تھیوڈر ساوری کا خیال ہے کہ درحقیقت ترجمے کی دو قسمیں ہی ہوتی ہیں۔

(الف) آزاد ترجمہ

(ب) لفظی ترجمہ

وہ آزاد ترجمے کی خصوصیات گناتے ہوئے کہتا ہے کہ آزاد ترجمہ بالکل اصل کی طرح ہو۔ اسے پڑھتے ہوئے یہ بھی محسوس نہ ہو کہ وہ کس زبان سے کیا گیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مترجم اصل متن سے کچھ انحراف بھی کرسکتا ہے۔ آزاد ترجمہ کرتے وقت ایک طرح سے مترجم اصل مصنف کا فرض ادا کرتا ہے یعنی اصل مصنف کی تخلیق کے تاثر کو ترجمے میں پیش کرتے ہوئے اسے بددیانتی نہیں کرنی چاہیے۔

اس کے برعکس لفظی ترجمے میں مترجم اصل متن سے ذرا بھی انحراف نہیں کرسکتا۔ وہ متن کا پابند اور وفادار ہوتا ہے۔ دیانت داری برتنے کے باوجود اُسے ترجمے کی افادیت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ترجمہ دلچسپی اور آسانی سے پڑھا جائے۔ اس میں پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ مترجم اپنی زبان کے محاورات اور اظہارات پر پورا عبور رکھتا ہو۔

موضوع، طریقِ کار اور تکنیک کے لحاظ سے ترجمے کی دوسری کئی قسمیں بھی کی جاسکتی ہیں۔ ترجمے تو قدیم زمانے سے ہوتے آئے ہیں لیکن ترجمے کے اصولوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ہر مترجم اپنے ڈھنگ سے ترجمہ کرنے لگتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں مغرب میں ترجمے کا فن، اس کی اقسام اور دوسرے مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض شروع ہوا۔ جب کہ مشرق خصوصاً ہندوستان کی زبانوں میں بیسویں صدی میں مغرب کے زیر اثر ترجمے کے اصول وضع کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔ خاص طور سے دارالترجمہ حیدرآباد میں نصابی ضرورتوں کے لیے علمی کتابوں کے ترجمے اور وضع اصطلاحات کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ ورنہ اس کے پہلے اخذ و ترجمے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا اور فارسی یا دوسری زبانوں کی کتابوں کو اخذ و ترجمہ کرکے انہیں طبع زاد کتابوں میں شامل کرلیا جاتا تھا۔

1.3.1 تخلیقی اور غیر تخلیقی ادب کا ترجمہ

نثر اور نظم کی تحریروں اور کتابوں کو بالعموم دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(الف) تخلیقی ادب جیسے شاعری، ڈرامہ، افسانہ، ناول وغیرہ۔

(ب) غیر تخلیقی یا معلوماتی ادب، جس میں ہر طرح کے علوم و فنون، سائنس اور ٹکنالوجی پر لکھی ہوئی تحریریں اور کتابیں شامل ہیں۔ چوں کہ دونوں طرح کی تحریروں کے ترجمے کا طریق کار کافی مختلف یا الگ ہوتا ہے، اس لیے ان پر علاحدہ غور کیا جانا مناسب ہوگا۔

1.3.2 تخلیقی ادب کا ترجمہ

تخلیقی ادب کے ترجمے کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) شاعری کا ترجمہ

(ب) افسانوی ادب، ڈرامہ اور دوسری نثری تحریروں کا ترجمہ

1.3.3 شاعری کا ترجمہ

عام طور پر شاعری کا ترجمہ سب سے مشکل مانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ شاعری کی اصناف میں فن کی نازک خوبیاں بہت ہوتی ہیں، جن کے ترجمے میں دشواری پیش آتی ہے۔ پھر یہ کہ اکثر زبانوں کی شاعری میں اصناف الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان کے موضوعات اور فنی تقاضے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان کو ترجمے میں قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً اردو زبان میں غزل، مرثیہ اور ریختی جیسی اصناف ہیں۔ انگریزی یا جرمن زبان میں ان کا وجود نہیں۔ اس لیے ان زبانوں میں ان اصناف کا کامیاب ترجمہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔ اصناف کے فرق کے علاوہ اس مشکل کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری میں زبان کی باریکیوں اور اس کی تہذیب کی نزاکتوں کا گہرا اثر ہوتا ہے اور ان کا استعمال ہوتا ہے، جو استعاروں، کنایوں، تلمیحات اور شعری صفتوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ان کے وسیلے سے ہی شاعر اپنے کلام میں شعریت، معنویت اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔ اپنے تخیل اور تخلیقی ہنر سے وہ شاعری میں ایسا تانا بانا (Texture) پیدا کرتا ہے جو قاری کے جذبہ و احساس میں ارتعاش پیدا کر کے حسین معنی کی نئی دنیا سامنے لاتا ہے۔ اس لیے شاعری کے فن پاروں کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا کام بہت صبر آزما ہوتا ہے۔

اس مشکل پر قابو پانے کے لیے شاعری کے ترجمے میں بالعموم دو طریقے برتے جاتے ہیں۔

1- شعری تخلیق کی ہر سطر کا لفظی ترجمہ کر کے اس کے مفہوم یا شاعر کے تجربے کی کیفیت کو ادا کرنا۔

2- شعری تخلیق یا نظم کے مطالعے سے مترجم کے ذہن میں جو تاثر پیدا ہو، معنوی اور جمالیاتی طور پر شاعر کے جس تجربے کی ترسیل ہو، مترجم اپنے الفاظ میں اس کی بازآفرینی کر کے یعنی اس نظم کے خیال یا تجربے کو دوبارہ اس طرح جنم دے کہ وہ اپنے آپ میں ایک تخلیق کا درجہ اختیار کر لے۔

اس بات کو مشہور فرانسیسی شاعر پال ولیری نے اس طرح کہا ہے:

> "To translate is to reconstitute as nearly as possible, the effect of a certain cause (The Original) by means of another cause (The translation).

ترجمہ: ''ترجمہ کرنا کسی علت (اصل تخلیق) کے معلول کی ایک دوسری علت (ترجمہ) کے توسط سے امکانی قربت (صحت) کے ساتھ تشکیل نو کرنا ہے''۔

یعنی ولیری کے مطابق مترجم کی وفاداری اصل شاعر یا اس کی تخلیق سے نہیں بلکہ اُس تاثر سے ہوگی جو وہ تخلیق مترجم کے اندر پیدا کرے گی۔ اس تاثر کی بازآفرینی ہی کامیاب ترجمہ ہوگی۔ اور اس ترجمے کے عمل میں مترجم کم و بیش اسی تخلیقی عمل سے گزرے گا، جس سے کہ اصل شاعر گزرا ہوگا۔

شاعری کے تخلیقی ترجمے کا یہ بہت مثالی تصور ہے۔ اس میں اگر کسی کو کامیابی حاصل ہوئی ہے تو فارسی کے شاعر عمر خیام کی رباعیوں کے اُس ترجمے کو حاصل ہوئی جو انگریزی زبان میں فٹز جیرالڈ نے کیا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایرانی یا مشرق کے لوگ اسے ترجمہ نہیں مانتے۔ اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ اگر اصل شاعر کی نظم وزن کی پابند ہے تو ترجمہ بھی پابند ہو یا آزاد ہو؟ اگر مترجم پابند نظم کا ترجمہ پابند فارم میں کرے گا تو اس کی مشکلات اور ذمے داریوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ نظم کے خیال کی ترسیل کے لیے اُسے اسی پابند فارم یا ہیئت میں ترجمہ کرنا ہوگا، جو نظم کے تاثر کو زیادہ سے زیادہ حد تک، ترجمے میں منتقل کر سکے۔

1.3.4 نثری تخلیقات کا ترجمہ

شاعری کے مقابلے میں نثری تخلیقات کا ترجمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ نثری ادب میں ناول، افسانہ، ڈرامہ اور انشائیہ وغیرہ شامل ہیں۔ ڈرامے کے

فارم سے قطع نظر یہ تمام نثری تخلیقات عموماً بیانیہ نثر کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اپنی تخلیق میں تخلیق کار عموماً بیانیہ نثر میں کچھ واقعات بیان کرتا ہے اور کچھ کرداروں کی داخلی یا خارجی زندگی کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی نثر میں بھی تخلیقی اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ تمثیل یا تشبیہہ و استعارے سے کام لیتا ہے۔ انسانی رشتوں کی پیچیدگی پر سے بھی وہ پردہ اٹھاتا ہے۔ لیکن تخلیقی عناصر کے باوجود ان تخلیقات کے بیانیہ کا ترجمہ آسانی اور کامیابی سے ممکن ہے۔ اُردو میں دنیا کی مختلف زبانوں کے بعض عظیم افسانہ نگاروں مثلاً ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں اور او۔ ہنری کی تخلیقات کے بڑے کامیاب ترجمے ہوئے ہیں۔ اسی طرح کالیداس، ٹیگور، مولیر اور برنارڈ شا کے ڈراموں کے معیاری ترجمے بھی ملتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے فن اور اصولوں کے تعلق سے تھیورڈ ساوری کا نظریہ کیا ہے؟
2. نثری ترجمے کی تعریف بیان کیجیے۔

1.4 علمی اور معلوماتی کتابوں کا ترجمہ

آج کی دنیا میں نئے خیالات اور نئی تحقیقات کی ترویج و اشاعت کے لیے علمی کتابیں کثرت سے لکھی جا رہی ہیں اور اسی نسبت سے ان کے ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔ نئے علوم و فنون مثلاً طیرانیات (Aeronautics) یا جینیات (Genetics) بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ترقی یافتہ زبانوں میں ان سے متعلق نئے خیالات کو ادا کرنے کے لیے نئی اصطلاحات بھی وضع کی جا رہی ہیں۔ دراصل علمی کتابوں کے ترجمے میں سب سے اہم اور مشکل مسئلہ اصطلاحات کا ہے۔ اس لیے کہ علمی کتابوں کے ترجمے میں شاعری کے ترجمے کی طرح آزادی نہیں برتی جا سکتی نہ ہی اس کے مضمون یا خیال کی باز آفرینی کو ترجمے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ علمی کتابوں کا ترجمہ بالکل اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔ آل احمد سرور نے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

> ''علمی کتابوں کے ترجمہ میں آزاد ترجمے یا اصل خیال کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہاں صرف لفظی ترجمہ یا مطابق اصل ترجمہ یعنی (Literal and Faithful) پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ لفظی ترجمہ میں لسانیات کے رو سے ایک متنی اظہار کو دوسرے متبادل متنی اظہار میں منتقل کرنا ہوتا ہے''۔
>
> (ترجمہ کا فن اور روایت۔ ص 54)

مغرب کی زبانوں میں مختلف علوم کے لیے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اصطلاحات بنائی گئی ہیں۔ اس کے مقابلے میں مشرقی زبانوں مثلاً اردو میں علمی اصطلاحات کا سرمایہ بہت کم ہے۔ اس لیے بڑا مسئلہ اصطلاحات وضع کرنے یا انھیں دوسری زبانوں سے لینے کا ہے۔ اس سلسلے میں وحید الدین سلیم اور دارالترجمہ حیدرآباد کے مترجمین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ عام اتفاق رائے یہ ہے:

1. اردو ہند آریائی زبان ہے لیکن علمی اور ادبی سطح پر اس نے عربی اور فارسی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لیے اردو میں نئی اصطلاحات گڑھنے میں فارسی، عربی اور سنسکرت تینوں زبانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔
2. انگریزی زبان سے بھی اہل اردو مانوس رہے ہیں اور آج بھی تعلیمی نظام میں اس کا اثر ہے۔ اس لیے انگریزی زبان میں رائج ایسی اصطلاحات اردو میں لے لی جائیں، جو صوتی اعتبار سے اردو سے قریب ہیں۔ کچھ انگریزی اصطلاحوں کو اردو کی خراد پر چڑھا کر شامل کیا جا سکتا ہے۔
3. مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والی بے شمار اصطلاحیں، جو عوام میں رائج ہیں ان کو بھی اردو کی اصطلاحات کے ذخیرے میں شامل کر لینا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علمی اور معلوماتی ترجمے کے بارے میں آل احمد سرور اور وحید الدین سلیم کے کیا تاثرات ہیں؟

1.5 خلاصہ

کسی بھی ملک کی تہذیبی اور علمی ترقی کے لیے ترجمہ بہت ضروری ہے۔ خصوصاً آج کی دنیا میں جب علم کا دھماکہ (Explosion of Knowledge) ہر طرف سنائی دے رہا ہے۔ ترجمہ تخلیقی ادب کا بھی ضروری ہے اور علمی کتابوں کا بھی۔ ترجمے میں اس بات پر زور ہونا چاہیے کہ وہ اصل زبان کی تخلیق یا اس کے متن سے قریب اور اس کا وفادار ہو۔ اصطلاح سازی کے کام میں اعتدال برتا جائے۔ یعنی اصطلاحات مشکل اور نامانوس نہ ہوں۔ اور اردو زبان کے مزاج سے میل کھاتی ہوں۔

1.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی اقسام پر تفصیل سے بحث کیجیے۔
2. ترجمہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. کامیاب ترجمے کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. شاعری کے ترجمے کی مشکلات بیان کیجیے۔
3. علمی کتابوں کے طریقۂ کار اور اصطلاح سازی کے اصولوں سے بحث کیجیے۔

1.7 فرہنگ

لغوی = لغت سے منسوب
اصطلاح = کسی علم وفن یا حرفے کا تشریح طلب خاص لفظ
تاروپود = تانا بانا
مسخ کرنا = صورت خراب کرنا
متن = کتاب کی اصل عبارت
حذف = کم کرنا، نکالنا، دور کرنا
انحراف = پھر جانا، راستے سے ہٹنا
ارتعاش = رعشہ، کانپنا، تھرتھراہٹ
علت = وجہ، سبب
معلوم = وہ شئے جس کا کوئی سبب ہو، نتیجہ، حاصل
بازآفرینی = پھر پیدا کرنا، کسی تجربے، مشاہدے یا تخلیق کو دوبارہ پیش کرنا۔

1.8 سفارش کردہ کتابیں

-1 پروفیسر قمر رئیس — مرتبہ : ترجمہ کا فن اور روایت
-2 ڈاکٹر خلیق انجم — مرتبہ : فن ترجمہ نگاری
-2 وحیدالدین سلیم — اصول وضع اصطلاحات

اکائی: 2 ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات

ساخت

2.1 تمہید

2.2 ترجمہ کیا ہے؟

2.3 تھیورڈ ساوری کے تالیف کردہ اصول ونظریات

2.4 لفظ، محاورے، عبارت اور اسلوب کا ترجمہ

2.5 اصول اصطلاح سازی

2.6 مترجم کے بنیادی فرائض

2.7 ترجمے کے تین اہم میدان

5.8 خلاصہ

5.9 نمونۂ امتحانی سوالات

5.10 فرہنگ

5.11 سفارش کردہ کتابیں

2.1 تمہید

ترجمے کا فن اتنا قدیم ہے جتنا کہ انسان کی سماجی زندگی ہے۔ جب انسان نے ایک سماجی گروہ کے طور پر رہنا شروع کیا تو اسے اپنے آس پاس کے رہنے والوں سے سماجی رشتے قائم کرنے کی ضرورت پڑی۔ سماجی گروہوں میں سماجی اور علاقائی دوریوں کے باعث ان گروہوں کی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی تھیں یا پھر ان میں اتنا فرق ہوتا تھا کہ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے لوگوں کی زبان پوری طرح نہ سمجھ پاتا تھا۔ انسانی متنوع خواہشات کا مجسمہ ہے۔ یہی خواہشات ضروریات میں بدلتی ہیں اور ضروریات مختلف قوموں اور لسانی گروہوں میں لین دین کے عمل کو جنم دیتی ہیں اور مختلف لسانی گروہوں میں لین دین کی خواہش وضرورت کی باقاعدہ تکمیل کے لیے ترجمے کا فن اور اصول جنم لیتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے اس لین دین کے فن میں باقاعدگی لانے کے لیے باقاعدہ اصول وضوابط بنائے جاتے ہیں تاہم ابھی تک مبسوط اور قبول عام اصول مرتب نہیں کیے گئے ہیں۔ اس اکائی میں انہیں ترجمے کے بنیادی اصول ونظریات سے متعلق مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی جائے گی۔ بقول ظ انصاری:

> ''علوم مثلاً لغت سازی، صرف ونحو، معانی وبیان، اصطلاح سازی وغیرہ پر ہر زمانے میں توجہ دی گئی ہے لیکن ترجمے کے مسائل پر صرف بحث کی گئی۔ اس کے باقاعدہ اصول مرتب نہیں کیے گئے۔''

ترجمے کے بغیر دنیا کے بیشتر کام نہیں چل سکتے۔ قدیم زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک دنیا میں ہونے والی علمی، فنی، سائنسی اور ٹیکنیکل معلومات ہمیں ترجموں کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں فنی اور تکنیکی دریافتیں، انکشافات اور معلومات بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہیں اور یہ دریافتیں اور معلومات ہر ملک کے لیے ضروری ہیں۔ ملک ترقی یافتہ ہو، ترقی پذیر ہو یا پس ماندہ ہو، یہ مقصد صرف ترجمے کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔

دنیا کے تمام ترقی پذیر اور پس ماندہ ملکوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ علمی آگہی، نئی نئی دریافتوں اور عالمی بصیرتوں کو بڑے پیمانے پر کم سے کم وقت میں حاصل کریں کیوں کہ یہ اُن کی موت اور زندگی کا سوال ہے۔

2.2 ترجمہ کیا ہے؟

گوئٹے کا قول ہے کہ ''جملہ امورِ عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے'' لیکن گوئٹے کے مدنظر عالمی ادب کا ایک عظیم الشان نصب العین تھا اور جیسا کہ اقبال نے پیام مشرق کے دیباچے میں لکھا ہے اس کے لیے مغرب و مشرق کا ادب انسانیت کا مشترکہ سرمایہ تھا۔

ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ''پار لے جانا''۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم کسی کو پار اتارتا بھی ہے کہ نہیں، یہ مفہوم نقل مکانی سے لے کر نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے۔ اہلِ لغت اس کے کم سے کم چار معنی درج کرتے ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں نقلِ کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ اور کسی شخص کے احوال کا بیان۔ اور یہ سب معانی باہم مربوط ہیں۔ ترجمہ ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل عمل ہے جس کے ذریعے کسی تصنیف کو اس کی جملہ خصوصیات کے ساتھ اصل زبان سے کسی دوسری زبان میں کچھ اس طرح منتقل کیا جائے، جس کے باوصف ترجمے کی زبان میں اصل تصنیف دوبارہ اپنی پرانی شکل میں زندہ جاوید ہو جائے۔

''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔'' یہ خیال تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر البرٹ گیرارڈ نے اپنی عمدہ تصنیف ''مقدمہ ادب عالم'' میں ظاہر کیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی دردمندی سے یہ ٹھوس حقیقت بھی تسلیم کی تھی کہ ''ترجمہ نام ہے ایک سعی نامشکور کا جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔''

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں لیکن جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے، جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے، اسے گلوبل علم سے واقف کرانے اور جدید ٹکنالوجی کا ساتھ دینے کے لیے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔

ترجمے کے ذریعے صرف زبان کی سطح پر ہی انسانی علوم میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ذہنی کشادگی کے ذریعے بعض اوقات معاشرے کے بنیادی مزاج اور رہن سہن میں بھی ایک تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ترجمے کا دائرہ صرف ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام انسانی علوم اور دریافتیں اس میں شامل ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ علم یا دریافت کسی قوم کی میراث نہیں ہوتی بلکہ پوری نسل انسانی اس سے استفادہ کرتی ہے تو دراصل اس کا وسیلہ ترجمہ ہی ہوتا ہے، جس کے ذریعے قومیں عالمی تناظر میں نہ صرف ایک دوسرے کے جذبات و احساسات میں شریک ہوتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے علمی اور تحقیقی کاموں سے بھی فیض حاصل کرتی ہیں۔

یہ المیہ ہے کہ تیسری دنیا میں، جہاں اس کی سخت ضرورت ہے، ترجمے کو اب تک حقارت کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی حقیر کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے، جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو رہے ہیں۔ اردو میں سجاد حیدر یلدرم، منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور حسن عسکری اور شاعری میں اقبال سے لے کر شان الحق حقی نے تراجم کیے ہیں۔ اردو دنیا میں اور فرانسیسی میں بودلیر سے لے کر آندرے ژید تک کتنے بڑے فنکاروں نے خود کو مترجم کہلانے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی۔ بلکہ آندرے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تخلیق کے مقابلے میں ترجمے کا کام نفی خودی کا مظہر ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ پھر یہ کام اثبات خودی کے پیغمبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا۔ شاید اس لیے کہ اسرارِ خودی سے ہی نہیں رموز بے خودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا۔ ترجمہ کرنے کی صلاحیت کا احساس مانند اسرارِ خودی ہے جب کہ مصنف اور تصنیف میں ضم ہو کر کامیاب ترجمہ کرنا مثل رموز بے خودی ہے۔

ترجمہ ایک نہایت مشقت طلب کام ہے اور جو طبیعتیں اس کے برخلاف تعصب اور مزاحمت سے کام لیتی ہیں، درحقیقت محنت سے جان چراتی ہیں۔ ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ ترجمے کی بہت سی اقسام ہیں اور یہ کام

بازار سے لے کر اقوام متحدہ تک اور اخبار سے لے کر وی۔ سی۔ آر تک کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی ہے۔ عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار قدرے بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو فن کے طور پر نہ سہی' ایک روزمرہ ہنر کی طرح سے ہی سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جا سکے نیز فن ترجمہ جملہ فنون کی طرح لامتناہی عمل پیہم اور ریاض کا متقاضی ہے اور جس قدر لگن و محنت کے ساتھ مترجم' ترجمہ کرتا جائے گا اس کے فن میں نکھار آتا جائے گا۔ فن کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ محض تعلیم و تعلم سے نہیں آتا' گرچہ اس میں بھی ایک عنصر ہنر کا ضرور ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکھر سکتا ہے۔ لیکن ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان پر خیر عبور ہونا ہی چاہیے۔ اس موضوع سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔ مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنف ادب سے بھی لگاؤ ضروری ہے جس میں متن پیوست ہے۔

علمی اور تکنیکی ترجمے کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کی تاریخ' طرز فکر اور طریقۂ کار کو بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے معاشرے میں عمومی آگہی اور ذہنی میلان پیدا ہوگا اور جب تک اجتماعی سطح پر کوئی علمی سرچشمہ وجود میں نہیں آتا' تب تک ٹکنالوجی کے خریدار خریدار ہی رہتے ہیں۔ اس کے تولید کار نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو نظام تعلیم تحقیقی ترقیاتی اہلیت رکھنے والے افراد پیدا نہیں کر سکتا۔ محض رسمی تعلیم اور رسمی نصاب کے ذریعے چاہے وہ کسی زبان میں ہو دور رس نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے اشد ضروری ہے کہ طرز فکر اور طریقۂ کار کی منتقلی کو بھی ترجمے کے ذریعے یقینی بنایا جائے۔

ترجمے کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک تو مشینی ترجمہ ہے اور دوسرا تخلیقی ترجمہ۔ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا' تاکہ تعلیمی' تکنیکی' معلوماتی اور تبلیغاتی مسالہ کم سے کم وقت میں تیار ہو سکے۔ تقریباً نصف صدی پہلے جب ایک ''خودکار مترجم'' تیار کرنے کے لیے ابتدائی تحقیق شروع ہوئی تھی' تو یہ توقع پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جائے گا' جس کے ایک طرف زیراکس مشین کی طرح کسی زبان کے متن کو داخل کیا جائے تو دوسری طرف سے مطلوبہ زبان کا ترجمہ کھٹ سے باہر نکل آئے گا۔ اس دوران میں جدید زبان شناسی کے ماہرین نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کر کے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔ چنانچہ اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام بھرنے کے بعد بھی لسانی ماہرین مترجمین اور ترجمے کے مدیروں کی ضرورت برقرار رہے گی۔ نتیجتاً مشینی ترجمے کے باعث خدشہ ہے کہ مترجمین اور ترجمے کے مدیروں کی قلت مزید بڑھے گی۔

وقت اور سرمائے کی بچت شاید پھر بھی نہ ہو سکے۔ تاہم دنیا کے کئی ملکوں میں مزید تحقیق جاری ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پوری طرح خودکار نہ سہی مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے گا۔ تاہم اس کا دائرہ کار ایسی زبان تک محدود رہے جس میں زبان کو تہہ در تہہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ ان تمام کے باوجود مدیر کی ضرورت پڑے گی اور جب تک مدیر خود اچھا مترجم نہ ہو یا نہ رہا ہو تب تک ترجمے کا اچھا مدیر نہیں بن سکتا۔ مشینی ترجمے کی روایت کے عام ہونے کی صورت میں مترجمین کی کمی کا احساس مزید ہوگا نتیجتاً مدیروں کی بھی قلت ہوگی تو ایسی صورت میں مشینی ترجمے کی تصحیح کون کرے گا؟

اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے' جو تہہ در تہہ معنویت کی حامل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ادب میں متعدد تخلیقی فن کاروں نے اسے کلیتہً خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔ اس کے باوجود شیلی کے تراجم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایسے متن کو منتخب کرے جو اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو تو فن ترجمہ کتنی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے' جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بلفظ مماثلت نہیں ملتی جو بامعنی ہو اور درست بھی تاہم تخلیقی ترجمے کرنے والوں نے ایسی مماثلتیں دریافت کی ہیں' جہاں نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے تخیل سے پیدا کر کے دکھایا ہے' چنانچہ ترجمے کی یہ قسم آزادی اور پابندی کے درمیان ایک جدلیاتی کشمکش کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب یہ تضاد اعلیٰ سطح پر موزوں و متناسب موافقت اور مطابقت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو فن ترجمہ کو معراج نصیب ہوتی ہے۔

لیکن عام قسم کا لفظ بلفظ ترجمہ جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ جس میں اصل کی تہہ در تہہ معنویت قربان ہو جائے' اردو میں محمد حسن عسکری اس قسم کے رواں ترجمے کو جس میں اصل متن کے اسلوب بیان کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ مماثل اور متوازی اثر پیدا کرنے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو' لایعنی قرار دیتے ہیں اور ایسے ترجموں سے عالمی ادب کی یا اپنی زبان کی کوئی خدمت نہیں ہوتی۔ اصولی طور پر ایسے

ترجموں کو تلخیص یا تسلی کی ایک مشق تو سمجھا جا سکتا ہے کوئی تخلیقی کمال نہیں سمجھا جا سکتا۔ دراصل تخلیقی سطح کا ہر ترجمہ اپنے ساتھ ایک نیا مسئلہ لے کر آتا ہے کیوں کہ اس کا رابطہ ایک ایسے متن سے ہوتا ہے جو اپنی زبان میں ایک مثالی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

تخلیقی ترجمے سے ایک دوسری مراد ادبی اور تخلیقی تحریروں کے تراجم ہیں اور انہیں پر سب سے زیادہ اختلافی باتیں ہوتی ہیں' کیوں کہ سائنسی یا علمی موضوعات کا ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحوں پر تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مفہوم کی ترسیل میں فرق نہیں ہوتا لیکن ادبی ترجموں میں اصل جھگڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے' جب یہ اعتراض کیا جائے کہ لکھنے والے کا اصل مفہوم یا تحریر کا مزاج تو ترجمے میں آیا ہی نہیں۔ پھر اصناف کی باریک بینیاں بھی اکثر ترجمے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کے برعکس غزل کا ترجمہ کہیں مشکل ہے' کیوں کہ غزل کے خیال کو تو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی مزاجی کیفیت اور ہیئتی دبازت کا ترجمہ آسان نہیں۔

ہر زبان و ادب کا ارتقا کسی مخصوص سماجی اور تہذیبی پس منظر میں ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر تخلیقی فن پارے کا اپنا ایک تہذیبی سانچہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ترجمے کا تعلق تہذیبی سانچے سے ہوتا ہے۔ دراصل ترجمے کا فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار بھی ہے اور ایک بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا کرنے کا وسیلہ بھی۔ یہ دو تہذیبوں اور دو زبانوں کے درمیان اتحاد کا ایک عمل ہے اور یہ اتحاد یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ زبان کی سرحدوں کو پار کر کے باہم مفاہمت کی فضا پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ترجمے کی عربی تعریف کے مطابق ترجمہ 'نقل کلام' کو کہتے ہیں۔ نقل مطالب یا نقل معانی کو نہیں کہتے اور نقل کلام کا تقاضا یہی ہے کہ جس زبان میں نقل ہو جائے اس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں پیدا ہوا تھا اور یہ بھی لازمی ہے کہ کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو ورنہ ترجمے کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. گوئٹے نے ترجمے کے بارے میں کیا کہا ہے؟
2. دنیا کے علوم تک انسان کی رسائی کا وسیلہ کیا ہے؟
3. ترجمے کی دو بڑی قسمیں کون سی ہیں نیز تخلیقی ترجمے سے کیا مراد ہے؟

2.3 تھیوڈر ساوری کے تالیف کردہ اصول و نظریات

تھیوڈر وساوری نے 'آزاد اور لفظی ترجمہ' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جسے آصفہ جمیل نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس اردو ترجمے کو پروفیسر قمر رئیس نے اپنی مرتبہ کتاب 'ترجمے کا فن اور روایت' میں شامل کیا ہے۔ تھیوڈر کا کہنا ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو ہمیشہ ترجمے کے فن کے بارے میں ہر ممکن معلومات حاصل کرنی چاہیے۔ مترجم کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہر فن میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو آپ کو ہدایت دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو آپ کی اصلاح کرتے ہیں اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو خود کو بہتر ثابت کرنے کے لیے بغیر کچھ جانے آپ پر تنقید یا نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان تینوں میں سب سے اہم وہ لوگ ہیں جو آپ کو ہدایت دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے متعلقہ فن کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کی ہیں اور ان کی دلیلوں کی بنیاد اصولوں اور نظریات پر ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمے کے اصول کیا ہونے چاہئیں۔ ترجمے کے اصول مختصر طور پر بیان کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر ہم چاہیں کہ ترجمے کے اصولوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کریں تو یہ کام بہت مشکل ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں ترجمے کا کام بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے، لیکن ترجمے کے ایسے اصول ابھی تک وضع نہیں کیے گئے جنھیں دنیا کے تمام مترجم تسلیم کرتے ہوں۔ تمام فنون میں ایسے ماہرین کی تعداد خاصی ہوتی ہے جو متعلقہ فن کے اصول اور نظریات مرتب کرتے ہیں لیکن یہ ترجمے کے فن کی بدنصیبی ہے کہ اس کے لیے باقاعدہ اصول ابھی تک مرتب نہیں کیے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ترجمے کے فن کو ایسے لوگ نہیں ملے جو باقاعدہ اصول مرتب کرتے۔ جن لوگوں نے ترجمے کے تھوڑے بہت اصول بنائے ہیں یا جن لوگوں کو ترجمے کا عملی تجربہ ہوتا ہے ان کا آپس میں بہت اختلاف ہوتا ہے۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی مشہور مترجم نے روانی میں ترجمے کا کوئی اصول وضع کر دیا۔ بعض مترجم اسے تسلیم کرتے ہیں اور بعض اس سے اختلاف۔ مختلف مترجموں کے بیانات

کا اگر ہم جائزہ لیں تو اُنھوں نے جو اصول مرتب کیے ہیں ان میں اتنے اختلافات ہیں کہ کوئی مترجم جب ان اصولوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس اصول کو مانے یا کس اصول کو نہ مانے۔

تھیوڈر نے ترجمہ نگاری کے درج ذیل مختلف اصول ونظریات کی فہرست دی ہے:

1- ترجمہ میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

2- ترجمہ اصل متن کے معانی ومفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

3- ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

4- ترجمہ کو ترجمہ کی ہی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

5- ترجمہ میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔

6- ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔

7- ترجمہ اصل متن کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

8- ترجمہ کو مترجم کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

9- ترجمہ میں اصل تصنیف سے حذف واضافہ کیا جاسکتا ہے۔

10- ترجمہ میں اصل متن سے حذف واضافہ کبھی ممکن نہیں۔

11- نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔

12- نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔

تھیوڈر نے مختلف اصولوں کی جو فہرست دی ہے، اس میں اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔

یہاں میں شاہ ولی اللہ کے صاحب زادے شاہ محمد رفیع الدین کے قرآن شریف کے ترجمے کا ذکر کروں گا۔

یہ ترجمہ 1776ء میں کیا گیا تھا۔ اُس زمانے تک اردو نثر خاصی صاف، سادہ اور رواں ہو چکی تھی۔ لیکن چوں کہ شاہ محمد رفیع الدین کو یہ خیال تھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ ترجمے میں ایسی کمی وبیشی نہ رہ جائے جس سے قرآن شریف کا مفہوم بدل جائے۔ اس لیے اُنھوں نے یہ اہتمام کیا کہ قرآن شریف کے ہر لفظ کا ترجمہ عربی عبارت کے مطابق کیا۔ شاہ محمد رفیع الدین نے قرآن شریف کے ہر لفظ کے نیچے اردو کا مناسب ترین لفظ لکھ دیا اور عبارت کی وضاحت نہیں کی۔ اس اہتمام سے قرآن شریف کی عبارت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی لیکن ترجمے کا بیشتر حصّہ اردو محاورے کے خلاف ہو گیا اور بعض مقامات پر اصل عبارت کی انتہائی پابندی کرنے کی وجہ سے عبارت گنجلک ہو گئی۔ چوں کہ اصل عبارت کی وضاحت کے الفاظ نہیں بڑھائے گئے۔ اس لیے معنی ومفہوم واضح نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ناقابلِ فہم ہو گیا۔ عربی میں فاعل اور مفعول سے پہلے فعل آتا ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین نے ترجمے میں الفاظ کی یہی ترتیب رکھی، جو اردو کے قواعد اور صرف ونحو کے اصولوں کے خلاف ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین کے اُس ترجمے کی یہ تاریخی اہمیت ہے کہ اردو میں قرآن کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ نقشِ اوّل میں جو کمی رہ جاتی ہے، وہ اس ترجمے میں ہے۔ شاہ محمد رفیع الدین کے بھائی شاہ عبدالقادر نے جب شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی کوتاہیاں دیکھیں تو انھیں اندازہ ہوا کہ یہ ترجمہ بہت زیادہ لفظی ہونے کی وجہ سے خلافِ محاورہ اور بیشتر مقامات پر ناقابلِ فہم ہو گیا ہے۔ 1790ء میں اُنھوں نے 'موضح القرآن' کے نام سے خود قرآن شریف کا ترجمہ شائع کیا۔

شاہ عبدالقادر نے لفظی ترجمے پر آزاد ترجمے کو ترجیح دی۔ یہ آزاد ترجمہ بس اس حد تک آزاد ہے کہ اُنھوں نے یہ خیال رکھا کہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھنے والا قرآن کو آسانی سے سمجھ سکے، اس لیے اُنھوں نے کوشش کی کہ قرآن شریف کا مفہوم ایسی اردو میں بیان ہو جائے کہ پڑھنے والا اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ اُنھوں نے عربی الفاظ کے لیے ایسے اردو الفاظ منتخب کیے اور ایسے اردو الفاظ کا التزام کیا جو عوام میں رائج ہو۔

شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا اردو میں جو ترجمہ کیا ہے، اس سے پہلی بار اردو میں ترجمے کے یہ تین اصول مرتب ہوئے:

1- یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ مترجم اصل متن کے ہر لفظ کے نیچے اس کا ہم معنی لفظ لکھ دے۔ اس طرح کے ترجمے سے عبارت گنجلک ہو جاتی ہے، بیشتر مفاہیم ناقابلِ فہم ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اصل متن کا مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

2- دوسرا اصول یہ مرتب ہوا کہ مترجم یہ خیال رکھے کہ وہ کن لوگوں کے لیے کتاب کا ترجمہ کر رہا ہے۔ اگر وہ ایسے لوگوں کے لیے ترجمہ کر رہا ہے جو فارسی اور عربی سے واقف ہیں تو اس کو یہ آزادی ہے کہ ترجمے میں عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کرے، جو اس کے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آسکیں۔ مترجم اگر ان زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے اجنبی الفاظ کا استعمال کرے گا تو ترجمہ مشکل ہوگا اور اجنبی الفاظ کی وجہ سے اس میں رکاوٹ سی پیدا ہو جائے گی اور عبارت میں روانی نہیں رہے گی۔

3- تیسرا اصول یہ مرتب ہوتا ہے کہ اگر ترجمہ عام لوگوں کے لیے کیا جا رہا ہے تو ترجمے کی زبان، آسان اور قابلِ فہم ہو۔ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جنھیں کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ سکیں۔ عربی اور فارسی الفاظ سے بوجھل ترجمے کی ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس کے قارئین کا حلقہ بہت پڑھے لکھے لوگوں تک محدود ہو جاتا، اگر زبان آسان اور عام فہم ہو تو ہر طبقے کے لوگ ترجمے کو شوق سے پڑھیں گے۔

ترجمے کے بارے میں جو مختلف نظریات ہیں۔ اب ہم ان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

ترجمے کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ترجمہ ایسا صاف، رواں، سلیس اور شستہ ہونا چاہیے کہ وہ تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔ ایسا ترجمہ کرنا ہرگز ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسی دو زبانیں نہیں ہیں، جن میں ایک زبان کے تمام الفاظ کے مترادفات اس زبان میں ہوں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ اگر مترجم یہ کوشش کرے گا کہ وہ اصل عبارت سے قریب تر رہے اور لفظی ترجمہ کرے تو ترجمے میں یقیناً اصل تصنیف کی روانی نہیں ہوگی۔ اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ترجمہ، اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ صرف سائنسی، ٹیکنیکل اور ریاضی کی کتابوں میں تو کافی حد تک ممکن ہے لیکن ادبی کتابوں میں اس لیے ممکن نہیں کہ ہر زبان کا مصنف اپنی عبارت میں ایسے الفاظ، محاورے، کہاوتیں اور روزمرّہ استعمال کرتا ہے، جن کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔

ترجمے کے بارے میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ یہ نظریہ کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر مترجم کوشش کرے کہ اس کے ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک نظر آئے تو مترجم پر دوہری پابندی عائد ہو جائے گی۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا ترجمہ کرے جو منشائے مصنف کے مطابق ہو، یعنی ترجمہ اصل تصنیف سے قریب ترین ہو۔ اس پابندی پر مترجم کے لیے ایسے الفاظ کی تلاش ضروری ہو جاتی ہے، جس سے ترجمہ اصل تصنیف سے قریب ہو جائے اور پھر اگر 'اسلوب کی جھلک' کی پابندی عائد کر دی جائے تو مترجم اس ذمے داری سے ہرگز عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ہر زبان میں تمام مصنفوں کا اسلوب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مصنف اپنی ہی زبان کے دوسرے مصنف کے اسلوب کی پیروی کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اردو میں کئی مصنفین نے غالبؔ کے اردو خطوط کے اسلوب کی نقل کرنے کی کوشش کی، لیکن کسی ایک کو بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ترجمے میں مصنف اور مترجم کی زبانیں بھی مختلف ہوتی ہیں، اس لیے کوئی بھی مترجم مصنف کے اسلوب کی پیروی میں کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر مترجم مصنف کے اسلوب کی پیروی کی کوشش کرے گا تو اس سے ترجمے کی خوبی متاثر ہوگی، اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ مترجم اگر صاحبِ طرز مصنف ہے اور وہ اپنی طرز اور اسلوب میں ترجمہ کرے، تب بھی ترجمہ اچھا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ترجمے پر مترجم کی شخصیت چھا جائے گی۔ اس لیے مترجم کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ترجمے کو اپنے منفرد اسلوب کے سانچے میں ڈھالے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ترجمہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ مترجم کے ہم عصر کی عبارت معلوم ہو۔ یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کیوں کہ ہر تصنیف میں اس کے زمانے کی تہذیبی اور سماجی زندگی کے حوالے ہوتے ہیں۔ ترجمے کو مترجم کے عہد کی عبارت کی کوشش میں اصل تصنیف کے بہت سے تاریخی اور تہذیبی حوالوں کو ترک کرنا پڑے گا اور یہ ترجمے کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

ترجمے کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر تصنیف میں مصنف کی شخصیت اور اس کے عہد کے بہت سے حوالے ہوتے ہیں۔ کیا ہم انھیں حذف کر دیں۔ مصنف کی تحریر میں کچھ مقامات ایسے ہوتے ہیں جو مترجم کے لیے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں یا مترجم تو ان مقامات کو بخوبی سمجھ لیتا ہے' لیکن وہ سوچتا ہے کہ مصنف کی تحریر میں بعض مقامات ایسے ہیں جو بہت سے پڑھنے والوں کے لیے ناقابلِ فہم ہوں گے یا ان کا مطالعہ مفید نہیں ہوگا یا مصنف نے کچھ باتیں ایسی کہی ہیں جو مترجم کے ذاتی عقائد و نظریات سے مختلف ہیں تو کیا مترجم کو یہ حق ہے کہ وہ متعلقہ عبارت حذف کر دے۔ اسی طرح ایسی کچھ مثالیں ہیں کہ مترجم کو کسی متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنا ہے یا اس کا ترجمہ کرنا ہے وہ تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں یا ترجمے کے دوران متن میں اپنے عقائد اور نظریات سے متعلق کچھ عبارت کا اضافہ کر دیتا ہے۔ اضافہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو مترجم اپنے عقائد اور نظریات کی تبلیغ کے لیے متن میں عبارت کا اضافہ کر دیتا ہے، جس کی اسے ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ دوسرے اصل تصنیف میں کچھ ایسے مقامات ہوتے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ مترجم کو یہ حق ہے کہ وضاحت کے لیے کچھ عبارت کا اضافہ کر دے۔ لیکن یہ وضاحتی عبارت مختصر ہو اور صرف اتنی ہو جس سے تصنیف کے ناقابلِ فہم حصّے پڑھنے والے کی سمجھ میں آ جائیں۔ یہ وضاحت اتنی طویل نہیں ہونی چاہیے کہ ترجمہ اصل تصنیف کی تفسیر بن جائے۔

نظم کے ترجمے کے بارے میں ایک نظریہ یہ ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نثر میں کیا جائے۔ اوّل تو بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ بہت دشوار کام ہے اور بعض اوقات ناممکن کی حد تک دشوار ہے۔ انگریزی کے مشہور نقاد جانسن کا قول ہے کہ 'نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔' اگر نظم کا ترجمہ نثر میں کیا جائے تو کچھ حد تک قابلِ برداشت ہوتا ہے اگر نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے تو اصل نظم کے ساتھ سخت ناانصافی ہے' کیوں کہ اس طرح کے ترجموں میں اصل متن میں شاعر کچھ کہتا ہے اور مترجم کچھ اور ترجمہ کرتا ہے۔ نظم میں عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اپنے خیال کو شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ شعر کے ایک سے زیادہ مفہوم ہو جاتے ہیں، اس لیے شاعروں کے کلام کی شرح لکھی جاتی ہے۔ غالبؔ کے اردو کلام کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور ان شرحوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اشعار کو اپنی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے ایک ایک شعر کے کئی کئی مفاہیم رائج ہو جاتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مترجم کیا سبھی مفاہیم کا ترجمہ کرے یا صرف ایک کا۔ سبھی مفاہیم کے ترجمے سے ترجمہ نہیں، دوسری زبان میں ایک اور شرح ہو جائے گی اور اگر مترجم صرف ایک مفہوم کا ترجمہ کرے تو کس مفہوم کو ترجیح دے اور یہ ضروری نہیں کہ مترجم نے جس مفہوم کو ترجمے کے لیے ترجیح دی ہے، وہ صحیح یا زیادہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اگر نظم کا ترجمہ کرنا ہی ضروری ہے تو نثر میں ترجمہ کرنا بہتر ہوگا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے سے متعلق تھیورڈ کے تالیف کردہ 12 اصول کیا ہیں؟
2. 1776ء میں قرآن شریف کا لفظی ترجمہ کس نے کیا تھا؟
3. اسلوب کی جھلک اور تہذیبی اشارے سے کیا مراد ہے؟

2.4 لفظ' محاورے' عبارت اور اسلوب کا ترجمہ

لوگ شکایتاً کہتے ہیں کہ اردو کی لفظیات بہت محدود ہیں لیکن اردو کی تہی دامانی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس میں امکانی قوتوں کا بھی فقدان ہے یا یہ کہ اس میں ترقی کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا بالکل خلاف واقعہ ہوگا۔ اردو کے بڑے ماخذ تین ہیں۔ عربی' فارسی اور ہندی اور ان تینوں میں کم و بیش ایسی خصوصیات ہیں جو ترجمے کے کام میں بہت مدد دے سکتی ہیں۔ عربی کی قواعد کچھ اس قسم کی ہے کہ ایک ہی لفظ کے بہت سے الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ فارسی زبان اپنی لطافت' شیرینی اور شعریت کی وجہ سے ترجمے میں چار چاند لگا دیتی ہے اور بعض اوقات ہندی سے بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو اپنی قوتِ گویائی کے لحاظ سے لاجواب ہوتے ہیں۔

ترجمے کے کام میں انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ سینکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہو کر اس طرح گھل مل

گئے ہیں کہ ان کا ترجمہ تلاش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ بلاتکلف اردو کے الفاظ کی طرح استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی دو قسمیں ہیں اول وہ جو ہو بہو یا اردو لب و لہجے کے مطابق خفیف ترمیم کے ساتھ اپنائے جاسکتے ہیں۔

پہلی قسم		دوسری قسم	
اسکول	School	تکنیک	Technique
کالج	College	رومان	Romance
یونیورسٹی	University	سانیت	Sonnet
بس	Bus	استودیو	Studio
ٹریکٹر	Tractor	استنزا	Stanza
اسکوٹر	Scooter	میکانکی	Mechanical
ٹیچر	Teacher	رپٹ	Report
پوزیشن	Position	لالٹین	Lantern
پروپیگنڈہ	Propaganda	قندیل	Candle
پروفیسر	Professor	ماچس	Match Box
لکچرر	Lecturer	بکس	Box
ڈائرکٹر	Director	الماری	Almirah
ٹرین	Train	اسپتال	Hospital

الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے لیے علاحدہ علاحدہ اصول ہیں۔ الفاظ کا ترجمہ کرنے میں درج ذیل اصول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(1) ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔ (2) حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے (3) سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔

1) ترجمے کا صحیح ہونا ہر حال ضروری ہے کیوں کہ جو تصور اصل میں ہے وہ اگر نقل میں ادا نہیں ہوتا یا اصل کی سی شدت کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو ایسا ترجمہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔

2) ترجمے کا حتی الامکان عام فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ عوام کو ان تصورات سے روشناس کرایا جائے جو اصل میں موجود ہیں۔ اگر ترجمے میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے معنی معمولی تعلیم یافتہ طبقہ نہ جانتا ہو تو وہ ان تصورات کو کیا سمجھے گا۔

3) ترجمے کے سبک اور خوبصورت ہونے کی شرط زیادہ جمالیات کے نقطہ نگاہ سے ہے لیکن اس کا عملی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ بھدا یا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنے سے بیان میں الجھاؤ اور گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور مطالب کے اظہار اور تفہیم دونوں میں دشواری ہوتی ہے۔ لہٰذا ترجمے کا مقصد جیسا چاہیے پورا نہیں ہوتا۔

ان تینوں شرطوں پر برابر توجہ دینا مشکل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا ترجمہ سبھی شرطوں پر پورا اترے۔

عربی کے مقابلے میں فارسی الفاظ اردو دانوں کے لیے زیادہ عام فہم ہوتے ہیں اور سبک اور خوبصورت بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں

فارسی	عربی	انگریزی
تپش پیما	مقیاس الحرارت	Thermometer
آتش کش	قاطع النار	Fire-extinguisher
پرواز	طیران	Flight
تراشہ	قطعہ	Cutting

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ بعض اوقات عربی ترجمے بھی نہایت سُبک اور حسین ہوتے ہیں۔

معجّل	Urgent	قاصد	Messenger
تقدیم، ترجیح	Priority	عکاسی	Photography

کبھی کبھی عربی اور فارسی کی آمیزش سے بہت خوبصورت ترجمہ ہوسکتا ہے۔

طیارہ بان	Pilot	خیراندیش	Good will

یہ ضروری نہیں کہ ہر لفظ کا لفظی ترجمہ کردیا جائے۔ اصل عبارت میں اکثر الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ایک خاص ماحول رکھتے ہیں اور ایک خاص تلازمۂ خیال پیش کرتے ہیں۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کرکے ان کے مترادف الفاظ رکھ دیے جائیں تو نتیجہ اکثر مضحکہ خیز ہوگا۔

ہر زبان کے الفاظ میں ایک وزن اضافی ہوتا ہے۔ بظاہر اکثر الفاظ ہم معنی نظر آتے ہیں اور ایک ہی لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں لیکن گہری نظر ڈالنے سے ان الفاظ یا معانی میں نازک امتیازات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اکثر یہ امتیازات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اردو میں بظاہر ہم معنی ہیں۔

عریاں، برہنہ، ننگا، لیکن ان کے محلِ استعمال پر غائر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بہت فرق ہے۔ لفظ ''برہنہ'' میں حقیقت اتنی بے لباس نہیں ہے، جتنی کہ لفظ ''ننگا'' میں ہے۔ اور لفظ عریاں میں اس سے بھی کم ہے۔ مطلق لفظ کا ترجمہ ہو یا عبارت کا اس وزن اضافی کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

الفاظ کا ترجمہ کرنا پھر بھی نسبتاً آسان ہے لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب لباب یا تبصرہ نہ ہو اور دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ اور فقرہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ہر زبان میں مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوبِ اظہار یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو اصل کا لفظی ترجمہ نہ ہو بلکہ اس کے مرکزی خیال کو ادا کرتا ہو، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ترجمے میں جملے کی ساخت حسب ضرورت تبدیل کرنی پڑتی ہے اور یا الفاظ گھٹانے بڑھانے پڑتے ہیں۔ تاکہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہوجائے۔ درج ذیل مثال ملاحظہ کیجیے:

> The common interests of mankind are numerous and weighty, but our existing politcal machinary obscures them through the scramble for power between different nations and different parties.
>
> انسان کے مشترک مفادات کثیر اور نہایت اہم ہیں لیکن ہماری موجودہ سیاسی مشینری مختلف قوموں اور جماعتوں کے درمیان اقتدار کی کشاکش کے ذریعے انہیں دھندلا کردیتی ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں کے جملے اکثر پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر اور عام فہم ہوچکے ہیں اور مطلب سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی لیکن اردو ابھی زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہے۔ لہٰذا ترجمہ کرتے وقت ایسے جملوں کو اسلوب کے ساتھ ترجمہ کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، کیوں کہ اس سے ترجمے کی زبان میں اظہاری وسعت پیدا ہوتی ہے اور اگر بالکل ناممکن ہوجائے تو جملوں کے کم سے کم ٹکڑے سے کام چلانا چاہیے۔

مختصر یہ کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہونا چاہیے۔ اصل عبارت کا محض خلاصہ مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ترجمہ حتی الامکان زبان کے محاورے کے مطابق ہونا چاہیے۔ کیوں کہ محاورے، غزل کے اشعار کے مانند ہوتے ہیں اور اصل زبان کے اسلوب کو منتقل کرنے میں مدد ملتی ہے اور مواد کی اثر انگیزی ترجمے کی زبان میں باقی رہتی ہے۔ اس کے لیے ترجمے کی زبان کے محاوروں کی روایت اور مبسوط اور معیاری لغت پیش نظر ہونی چاہیے۔ الفاظ کے وزن

اضافی کا خیال رکھنا چاہیے تا کہ اصل عبارت میں ان کی جو اضافی اہمیت ہے وہ ترجمے میں بھی باقی رہے۔ حتی الامکان ایسے الفاظ کے ترجمے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جن کے مترادفات اردو میں پہلے سے موجود نہ ہوں۔ زبان کو وسعت دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا مترادف تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ خواہ وہ مترادف نامانوس ہی کیوں نہ ہو' اصل عبارت میں جملہ اگر اس قدر پیچیدہ اور لمبا ہو کہ اس کا تحت اللفظ ترجمہ کرنے سے معنی میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں جملے کو کم سے کم ٹکڑوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو لفظیات کے تین اہم ذرائع کون سے ہیں؟
2. زبان میں محاوروں کی کیا اہمیت ہے؟
3. لفظ کے وزن اضافی سے کیا مراد ہے؟

2.5 اصولِ اصطلاح سازی

بیسویں صدی کے آغاز میں جب جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ قائم ہوا تو وضعِ اصطلاحات کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ادارے سے جن کتابوں کا ترجمہ کیا گیا، اُن میں زیادہ تر کتابیں انگریزی کی تھیں۔ لہٰذا وضع اصطلاحات کا جو کام شروع کیا گیا تو عام طور سے انگریزی اصطلاحات کا مسئلہ سامنے رکھا گیا۔ دارالترجمہ میں جن علما کا تقرر کیا گیا تھا، اُنھیں عام طور سے عربی اور فارسی پر قدرت حاصل تھی، اس لیے فطری طور پر ان کا رجحان ان زبانوں کی طرف تھا، اس لیے دارالترجمہ کے معزز اراکین نے کثرتِ رائے سے یہ مسئلہ اس طرح طے کیا کہ فارسی زبان کی اصطلاحیں بجنسہٖ یا کسی تغیر و تبدل کے ساتھ اردو میں اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی اصطلاحات وضع کی جائیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انگریزی اصطلاحات کو بجنسہٖ نہیں لیا گیا لیکن عربی اور فارسی الفاظ کی مدد سے اردو اصطلاحات وضع کرنے میں عربی اور فارسی الفاظ کی مدد لی گئی۔ دارالترجمہ سے جن کتابوں کے ترجمے حاصل ہوئے، اُن میں ان اصطلاحات کا استعمال کیا گیا' جن میں عربی اور فارسی کے اُن الفاظ کا استعمال کیا گیا جو اردو والوں کے لیے اجنبی تھے' یہ اصطلاحات چوں کہ مشکل تھیں۔ اس لیے یہ اصطلاحیں دارالترجمہ سے باہر مقبول نہیں ہوئیں اور پھر اُن افراد یا اداروں نے جو ترجمے کے کام میں مصروف تھے، انفرادی طور پر اپنی اصطلاحیں وضع کیں اور بیشتر اصطلاحیں اردو میں استعمال ہوتی ہیں، جن پر عام طور سے ادیبوں اور محققوں کو مجموعی طور پر اتفاق نہیں ہے۔ اصل میں اس میں اگر ایک اسکالر نے کوئی نئی اصطلاح وضع کی تو اُس کے ہم عصر اُس اصطلاح کا استعمال اس لیے نہیں کرتے کہ اس سے وہ چھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم ایسی اصطلاحات ہوں گی جن پر اکثر محققین اور ادیبوں کو اتفاق ہو۔ ورنہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر مترجم اپنی اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے۔ جس پر 'اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ' کی کہاوت صادق آتی ہے۔

یہاں مولانا وحیدالدین سلیم کی کتاب 'وضع اصطلاحات' کا ذکر ضروری ہے۔ مولانا نے یہ کتاب بیسویں صدی کے آغاز میں لکھی تھی اور انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا تھا۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے، اس میں اصطلاحیں وضع کرنے کے اصول بیان کیے گئے تھے۔ اب حالات بدلنے کی وجہ سے ان اصولوں میں تبدیلی کرنی پڑی ہے کیوں کہ وہ زمانہ نہیں رہا جب دارالترجمہ نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس وقت عربی اور فارسی کے جاننے والوں کی تعداد اتنی کافی تھی کہ وہ دارالترجمہ کی وضع کی گئی اصطلاحات کو بہت حد تک سمجھ سکتے تھے۔ لیکن اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو عربی اور فارسی سے پوری طرح واقف ہیں اور ان اصطلاحات کا استعمال کریں جو عربی اور فارسی الفاظ کی مدد سے وضع کی گئیں۔ اب ہمیں وضعِ اصطلاحات کے درج ذیل اصولوں کو اپنانا ہوگا۔

1- فارسی اور دوسری زبانوں کی بنیادی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا ہے تو پہلے وہ الفاظ دیے جائیں جو اردو میں مستعمل ہوں۔ مثلاً Acid کے لیے تیزاب، Hospital کے لیے اسپتال، Kerosine Oil کے لیے مٹی کا تیل، glass کے لیے شیشہ Butter کے لیے مکھن، Wire کے لیے تار، Medicine کے لیے دوا، Aerodrome کے لیے ہوائی اڈہ وغیرہ۔

2- پھر ایسے الفاظ یا اصطلاحات لی جائیں جو بنیادی طور پر انگریزی الفاظ پر مشتمل ہوں لیکن ان کا تلفظ یا معنی بدل گئے ہوں۔ مثلاً Match Box کے لیے ماچس، Lantern کے لالٹین، Box کے لیے بکس۔

3- پھر یہ کوشش کی جانی چاہیے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہمارے مطلب کے جو ایسے الفاظ ہوں، جنھیں ہم اصطلاحات کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، انھیں جوں کا توں لے لیا جائے۔

4- اس کے علاوہ انگریزی کے وہ الفاظ یا اصطلاحیں جو اردو میں اپنے اصل تلفظ کے ساتھ استعمال ہو رہی ہیں، اُن کو بھی جوں کا توں رکھا جائے۔ مثلاً ڈاکٹر، نرس، انجینئر، ٹیکسی، کار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ۔

5- اور اگر ان میں سے اصول کے مطابق ہمیں اصطلاحیں نہیں ملتیں تو اُن کے لیے نئی اصطلاحات وضع کرنی چاہئیں، اس بات کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ اصطلاحات آسان ہوں اور ان میں انگریزی یا فارسی کے ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو جو عام طور سے اردو میں سمجھے جا سکتے ہیں۔

ترقی اردو بورڈ (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) نے بڑے پیمانے پر مختلف علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کیا۔ اس کام کے لیے ضروری تھا کہ مختلف سائنسی، تکنیکی، علمی اور فنی مضامین کے ترجمے کے لیے اردو میں اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ قومی اردو کونسل نے دیگر مضامین کی طرح لسانیات کی کتابوں کے ترجمے کے لیے بھی ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی ہے۔ کمیٹی نے اپنا کام شروع کرنے سے پہلے اصطلاح سازی کے لیے جو اصول مرتب کیے وہ درج ذیل ہیں:

1- ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دینا چاہیے جو مروج یا مقبول ہو چکی ہوں۔ چاہے ان میں کوئی لسانی یا معنوی سقم ہی کیوں نہ ہو۔

2- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد معنوں میں مستعمل ہے تو ایسی صورت میں اس کے مختلف مفاہیم کو علاحدہ علاحدہ الفاظ/اصطلاح سے واضح کیا جانا چاہیے۔

3- اصطلاحوں اور عام الفاظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ عام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔

4- کون سا لفظ اصطلاح ہے اور کون سا محض ایک عام لفظ، اس کا فیصلہ مضمون کے ماہرین کی رائے اور حسبِ ضرورت معیاری انگریزی لغات کی مدد سے کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسی لغت یا لغات میں کسی لفظ کے کوئی خاص معنی یہ کہہ کر دیے گئے ہیں کہ یہ معنی کسی فن یا کسی علم سے مخصوص ہیں تو اس فن یا علم کے مقاصد کے لیے اس لفظ کو اصطلاح تصوّر کیا جائے۔

5- جہاں تک ممکن ہو سکے، ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ اصول نمبر 2 کی ذیل میں نہ آتا ہو۔

6- جہاں تک ممکن ہو سکے، اصطلاح یک لفظی ہی ہونی چاہیے۔ ناگزیر صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی اصطلاحیں کم سے کم وضع کی جائیں جو دو سے زائد الفاظ پر مشتمل ہوں۔

7- ہندی اصطلاح کے اختیار کرنے کو (اگر ایسی اصطلاحیں اردو میں بآسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکتی ہوں) عربی اصطلاحوں کے اختیار کرنے پر مراجع سمجھا جائے۔

8- اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زائد الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حسبِ ذیل ترکیبات کو نیچے دی ہوئی ترتیب کے اعتبار سے ترجیح دی جائے گی۔

ا۔ وہ ترکیبات جن میں اضافت یا حروف ربط و جار کی قسم کے الفاظ و علامات نہ ہوں۔

ب۔ وہ ترکیبات جن میں یائے نسبتی ہو۔

ج۔ وہ ترکیبات جن میں اضافت ہو (بشرطیکہ ان میں ایک سے زائد اضافتیں ہوں تو ان میں کم سے کم ایک کو کا، کی، کے سے بدل دیا جائے

د۔ وہ ترکیبات جن میں کا، کی، کے وغیرہ استعمال کیے گئے ہوں۔

9- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زائد علم یا فن میں مشترک ہے اور اُن سب علوم وفنون میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے گا۔

10- الفاظ کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادہ دلی ہونی چاہیے کہ ہندی، عربی، فارسی یا عرب فارسی یا فارس عربی اور پراکرت ترکیبات بھی قابلِ قبول ٹھہریں۔

11- اگر کوئی انگریزی اصطلاح مروّج ہو اور عام فہم ہو تو اُسے برقرار رکھا جائے۔ ایسی عام فہم اصطلاحوں کے لیے اردو متبادلات بنانے یا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

12- اعلام کو ایسا ہی لکھا جائے جیسے کہ وہ اردو میں مقبول ہو چکے ہیں۔ البتہ ایسے اعلام جو ابھی مقبول نہیں ہوئے ہیں، ان کو حروف تہجی کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے ممکن صحت کے ساتھ لکھا جانا چاہیے۔

13- اگر کوئی علم کسی اصطلاح کا حصّہ بن چکا ہے تو اس علم کا اصول نمبر 12 کی روشنی میں اردو میں ترجمہ کیا جانا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. لفظ اور اصطلاح میں کیا فرق ہے؟
2. وحیدالدین سلیم کی کتاب کا کیا نام ہے؟
3. اصطلاح سازی کی ضرورت کیوں پڑتی ہے

2.6 مترجم کے بنیادی فرائض

ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک تخصیصی کام ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ وہ وسیع المطالعہ ہو۔ فن پاروں اور ادبی تخلیقوں، صاحب طرز ادیبوں اور مصنفوں کی کتابوں کا مطالعہ کیے ہو۔ دونوں زبانوں کی قواعد، الفاظ، روزمرہ، استعارات و کنایات، تشبیہات، ضرب الامثال اور ان زبانوں سے واقفیت جن سے اردو کی تشکیل عمل میں آئی ہے، اس میں زبان کا مزاج، رنگ ڈھنگ اور پیرایۂ بیان بھی شامل ہے۔ مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر مکمل عبور رکھتا ہو اور اس عبور اور قدرت کا معیار یہ ہو کہ دونوں زبانوں کے فقروں، محاوروں اور تہذیبی پس منظر سے بخوبی واقف ہو۔ جس متن کا ترجمہ مطلوب ہے اسے پوری طرح سے مطالعہ کرے اور متن کے مضمون کے مبادیات سے بھی کما حقہٗ واقف ہو۔ اس کا طرز تحریر اور انداز بیان ایسا ہو کہ بات جو اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے اسے اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو موزوں طریقے سے اپنی زبان میں کچھ اس طرح منتقل کرے کہ قاری ترجمہ شدہ مواد کا مطالعہ کرتے وقت کسی ابہام کا شکار نہ ہونے پائے اور جو بات اصل مضمون میں بیان کی گئی ہے اس تک قاری کے ذہن کی رسائی ہو جائے۔

کسی زبان کے مواد کو ہو بہو دوسری زبان میں منتقل کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیوں کہ ہر زبان کا اپنا تہذیبی پس منظر، آہنگ اور مزاج ہوتا ہے۔ ان پہلوؤں کا بحسن خوبی ترجمہ اسی وقت ممکن ہو پائے گا جب وہ نہ صرف دونوں زبانوں کی لغات پر قدرت رکھتا ہو بلکہ ان کے مزاج، تراکیب اور ماخذات سے بھی گہری واقفیت رکھتا ہو اور ترجمہ کرتے وقت اصل متن کو خوب اچھی طرح سمجھ کر اس کے مفہوم کو اپنی زبان میں اس کے مزاج اور آہنگ کے مطابق اس طرح سمو کر ایسے پیرایہ بیان میں منتقل کرے کہ زبان کی سلاست و روانی اور موضوع و مفہوم کے بیان میں کہیں بھی ابہام کا شبہہ تک نہ ہو سکے بلکہ جس قاری نے اصل کتاب نہ پڑھی ہو، اسے ترجمے کے اصل ہونے میں کچھ شک و شبہہ نہ ہو، اور جن قارئین نے کتاب کا مطالعہ کیا ہو، وہ بھی ترجمے کو پڑھتے وقت کسی مقام پر اٹکیں نہ بلکہ مترجم کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اس کے برعکس بعض ترجموں کے دوران ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اصل تصنیف کی زبان کا تہذیبی پس منظر ترجمے کی زبان کے تہذیبی پس منظر سے بالکل مختلف ہو اور مصنف کا مدعا مانندِ عنقا ہو تو مترجم کی تمام کوششوں کے باوجود اگر ترجمے میں مغائرت کی کیفیت پیدا ہو تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ترجمے کی زبان میں زبان و بیان، مواد اور تہذیبی و فکری پس منظر کی سطح پر خوش آئند بہتری کا باعث ہوگا۔

مترجم کا مطالعہ جتنا وسیع ہوگا اس کے کام میں اتنی ہی عمدگی پیدا ہوگی۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ زبان و ادب، فلسفہ، نفسیات، سماجیات، تاریخ، سائنس، مذہب، اقتصادیات جیسے مضامین سے بخوبی واقف ہو۔ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واقفیت رکھنا صحافی مترجم کے لیے تو اشد ضروری ہے۔

اچھے ترجمے کے لیے موزوں الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ مترادفات کا انتخاب موزوں ترین ہونا چاہیے۔ لہٰذا اچھا مترجم وہی ہے جو موقع محل کی مناسبت سے موزوں ترین لفظ کا انتخاب کرے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہو پاتا ہے جب مختلف لغات مترجم کے زیر مطالعہ رہیں تاکہ وہ حسب ضرورت اپنے مطلب کا لفظ چن سکے۔ مترجم اصطلاح کا ترجمہ اصطلاح میں اور محاورے کا ترجمہ محاورے میں کرے تو احسن ہوگا، اگر اصطلاح فنی ہو تو مسلمہ اصولوں کے مطابق نئی اصطلاح وضع کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے لغات پر عبور ہو جس کے لیے وسیع مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ مزید برآں مترجم کو چاہیے کہ وہ موزوں الفاظ اور اصطلاحات کو ایسے پیرائے میں بیان کرے کہ مطلب صاف اور واضح طور پر قاری کے ذہن پر نقش ہو جائے۔

مترجم کو اس بات کی آگہی ہونی چاہیے کہ ہر فن کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، کچھ شرائط اور قیود ہوتی ہیں اور کچھ پابندیوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ فنکار اپنے فن پارے کی تخلیق خونِ جگر سے کرتا ہے۔ موزوں الفاظ کے انتخاب میں کاوش کرتا ہے۔ صحیح لفظ کی تلاش کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور پھر اسے اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ جب وہ موزوں ہیئت، اسلوب اور پیرایہ بیان کے قالب میں ڈھل کر نکلتا ہے تو اپنے اندر ایک ندرت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ ہر لفظ اپنے اندر ایک کائنات سمیٹے ہوئے اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اخلاقی، سماجی، معاشی، علمی، سائنسی اور فنی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اور مخصوص معنی سے قاری کے ذہن کے دریچے اس طرح کھول دیتا ہے کہ وہ ایک لفظ سے ایک مکمل آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم اخلاق، مذہب یا سائنس کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے سامنے غور و فکر کی ایک وسیع دنیا آ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ مترجم کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ اگر اصطلاحیں نہ ہوں تو ہم علمی مطلب کے ادا کرنے میں طول لاطائل سے کسی طرح سے نہیں بچ سکتے۔ اصطلاحیں درحقیقت اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو فوراً منتقل کر دیتی ہیں۔ لغت وہ ہے جس پر جمہور کا اتفاق ہو، اصطلاح وہ ہے جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔ لفظ تشریح طلب نہیں ہوتا جب کہ اصطلاح تشریح طلب ہوتی ہے۔ مختصراً ترجمے کے اصول درج ذیل طے پاتے ہیں۔

1) ہر انگریزی لفظ کے لیے ایک ہی اردو لفظ استعمال کیا جائے۔ بشرطیکہ خود اس انگریزی لفظ کے متعدد معنی نہ ہوں۔ مثلاً انگریزی لفظ ڈیفنس کے لیے اردو میں اگر ہم کہیں اس کا ترجمہ دفاع کریں، کہیں تحفظ اور کہیں حفاظت وغیرہ تو غلط ہوگا۔

2) کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے مترجم کو چاہیے کہ وہ پہلے پوری کتاب کا باقاعدہ کئی بار مطالعہ کرے اور اصطلاحوں اور مشکل الفاظ کو نشان زد کرنے کے بعد ان کی فہرست تیار کر لے۔ ان کے لیے موزوں ترجمے تجویز کرے اور ہر جگہ وہی اصطلاح اختیار کرے۔ مناسب ہوگا اگر کتاب کے آخیر میں فہرست دینے کا اہتمام کرے۔

3) جہاں تک ممکن ہو کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل اس قسم کا لفظ منتخب کرنا چاہیے جس سے اس کے مشتقات وضع ہو سکیں۔ مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظامیہ ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم انتظام، تنظیم، تنظیمی، منتظم، انتظامی وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں ہوگی کہ انگریزی کے لفظ کا ترجمہ کچھ ہو اور اس کے مشتقات کا کچھ اور، جو اصل لفظ سے مشتق نہ کیا گیا ہو۔

4) انگریزی کی فنی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جائے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہو، نہ کہ تشریح کی۔ وحید الدین سلیم کے بقول ''اصطلاح ایک چھوٹی سی علامت ہوتی ہے جو بڑے مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بولنے والوں اور لکھنے والوں کو وقت ضائع کرنے سے بچاتی ہے۔''

5) اگر اردو میں کسی انگریزی لفظ کے لیے پہلے سے کوئی لفظ موجود ہے تو نیا لفظ نہ گڑھا جائے، بہتر ہے کہ اسی کو استعمال کیا جائے۔ مثلاً بل آف ایکسچینج کے لیے اردو میں پہلے سے ایک لفظ ''ہُنڈی'' موجود ہے۔

6) بہت سے انگریزی الفاظ اردو زبان کا جزو بن چکے ہیں۔انہیں جوں کا توں رہنے دیا جائے' مثلاً رجسٹری' بل' ڈاک اور ٹکٹ وغیرہ۔

7) بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں آ کر بگڑ گئے ہیں لیکن وہ اردو میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔انہیں جوں کا تو رہنے دیا جائے۔

8) اگر کوئی انگریزی لفظ یا اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہوں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو رہنے دیا جائے مثلاً کمیٹی اور مجلس وغیرہ۔

9) ایسے موزوں مقامی الفاظ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے جو خاصے مقبول ہو چکے ہوں۔ بجائے اس کے کہ کوئی مصنوعی اور بھونڈی اصطلاح وضع کی جائے۔ مختصرات کا ترجمہ نہ کیا جائے بلکہ پورے لفظ' ترجمہ کیا جائے۔

10) جس موضوع کا ترجمہ کرنا مقصود ہو اس سے متعلق کتب وغیرہ کا باقاعدہ مطالعہ کرلیا جائے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کیا مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے؟
2. کیا اصطلاح اور محاورے کا ترجمہ اصطلاح اور محاورے میں ہونا چاہیے؟
3. وحیدالدین سلیم نے اصطلاح کی کیا تعریف بیان کی ہے؟

2.7 ترجمے کے تین اہم میدان

ترجمے کے تین اہم میدان' جو درج ذیل ہیں:

1) علمی ترجمہ 2) ادبی ترجمہ 3) صحافتی ترجمہ

دراصل مذکورہ بالا تینوں قسمیں ترجمے کے تین اہم میدان ہیں۔جن پر ترجمے کی تینوں تکنیکوں یعنی (1) لفظی ترجمہ (2) بامحاورہ یا بین بین ترجمہ (3) آزاد ترجمہ کا اطلاق ہوتا ہے۔لیکن ایک چیز یہاں پر قابل غور یہ ہے کہ کسی تصنیف یا متن پر شروع سے آخر تک کسی ایک تکنیک کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ تینوں تکنیکوں کا استعمال کسی بھی فن پارے اور مواد پر ہوتا ہے۔آپ کو ایک ایک جملے کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کس تکنیک کے استعمال کے ذریعے معیاری ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ہاں یہ حقیقت ہے کہ مواد کی نوعیت کے پیش نظر کسی ایک تکنیک کا استعمال غالب ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر اگر مواد علمی نوعیت کا ہے تو لفظی ترجمے کی تکنیک غالب ہوگی اور اگر ادبی فن پارے کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو بامحاورہ یا بین بین ترجمے کا طریقہ غالب ہوگا اور اگر صحافتی نوعیت کا مواد ہے تو آزاد ترجمے کی تکنیک غالب ہوگی لیکن کسی ایک قسم کے مواد پر شروع سے آخر تک کسی ایک تکنیک کا استعمال کرنا غلط ہوگا۔اس مختصر سی بحث کے پس منظر میں مناسب ہوگا کہ متذکرہ بالا تینوں قسموں پر علاحدہ علاحدہ ذرا تفصیلی روشنی ڈال لیں۔

1) علمی ترجمہ :

علمی ترجمے کے تحت تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ' تاریخ' ریاضیات' معاشیات' قانون' طبیعیات' سیاسیات' انجینئرنگ اور میکانیات وغیرہ کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔علمی ترجمے عام طور سے لفظی ترجمے کی ذیل میں آتے ہیں۔علوم وفنون میں مخصوص اور متعین لفظیات اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جائے ان کا انہیں معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔ان ترجموں میں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحوں کے ترجموں کا ہوتا ہے۔ان اصطلاحوں کو وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے مطابق وضع کی جائیں۔تمام شرائط کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ علمی وفنی کتابوں کا ترجمہ متعلقہ علم وفن کا ماہر ہی انجام دے۔

2) ادبی ترجمہ :

ادبی ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ یہ بامحاورہ کیا جائے اور ترجمے کی زبان کے روزمرہ' ضرب الامثال' تشبیہات' استعارات و کنایات' تلمیحات اور رموز و علامات سے کام لیا جائے تاکہ ترجمے میں ادبی رنگ آجائے اور ترجمہ تخلیقی نوعیت اختیار کرلے۔دراصل ادب کی ادبیت اور اثر انگیزی

مذکورہ صنعتوں میں مضمر ہوتی ہے اور انہیں کے باوصف وہ اپنے فن پارے کو تابدار بناتے ہیں۔ المختصر کہ تخلیق کار کی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی اصل حیثیت مسخ بھی نہ ہو اور ترجمہ بامحاورہ اسلوب کے ساتھ ہو جائے۔

3) صحافتی ترجمہ:

اسے کھلا ترجمہ بھی کہتے ہیں اور یہ مفہوم کے ترجمے کی ذیل میں آتا ہے۔ مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طریقے سے بیان کر دے۔ اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو تا کہ قارئین کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ترجمے کی زبان کا فقرہ ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اگر صحافی مترجمین سادگی، سلاست اور اردو کے فقرے کی ساخت کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور قارئین کے ذہن پر بھی بار نہ پڑے۔ ان کو چاہیے کہ جہاں وہ انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک دفعہ پڑھ کر دیکھ لیں آیا اصل مطلب ادا ہوا کہ نہیں صحافتی تحریروں کا مقصد صرف عوام کو آگاہ کرنا ہوتا ہے اور باخبر رکھنا ہی اولین مقصد ہوتا ہے اور یہ عمل دوطرفہ ہوتا ہے۔ ایک طرف حکومت وقت کے اچھے بُرے کاموں کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنا ہوتا ہے تو دوسری طرف عوام کے حالات، امور، مصائب اور احساسات کے بارے میں حکومتِ وقت کو باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے آسان سے آسان زبان و بیان استعمال کرنا صحافت کی سب سے بڑی ضرورت اور خوبی ہے۔ صحافت کی اہم ذمے داریوں کے پیش نظر ہی اسے جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ پہلا ستون مقننہ (Legislative)، دوسرا ستون انتظامیہ (Executive) اور تیسرا ستون عدلیہ (Judiciary) ہے۔ لغت مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے کیوں کہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ دماغ میں نہ آئے اور لغت دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. علمی ترجمے میں اصطلاحوں کی کیا اہمیت ہے؟
2. کیا محاوروں اور صنعتوں کے بغیر ادبی ترجمہ ممکن ہے؟
3. کیا ترجمے کی تینوں تکنیکوں کا استعمال تینوں میدانوں پر ہوتا ہے؟

2.8 خلاصہ

انسانی معاشرہ سماجی گروہوں میں منقسم ہے اور مختلف علاقوں میں سکونت پذیر ہے۔ نتیجتاً مختلف زبانیں پائی جاتی ہیں۔ انسانی خواہشات ضروریات میں بدلتی ہیں اور ضروریات مختلف قوموں اور لسانی گروہوں میں لین دین کے عمل کو جنم دیتی ہیں اور مختلف لسانی گروہوں میں لین دین کی خواہش وضرورت کی باقاعدہ تکمیل کے لیے ترجمہ کا فن اور اصول جنم لیتے ہیں۔ اصول وضوابط دراصل کسی بھی عمل یا فن میں باقاعدگی لانے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

ترجمے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اعتراف گوئٹے جیسے شاعر و مفکر نے بھی کیا ہے۔ دنیا کے علوم تک انسان کی رسائی صرف اور صرف ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو پاتی ہے۔ ترجمے کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک تخلیقی تو دوسری مشینی قسم ہے۔ تخلیقی ترجمے کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ تخلیقات کے ترجموں کو تخلیقی ترجمہ کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی ترجمہ تخلیقی نوعیت یا معیار کا ہوتا ہے تو ایسے ترجمے کو بھی تخلیقی ترجمہ کہتے ہیں۔

1776ء میں شاہ محمد رفیع الدین نے قرآن شریف کا لفظی ترجمہ کیا تھا، جس کی وجہ سے ترجمہ کافی گنجلک ہو گیا۔ اس کے باوجود ترجمے کی تاریخ میں اس کی ایک الگ اہمیت ہے۔ تھیوڈر ساوری نے ترجمے کی روایت سے ترجمے کے بارہ اصول اکٹھا کیے ہیں جن کا مترجمین جانے انجانے طور پر ترجمہ کرتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ تخلیقی ترجموں میں مصنف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔ نیز تخلیقی ترجمے میں تہذیبی سانچوں کی منتقلی بھی اہمیت کی حامل ہوتی

ہے۔اردو کی لفظیات کے تین اہم ماخذات ہیں یعنی عربی' فارسی اور ہندی۔اس لیے ترجمہ کرتے وقت مترجمین کو چاہیے کہ وہ مترادف الفاظ و اصطلاحیں مذکورہ تین ذریعوں سے اخذ کریں یا وضع کریں۔تخلیقی ترجموں میں صنعتوں اور محاوروں کی کافی اہمیت ہوتی ہے' کیوں کہ اشاروں کنایوں کی مدد سے بڑی بڑی باتیں بڑے مختصر اور موثر طریقے سے کہہ دی جاتی ہیں۔

ہر لفظ کا اپنا ایک تیور ہوتا ہے۔ترجمہ کرتے وقت ان باریکیوں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔لفظ تشریح طلب نہیں ہوتا جبکہ اصطلاح تشریح طلب ہوتی ہے۔ اصطلاحوں کا ترجمہ اصطلاحوں میں ہونا چاہیے اور محاوروں کا ترجمہ' محاوروں میں ہونا چاہیے۔اس کے لیے مترجم کو فرہنگوں اور لغتوں پر عبور ہونا چاہیے۔مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے کیوں کہ آج کی دنیا میں تمام مضامین ایک دوسرے پر منحصر اور ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ترجمے کے تین اہم میدان ہیں یعنی علمی ترجمہ' ادبی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ۔ان ہی تینوں میدانوں سے متعلق متون کے ترجمے کرتے وقت مترجمین ترجمے کی تین تکنیک یعنی لفظی ترجمہ' بامحاورہ ترجمہ اور آزاد ترجمہ کی تکنیکوں کا استعمال کرتے ہیں۔

2.9 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمہ کیا ہے؟ تفصیل سے بحث کیجیے۔
2. تھیوڈر ساوری کے تالیف کردہ اصولوں سے بحث کیجیے۔
3. اصطلاح سازی کے اصولوں پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. لفظ اور عبارت کے ترجمے پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. مترجم کے بنیادی فرائض کیا ہیں؟
3. ترجمے کے کسی ایک میدان پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

2.10 فرہنگ

تولید کار	=	پیدا کرنے والا	دبازت	=	موٹاپن' موٹائی' حجم
التزام	=	کسی بات کو لازم کر لینا' ضروری قرار دے لینا	حذف	=	گھٹانا' کم کرنا
کلیہ	=	جزئیہ کی ضد' عام قاعدہ' کالج' یونیورسٹی' ہمگی' تمام و کمال	مغائرت	=	غیریت' اجنبیت' بے گانگی
تلازمہ	=	مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال' رعایت لفظی	سُقم	=	خرابی' عیب' نقص' بیماری
مراجع	=	واپس بھرنے والا' رجوع کرنے والا	اعلام	=	خبر دینا' آگاہ کرنا' جتلانا
کماحقہ	=	بخوبی' ٹھیک ٹھاک' جیسا کہ اس کا حق ہے			
مشتق	=	نکلا ہوا' وہ لفظ جو کسی دوسرے لفظ سے بنایا گیا ہو			
عنقا	=	سیمرغ' ایک فرضی پرندہ' نایاب شئے			

2.11 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر قمر رئیس — ترجمہ کا فن اور روایت
2. ڈاکٹر خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری
3. شارا حمد قریشی — ترجمہ: روایت و فن
4. اعجاز راہی — روداد: سیمینار اردو زبان میں ترجمے کے مسائل

اکائی 3 : ترجمے کے بنیادی مسائل

ساخت

3.1 تمہید

3.2 تراجم کے عمومی مسائل

3.3 سائنسی علوم کے تراجم کے مسائل

3.4 سماجی علوم کے تراجم کے مسائل

3.5 افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل

3.6 شعری ادب کے تراجم کے مسائل

3.7 مترجم کی ذمے داریاں

3.8 مترجم کی صلاحیتیں

3.9 ترجمے کی اخلاقیات

3.10 خلاصہ

3.11 نمونۂ امتحانی سوالات

3.12 فرہنگ

3.13 سفارش کردہ کتابیں

3.1 تمہید

ترجمے کا فن اُس زمانے میں وجود میں آیا تھا جب دوسرے ملکوں اور قوموں کے حالات جاننے کی کوشش میں کسی ایک ملک کے لوگوں نے سیاحی کے شوق میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس تلاش میں اپنے پڑوس کے ملکوں میں جاتے اور ہزاروں میل دور مقامات تک بھی پہنچ جاتے۔ وہ اس سفر میں زمین پر بھی سفر کرتے اور سمندروں میں بھی۔

جب یہ سیاح کسی دوسرے ملک میں پہنچتا تو اُس ملک کی زبان خود سیکھتا یا کسی ایسے آدمی کا سہارا لیتا جو اُس ملک کی زبان اور سیاح کی زبان دونوں سے واقف ہوتا۔ جب سیاح دوسرے ملکوں کے لوگوں سے بات کرتا تو وہ آدمی جسے ہم ترجمان کہتے ہیں' ایک شخص کی بات دوسرے شخص تک ترجمے کے ذریعے ہی پہنچاتا اور دوسرا شخص جو بھی جواب دیتا اُسے ترجمے کے ذریعے اُس شخص تک پہنچاتا۔

ترجمے کے فن کی ابتدا ہزاروں سال پہلے شروع ہوئی تھی اور جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ اس کا محرک دوسرے ملکوں کے حالات اور اُن کی علمی فتوحات کی تلاش تھی۔ جب بھی کوئی قوم علمی اور فنی دنیا میں قدم رکھتی تو عام طور سے اُس کی پہلی منزل تلاش ہوتی۔ یعنی وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ دوسری قوموں اور ملکوں نے علمی اور فنی میدانوں میں کیا کوشش کی ہے۔

ترجمہ ایک ایسی کھڑکی ہے جس سے جھانک کر ایک زبان کے لوگ دوسری زبانوں کے سماجی گروہوں یا قوموں کے حالات کی واقفیت حاصل

کرتے رہے ہیں۔ترجمے کے ذریعے علم وفن کے میدانوں میں انسانی فتوحات ہم تک پہنچی ہیں۔اگر انسان ترجمے کے فن کا استعمال نہیں کرتا تو ہماری علمی روایات ہزاروں سال پیچھے رہ جاتیں۔مترجموں نے اپنی جدوجہد سے ہر قدم پر انسانی علم میں اضافہ کیا ہے۔ترجمے کے ذریعے ہی ایک مخصوص ملک کسی بھی جغرافیائی علاقے اور کسی بھی خاص قوم کے حالات اور اُس کے علوم وفنون حاصل کر کے تمام دنیا تک پہنچاتا ہے۔بقول ڈاکٹر ظ۔انصاری، سقراط، وی متناطیس اور افلاطون کی دو ہزار سال پہلے کی کاوشیں روما اور یونان کے کھنڈرات میں دب کر ناپید ہو جاتیں۔یہ عربی زبان کے عالموں کا کارنامہ ہے، جنھوں نے ترجموں کے ذریعے انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک پہنچا دیا۔اسی طرح بوعلی سینا، ابنِ رُشد اور ابونصر فارابی کے علمی اور فنی کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کی جغرافیائی حدوں تک ہی محدود رہ جاتے۔یہ لاطینی زبانیں ہی تھیں، جنھوں نے انسانیت کے اس بیش بہا خزانے کو آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا۔ مترجموں نے اپنی جدوجہد سے نہ صرف علمی خزانوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا بلکہ ان خزانوں میں غیر معمولی اضافہ بھی کیا۔

اس اکائی میں تراجم کے عمومی مسائل سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ترجمہ کتنا مشکل کام ہے نیز ان مسائل کو دور کر کے ہی آپ معیاری ترجم کر سکتے ہیں۔اس کے بعد موضوعات مثلاً سائنسی علوم، سماجی علوم، انسانی ادب اور شعری ادب کے تراجم سے متعلق مسائل سے علاحدہ علاحدہ بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد مترجم کی ذمے داریوں اور اس کی صلاحیتوں سے متعلق پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔آخر میں ترجمے کی اخلاقیات یعنی ترجمے کے دوران مترجم سے کن اخلاقی قدروں کی پاسداری کی توقع کی جاتی ہے اس پر بھی مختصر تاہم جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔بالکل آخر میں پوری اکائی کا نچوڑ خلاصے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور آپ کی سہولت کے لیے نمونہ امتحانی سوالات، فرہنگ اور سفارش کردہ کتابیں بھی دی گئی ہیں۔

3.2 ترجمے کے عمومی مسائل

لفظوں اور اصطلاحوں کے مناسب انتخاب کا مسئلہ سب سے بڑا ہے۔معاشرے کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔اس معاشرے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے، اس کے اقدار ہوتے ہیں۔علاقائی اور جغرافیائی تقاضے ہوتے ہیں۔اور وہی تقاضے زبان و بیان اور لہجہ طے کرتے ہیں۔مترجم کو مذکورہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔اگر کوئی چیز یا معاشرے کا کوئی پہلو ایسا ہے جس کے ترجمے کے لیے ترجمے کی زبان میں لفظ یا اصطلاح موجود نہ ہو تو اسے جوں کا توں استعمال کر لینا چاہیے۔اور حاشیے میں اس کی وضاحت کر دینی چاہیے۔مثلاً کشمیر میں گنا نہیں ہوتا۔اس کا ترجمے کے لیے بہتر تو یہ ہوگا اسے جوں کا توں لے لیا جانا چاہیے۔اور حاشیے میں اس کی وضاحت کر دینی چاہیے۔ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو کافی پڑھا لکھا ہونا چاہیے تاکہ اس کے پاس گنے (Sugarcane) کے بارے میں پورا علم ہو تبھی کہیں وہ اس علاقہ مخصوص لفظ کی حاشیے میں وضاحت کر پائے گا۔

دوسرا اہم مسئلہ لفظ اور اصطلاح کے وضع کرنے کا ہے۔علمی تراجم کے دوران بالخصوص اصطلاحوں کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔اگر ترجمے کی زبان میں تصنیف کی زبان کی تمام اصطلاحوں کے متبادل موجود نہ ہوں تو ان کی متبادل اصطلاحیں وضع کی جائیں اور جہاں یہ ممکن نہیں یا وضع کردہ اصطلاحیں عام نہ ہو پائیں، وہاں دوسری زبان کی اصطلاحیں اپنی اصل شکل میں استعمال کی جائیں۔اور اس کے لیے ایک طریقہ کار تیار کیا جانا چاہیے۔اور چوں کہ علم کا سفر جاری و ساری رہے گا لہٰذا یہ منصوبہ عمل بھی جاری ساری رہنا چاہیے۔اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ ہر شعبۂ ترجمہ میں اس کا ایک خاص کلچر پیدا کیا جانا چاہیے اور ممکن ہو تو وضع اصطلاح کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کیا جائے جس میں متعدد مضامین کے ذولسان ماہرین کو اس کام کے لیے اچھی تنخواہوں پر رکھا جائے۔

تراجم کے دوران ایک مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ کیسے دونوں زبانوں کا فقرے اور محاورے کی سطح تک جانکار دستیاب ہو۔اور اگر دونوں زبانوں کو مذکورہ سطح تک جاننے والا دستیاب بھی ہو جائے تو موضوع سے کماحقہ واقفیت رکھنے والا ملنا مشکل ہے۔یعنی تینوں کا ایک ہی شخصیت میں یکجا ہونا اشد ضروری ہے ورنہ اچھا مترجم اور اچھا ترجمہ منظر عام پر آنا نہایت مشکل ہے۔عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بیشتر مترجم وہ ہوتے ہیں جو تین یعنی موضوع، تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان میں سے صرف دو سے واقف ہوتے ہیں۔اور ان میں نسبتاً وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان میں فقرے اور محاورے کی سطح تک کی واقفیت رکھتے ہیں اور وقت ضرورت پر موضوع کے ماہر سے مشورہ کرتے ہیں۔

ہر ادبی فن پارہ اپنی تہذیب کے سائے میں سانس لیتا ہے۔ اگر ترجمے میں اس کا رشتہ اس کی تہذیب سے ٹوٹ جائے تو وہ بے جان نظر آنے لگتا ہے۔ تصنیف کے ساتھ مکمل وفاداری اور آمد کو آورد سے گزار کر آمد کی شکل و کیفیت عطا کرنا نہایت اہم بات ہے۔ اگر تصنیف کے مواد اور اس کی زبان وغیرہ سے مکمل اور سختی سے وفاداری نبھائی جائے تو ترجمے کی روانی اور سلاست وغیرہ متاثر ہو سکتی ہیں اور اگر حسن بیان کا خیال رکھا جائے تو ترجمہ وفاداری کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ ایک فرانسیسی ادیب نے اسی لیے کہا تھا کہ ترجمہ ایک عورت کی طرح ہے جو یا تو خوب صورت ہے یا وفادار دونوں نہیں۔ لیکن درحقیقت بعض ترجمے اسی طرح خوبصورت اور وفادار ہو سکتے ہیں جس طرح بعض عورتیں بذات خود خوبصورت اور اپنے شوہر کے تئیں وفادار ہو سکتی ہیں بشرطیکہ مترجم اپنے فن سے مکمل وابستگی کا مظاہرہ کرے اور اپنے فن کے تقاضوں کو بحسن و خوبی پورا کرے۔

تراجم کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ مترادفات کا انتخاب اور استعمال بھی ہے۔ اکثر ترجمے کی زبان میں ایسے مترادفات بہم نہیں ہوئے کہ اصل مفہوم کو پیش کیا جا سکے۔ اس میں کچھ زبان کے مزاج اور اس کے تہذیبی پس منظر کو بھی دخل ہوتا ہے کچھ اشیا و کوائف کی کسی زبان میں عدم موجودگی کو بھی۔ اس لیے مترجم کو مجبوراً قریب المعنی مترادفات کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ البتہ جہاں لفظوں کے معنوی شیڈ میں زیادہ فرق آ جائے وہاں فٹ نوٹ میں وضاحت کرنی پڑتی ہے۔

ترجمے کے دوران مترجم کو دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا سفر کرنا پڑتا ہے اور یہ اکادمک سفر بہت دشوار طلب ہے کیوں کہ دونوں کے درمیان باریک فرق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ ایسا نہ کر پانے کی صورت میں مترجم اپنے ترجمہ سمیت ڈگر سے بھٹک سکتا ہے اور اس کی یہ کوششیں رائیگاں ہوں گی اور اگر کہیں مترجم ترجمے کا ترجمہ کر رہا ہوتا ہے تو اس کی مشکل میں ایک پرت کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں اسے تین زبانوں اور تہذیبوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

ترجمے کے دوران ایک اہم مسئلہ طویل جملوں کا ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے موزوں طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ ایسے طویل جملوں کو کئی مرتبہ پڑھنے کے بعد چھوٹے چھوٹے جملوں میں توڑ دینا چاہیے۔ اور ان کی باقاعدہ تفہیم کے بعد اس طرح ترجمہ کیا جانا چاہیے کہ تصنیف کی زبان کے طویل جملے کی معنوی نوعیت و کیفیت ترجمے کی زبان میں بجنسہ برقرار رہے۔

ان تمام مشکلات کا حل ڈھونڈنے اور اس عرق ریزی سے کام کرنے کے باوجود ترجمے اور مترجم کی وہ حیثیت نہیں جو اصل تصنیف کی ہوتی ہے۔ ترجمہ اور مترجم کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ بعض ادارے اب بھی سرورق پر مترجم کا نام نہیں چھاپتے بلکہ اس کا نام دوسرے یعنی اندر کے صفحے پر آتا ہے۔

ترجمے کے کام کی اجرت بہت کم ملتی ہے اور مترجمین کی تنخواہیں بھی بہت قلیل ہوتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمے اور مترجم کو معاشرے میں کیا حیثیت حاصل ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور ادبی نشاۃ الثانیہ میں ترجمے اور مترجم کا رول نہایت وقیع رہا ہے تاہم ان کی تاریخی کوششوں کو معاشرے نے بالخصوص ادبی حلقوں نے کبھی بھی اس طرح سے نہیں سراہا جس کے کہ وہ مستحق ہیں۔

عام طور پر کسی ترجمے کو اچھا سمجھ کر جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں بڑی روانی ہے، زبان بامحاورہ و سلیس ہے اور مضمون واضح ہے لیکن اگر اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ صرف روانی و سلاست ترجمے کے بنیادی اجزا نہیں ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ سنجیدہ و پیچیدہ تحریر کا ترجمہ صرف رواں و سلیس کیسے ہو سکتا ہے جب کہ زبان کا مزاج اور جملوں کی ساخت ترجمے کی زبان کے مزاج اور جملوں کی ساخت سے مختلف ہے۔ ایسی صورت میں مترجم کی ذمے داری یہ ہوتی ہے کہ ترجمے کی زبان کو اسی حد تک آسان کرے کہ تصنیف کے معنی کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔

اکثر ترجموں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اصل معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو ہمارے ہاں افسانوں اور ناولوں کے آزاد ترجموں کی وجہ سے راہ پا گئی ہے۔ جب کسی فلسفیانہ پیچیدہ تحریر کا ترجمہ کیا جائے گا تو ظاہر ہے اس میں وہ روانی تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے میں مترجم کا فرض یہ ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ لفظوں کا ترجمہ قریب قریب معنی

ادا کرنے والے الفاظ سے نہ کرے اور ضرورت پڑنے پر نئے مرکبات بنائے، نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے ترجمے سے آخر کیا فائدہ جو سلاست تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے۔

ترجمے کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اپنی بات ہو تو آدمی جس طرح چاہے اس کا اظہار کر دے لیکن ترجمے میں آدمی بندھ کر رہ جاتا ہے۔ مصنف کے ہاتھ میں مترجم کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ اگر اس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تو اصل سے دور ہو جاتا ہے اور اگر اس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی تو بیان میں اجنبیت آ جاتی ہے، جملوں کو توڑ کر اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تو اس کی زبان، بیان و اظہار کے نئے امکانات سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں مترجم کی ذمے داری یہ ہے کہ تصنیف کی زبان کو ترجمے کی زبان کے اظہار سے قریب تر لائے۔ اور مصنف کے لہجے اور طرز ادا سے اپنی زبان میں ایک نئے اسلوب کے لیے راہ ہموار کرے۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر ترجمے اردو کے روایتی و مروجہ طرز ادا کے ذریعے کیے گئے ہیں جس سے زبان اور قوت اظہار کو ترجموں سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے جس کے امکانات ہمیشہ اچھے ترجموں میں ہوتے ہیں اور جن کی ہمیں زبان و بیان کی ترقی کے لیے شدت سے ضرورت ہے۔ ایسے ترجموں میں ممکن ہے آپ کو اجنبیت کا احساس ہو لیکن اس اجنبیت سے جب آپ مانوس ہو جائیں گے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اب زبان خیال و احساس کے بوجھ تلے دب کر نہیں رہ سکتی بلکہ اب اس میں اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے ترجمے روا روی میں نہیں پڑھے جا سکتے اور نہ ان کا حسن و دلکشی ایک ہی نظر میں آپ کے دیدہ و دل تک پہنچ سکتی ہے بلکہ ایسے ترجموں کو آپ پلاٹ، کہانی یا موضوع کی دلچسپی اور افادیت کو زیادہ نئے فلسفیانہ انداز فکر، سنجیدہ تہذیبی رویوں، جملوں کی نئی ساخت، اظہار و انداز بیان کے نئے امکانات کے لیے پڑھیں گے۔

ترجمے دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہوئے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہے مگر آج تک کوئی ایک ایسی مکمل کتاب سامنے نہیں آئی جس میں ترجمے کے بنیادی مسائل بحیثیت مجموعی زیر بحث آئے ہوں اور ان مسائل کے حل بتائے گئے ہوں جس سے ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی راہ ہموار کرنے میں مدد مل سکے اپنی حدوں اور ذمے داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی تربیت کے لیے استعمال کر سکے۔

لغت، صرف، نحو، معانی و بیان اور قواعد وغیرہ پر کافی وقت صرف کیا گیا ہے اور لسانیات کے ماہرین نے الفاظ و لغات کو ہر پہلو سے پرکھا ہے۔ انہیں زیادہ مکمل اور مفید بنانے کی کوشش کی مگر ترجموں پر صرف رائے زنی کر کے سوالوں اور اصولوں کو ترجمہ کرنے والے کے ضمیر اور اس کی صلاحیت پر چھوڑ دیا۔ اور جو اشخاص زبانوں اور ادبوں پر دست رس رکھتے ہیں وہ بھی محض اپنی کاوشوں کو نشان راہ کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے۔

ترجمے کی دنیا میں قدم رکھنے کے لیے جس درجے کی ذہانت، سنجیدگی، علم، مشق اور ذہنی محنت و مشقت کی ضرورت پڑتی ہے وہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور المیہ یہ ہے کہ ترجمے کے معاملے میں ہر شخص بے لگام ہے۔ جب اور جس کے جی میں آتا ہے ترجمہ کر ڈالتا ہے۔ بعض اداروں اور لوگوں نے جو ترجمے کے بعض اصول مرتب کیے ہیں ان پر پہلی بات تو یہ ہے کہ اتفاق رائے نہیں ہے اور اگر کہیں کہیں پر اتفاق رائے ہے تو دوسری بات یہ ہے کہ ان کی پیروی بھی نہیں ہو رہی ہے۔

اس وقت ملک میں مختلف ادارے ترجمے کے کام میں مصروف ہیں اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ایسے تمام اداروں کے لیے ایسا معیار قائم کر دیا جائے جسے تمام ادارے خوشی سے اپنائیں تاکہ ترجمے کے معیار کو یکسانیت مل سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. زبان و بیان اور لہجے کے تعین میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں؟
2. سائنسی اور علمی ترجموں کے دوران سب سے بڑا مسئلہ کیا درپیش ہوتا ہے؟
3. ترجموں کے دوران کیا متن اور حسنِ بیان دونوں کے تئیں وفاداری ممکن ہے؟
4. کیا تاریخی، سماجی، تہذیبی، لسانی اور ادبی نشاۃ الثانیہ میں ترجموں کا رول وقیع ہے؟

3.3 سائنسی علوم کے تراجم کے مسائل

اپنی زبان کو سائنسی علوم سے مالا مال کرنے اور موثر ذریعۂ تعلیم بنانے کی خاطر سائنس کے موضوعات کو اردو میں ڈھالنے اور پیش کرنے کا کام تیزی سے انجام دینا ایک اہم فریضہ ہے۔ یہ کام اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ سائنس کے طلبا انگریزی میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ان پر دو طرح کا بوجھ ہے۔ ایک طرف تو انہیں انگریزی زبان سیکھنی ہے تو دوسری طرف سائنس کے مواد کو سمجھنا ہے۔ ان دونوں کے بوجھ تلے ان کی کارکردگی متاثر ہو رہی ہے۔ دنیا کے ماہرین تعلیم اس بات سے پوری طرح سے اتفاق کرتے ہیں کہ مادری زبان میں آدمی زیادہ اور جلدی سیکھتا ہے۔ مگر ایک بڑا مسئلہ جو درپیش ہے وہ یہ کہ سائنس کے علوم کا مواد اردو زبان میں نہ ہونے کے برابر ہے لہذا سائنس کے علوم کو اردو میں ڈھالنا اشد ضروری ہے۔ جب بھی ترقی یافتہ قوم سے علم کی شمع کو کسی اور قوم نے لیا تو اس میں پہلا مرحلہ کتب اور موضوعات کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا کام ہوتا تھا۔ یونانی علم کو عرب سائنس دانوں نے عربی میں ڈھالنے کا کام کیا اور پھر موثر اور بھرپور انداز سے سائنس کے علوم کو عروج تک پہنچایا۔ اس طرح اہل یورپ نے مسلمان سائنس دانوں کے کام سے استفادہ کیا تو اپنی زبان میں علم کو سب سے پہلے ڈھالا اور پھر ترقی کی راہیں کھلتی گئیں۔ ہم اردو والوں کو بھی بالکل یہی کرنا ہے جو ابتدا ترجمے کے عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

سائنسی تراجم کے دوران سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ سائنسی اصطلاحات کا مسئلہ آسان نہیں۔ اس میں بڑی مشکلات آتی ہیں۔ لہذا توجہ اور سنجیدگی سے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے میں درج ذیل مسائل درپیش ہیں:

1. معیاری سائنس اصطلاحات کا فقدان ہے اردو میں کوئی ایسی معیاری لغت یا فرہنگ نہیں ہے جو ہر طرح سے مکمل ہو اور جسے معیار مانا جائے۔ بعض اصطلاحات جو لغات میں نظر آتی ہیں۔ الفاظ کی روح سے مناسبت نہیں رکھتیں۔
2. سائنسی علوم کو اردو میں ڈھالنے کا کوئی مربوط پروگرام نہ ہونے کے سبب دل جمعی سے کام کرنا ممکن نہیں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ غیر منظم طریقے سے ہو رہا ہے۔ اسے منصوبہ بند طریقے سے کرنے کی ضرورت ہے۔
3. ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ انگریزی اصطلاحات کو ہر صورت میں ترجمہ کرنا ہے یا ویسے ہی استعمال کر لینا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں اختلافات موجود ہیں اور دونوں نظریات رکھنے والی شخصیات پائی جاتی ہیں۔ جس سے مسئلہ الجھا ہوا ہے۔
4. سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں۔ بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جا سکتا ہے۔ مگر بعض کا ترجمہ قطعی مناسب نہیں۔ مگر بعض مکتبہ فکر کے لوگ ہر لفظ کا ترجمہ چاہتے ہیں اور اس ترجمے کو رائج کرنا چاہتے ہیں، جس سے سائنس کی زبان اور اس کی لفظیات و اصطلاحات یکساں طور پر طے نہیں ہو پا رہی ہے جس سے سائنسی تراجم میں مشکلات آتی ہیں۔
5. سائنسی تراجم کے دوران حائل ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے سائنسی برادری پر مشتمل کوئی اعلیٰ کمیٹی نہیں ہے۔ سائنسی تراجم اور وضع اصطلاحات کے وقت سائنس کے ایسے ماہرین جو دونوں زبانوں پر کسی خاص معیار تک رسائی رکھتے ہوں اور ترجمے کا کام بھی کر چکے ہوں، سے کام لیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دی جا سکتی ہے جو اس کام کی نگرانی کرے اور کام کو آگے بڑھانے کے طریقے وضع کرے۔
6. سائنس کے موضوع پر اردو میں لکھنے والوں اور سائنسی مواد کو ترجمہ کرنے والوں کا فقدان ہے اور یہ اس لیے ہے کہ انہیں معقول معاوضہ نہیں دیا جاتا اور اسی لیے اس میدان کی طرف زیادہ اہل علم رخ نہیں کرتے۔ مزید برآں یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور پھر اردو میں سائنسی مضامین پر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اپنی زبان کو سائنسی علوم سے مالا مال کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟
2. سائنسی علوم کے ترجمے میں سب سے بڑا مسئلہ کیا درپیش ہوتا ہے؟
3. کیا اردو میں سائنسی علوم کی منتقلی کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام ہو رہا ہے؟

3.4 سماجی علوم کے تراجم کے مسائل

ترجمے کی عموماً دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو سلیس، رواں اور آزاد ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو لفظی ترجمہ ہوتا ہے۔ لوگ عموماً پہلی قسم کو پسند کرتے ہیں۔ دوسری قسم کو مشکل کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ داستانوں، افسانوں، کہانیوں، مزاحیہ خاکوں اور ہلکی پھلکی نگارشات کے ترجمے کے لیے تو پہلی قسم بہت موزوں ہوتی ہے مگر علوم وفنون کے ترجمے کے لیے دوسری قسم کے ترجمے کے طریقے کو اپنایا جاتا ہے۔ یہاں اصل کے ہر لفظ کے معنی اور اس کی اہمیت ترجمے میں حتی الامکان پوری طرح سے منعکس ہونی چاہیے۔ ورنہ مصنف نے جو دلائل وشواہد پیش کر کے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور ان کے اظہار و بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ترجمہ ان کا آئینہ دار نہیں ہوگا۔ علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے والے مترجم پر بڑی اہم ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنی فکر کو اصل مصنف کے فکری قالب میں ڈھال کر ہی اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ علوم کا ترجمہ ہر صورت میں لفظی ہونا چاہیے۔

ترجمے کی طرح ہم علم کو بھی بڑے پیمانے پر دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ سائنسی علوم اور سماجی علوم۔ دونوں کے ترجمے کا انحصار زیادہ تر اصطلاحات پر ہوتا ہے۔ اگر کسی سائنسی علم کی تمام اصطلاحات مترجم کی میز پر رکھی ہوں تو ترجمے میں زیادہ دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ آسان اور سادہ الفاظ کے ساتھ اصطلاحیں استعمال کر کے مطلب ادا کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس سماجی علوم کے لیے اصطلاحات کے علاوہ دونوں زبانوں میں عام مہارت بھی ضرور ہوتی ہے۔ اس پہلو پر اس لیے زور دیا جاتا ہے کہ ان علوم کا ترجمہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ مترجم تصنیف کی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو اور ترجمے کی زبان کے معنی خیز الفاظ کا وافر ذخیرہ اس کے ذہن میں محفوظ نہ ہو۔ سماجی علوم کا ترجمہ کرنے کے لیے اسے اپنی زبان میں بھی اظہار و بیان کی پوری قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ انگریزی کے الفاظ، محاوروں اور اسالیب بیان کو سمجھ لینے کے بعد انہیں اپنی زبان میں اسی وقت صحت کے ساتھ ڈھالا جاسکتا ہے جب مترجم کے پاس مناسب اور موزوں الفاظ کا وافر ذخیرہ موجود ہو۔ اصطلاحات اور مشکل الفاظ کے لیے فرہنگوں، قاموسوں اور لغات کو بار بار دیکھنا تو بہر حال پڑے گا مگر مترجم کا خود اپنا ذخیرہ الفاظ اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ اس کام پر حد سے زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے اور ایک معقول رفتار کے ساتھ کام آگے بڑھے۔

ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سماجی علوم کے لیے لسانی قابلیت، وسیع مطالعہ اور محنت تینوں چیزیں لازمی ہیں۔ جو بہت مشکل سے کسی مترجم میں یکجا ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر فلسفے کی کسی کتاب کے ترجمے کے لیے اصطلاحات کی دستیابی ہی سب کچھ نہیں ہے۔ اصل کتاب کے پورے متن کو اردو میں منتقل کرتے وقت جابجا اصل زبان کی تعبیرات، توضیحات اور منطقی دلائل و براہین کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے میں دقت پیش آتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں پر محتاط نگاہ رکھنا اور انہیں برتنا ایک مترجم کے لیے مشکل کام ہوتا ہے۔

فلسفے کے علاوہ دوسرے سماجی علوم میں بھی پس منظر کے طور پر ایک قسم کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ تاریخ، نفسیات، اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات غرض جملہ انسانی علوم جو انسان کے ذہن اور اس کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مسائل کا تجزیہ کسی نہ کسی قسم کے فلسفہ کا ضرور حامل ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی علوم کے ترجمے میں سائنسی علوم کی طرح صرف اصطلاحیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں بلکہ یہ عبارت کی مترادف عبارت ترجمے کی زبان میں پیش کرنے کے لیے ایک ایک لفظ کا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے۔ تراجم بالعموم اور سماجی علوم کے تراجم، بالخصوص اس لیے بھی مشکل ہوتے ہیں کہ اردو میں کوئی بہت معیاری اور مبسوط لغت دستیاب نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم کی لغت The Standard English Urdu Dictionary اپنے آپ میں اچھی لغت ہے تاہم ناکافی ہے۔ اسے عہدِ خاطر کے تقاضوں کے مطابق بنانے کی سخت ضرورت ہے، اگرچہ شان الحق حقی کی مرتبہ لغت اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری کافی جامع اور جدید ترین ہے اور جو ابھی جلد ہی شائع ہوئی ہے۔ لیکن بیش تر مترجمین اس لغت سے واقف نہیں ہیں۔

ترجمے کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کی لغت پر نظر ثانی کر کے اسے مترجمین کے لیے ایک جامع اور معیاری انگریزی اردو لغت تیار کرنا اشد ضروری ہے۔ اس لغت میں کم سے کم پندرہ ہزار نئے الفاظ اور محاوروں کا اضافہ فوری طور پر کیا جانا چاہیے۔ موجودہ الفاظ میں سے جن الفاظ کے ساتھ مشہور محاورے نہیں دیے گئے ہیں ان کے ساتھ ایسے محاورے دیے جائیں اور جدید الفاظ کے ساتھ بھی یہ التزام قائم رکھا جائے۔ مترجمین کو

ترجمے کے دوران جو اہم ضرورتیں پیش آتی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس لغت میں انگریزی کی معیاری لغتوں کی طرح چند معلوماتی ضمیمے ضرور شامل کیے جائیں۔ مثلاً ایک ضمیمہ ان اہم شخصیتوں کے ناموں پر مشتمل ہونا چاہیے جن کا ذکر اکثر علمی کتابوں اور تاریخی تذکروں میں جا بجا آتا ہے۔ ہر انگریزی نام کے سامنے اس کا اردو املا عربی حروف میں اعراب کے ساتھ درج ہونا چاہیے تاکہ ان ناموں کا تلفظ متعین ہو سکے۔ دوسرا ضمیمہ اس طرح تمام دنیا کے مقامات کے ناموں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اگر ہماری جامع لغت میں اہم شخصیتوں اور مقامات کے نام صحیح تلفظ کے ساتھ مل جائیں تو پھر ان کو ترجمے میں بآسانی درج کیا جا سکے گا۔ ایک اور ضمیمہ مخففات اور مختصرات کا ہونا چاہیے۔ ایک ضمیمہ تلمیحات سے متعلق بھی ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان کی علمی کتابوں میں بعض اوقات ایسی تلمیحات آ جاتی ہیں کہ ان کی گتھی کو سلجھائے بغیر سلسلہ آگے نہیں بڑھتا' ایسے موقعوں پر ہمارے مترجم کو کسی انسائیکلوپیڈیا کی تلاش اور اس کی سرگردانی سے بچانے کے لیے انگریزی اردو لغت میں ایسی تلمیحوں کا مختصر حوالہ مل جانا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علوم فنون کے لیے ترجمے کا کون سا طریقہ اپنانا مناسب ہوتا ہے؟
2. سائنسی ترجموں کے برخلاف علمی ترجموں کے دوران اصطلاحوں کے علاوہ کون سے اور مسائل ہوتے ہیں؟
3. اردو میں انگریزی اردو لغت کی کیا صورت حال ہے؟ کیا آپ مطمئن ہیں؟
4. مترجمین کی آسانی کے لیے لغات میں کن کن باتوں کا مزید اہتمام ہونا چاہیے؟

3.5 افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل

ترجموں کے سلسلے میں خواہ ترجمہ تخلیقی ادب کا ہو یا علوم کا سب سے اہم مسئلہ وہ ذہن و رویہ ہے جو ترجموں کو ذہنی اختراع کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ یہ تصور کہ ترجموں کی بھی ایک تخلیقی اہمیت ہے فی الحال رواج نہیں پا سکا ہے۔ عام تصور اب بھی یہی ہے کہ ترجمے میں اختراع ذہن کا کوئی عمل نہیں ہوتا' اس لیے اس کی حیثیت تخلیقی فن پاروں کے برابر نہیں ہے۔

اقوام کے درمیان لین دین اور افہام و تفہیم محض معاشی و سیاسی سطح پر نہیں ہوتی بلکہ فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے۔ اس سطح پر دیکھا جائے تو ترجموں کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تاہم آج کے حالات میں جدید علوم کے حوالے سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اہم بات اپنی کم مائیگی اور تہی دستی کے ازالے کی ہے۔

علوم کا ترجمہ کرتے وقت بھی تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مترجم کو اتنی ذمے داری تو قبول کرنی چاہیے کہ قارئین تک صحیح مفہوم پہنچائے۔ علوم کے ترجمے کے لیے دو زبانوں پر قدرت اور علم کو سمجھنا ہی کافی ہے۔ وہاں مسئلہ صرف مواد کا ہوتا ہے۔ اسلوب کا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ زیادہ عقل چاہیے اور تخیل شخص اتنی کہ آپ کسی لفظ یا اصطلاحات کے مضمرات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکیں۔

افسانوی ادب کے ترجمے کی بات اور ہے۔ ایسی صورت میں دو تہذیبیں ہی نہیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں بلکہ ایک نثری روایت بھی کارفرما رہتی ہے۔ ایک تہذیبی اور نثری سانچے کو دوسرے تہذیبی و نثری سانچے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو ہر زبان کا ہر لفظ اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ لفظوں کو آپس میں جوڑنے سے جملے کی ساخت بنتی ہے۔ یہ جملے کا ایک آہنگ ہوتا ہے۔ پھر جملے آپس میں مل کر اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں' پھر یہ بھی ہے کہ پورے افسانے یا ناول سے ایک فضا یا وحدت تاثر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا افسانوی ادب کے ترجموں میں ترجمہ محض لفظ کا نہیں ہوتا۔ جملوں کی ساخت اور آہنگ نیز اسلوبیاتی فضا یا تاثر کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے اور اسے بھی اپنی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ ناول یا افسانے کی تہذیبی فضا کے پس منظر ایسی موزوں لفظیات سے کام لینا پڑتا ہے جو ترجمے میں پوری فضا کو منتقل کر سکیں۔

اعلیٰ ادب کے ترجموں سے فنکار کی اپنی زبان میں وہ ادبی و ذوقی فضا پیدا ہوتی ہے جسے خود فنکار قائم کرنا چاہتا ہے اور جس میں خود اس کی تخلیقی

صلاحیتیں نمو پاتی ہیں۔ظاہر ہے کہ بڑی تخلیقی کاوشیں بڑے تناظر میں پیدا ہوسکتی ہیں۔لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تخلیقی فنکار دوسری زبان کے لفظوں کے جادو کو اپنی زبان کی لفظیات میں جگانا چاہتا ہے۔فقروں کی ساخت اور اسلوب کے جوہر کو منتقل کرتے وقت وہ خود اپنی زبان کو نئے آہنگ، نئی معنوی وسعتوں، اظہار کی نئی صورتوں اور نئی افسانوی فضاؤں سے آشنا کراتا ہے۔اور اس کے ساتھ اپنی ذات کے تخلیقی حدود کو بھی وسعت دیتا ہے۔

عام سطح پر دیکھا جائے تو افسانوی ترجموں کے مسائل کم وبیش وہی ہیں جو کسی بھی غیر زبان کی تحریر کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت پیدا ہوتے ہیں۔تاہم افسانوی ادب کے ترجمے مترجم میں خاص صلاحیت کا تقاضہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ زبان دانی کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل بھی ہو۔بہ الفاظ دیگر ترجمہ کرتے وقت مترجم تصنیف کی زبان میں پوری طرح سے رچ بس جائے۔پھر جب ترجمہ کرنا شروع کرے تو ترجمے کی زبان میں واپس آجائے۔

ایک حیاتیاتی اصول یہ ہے کہ طاقت وحسن دونوں نسلی امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں اور یہی اصول زبان پر بھی منطبق ہوتا ہے اور یہی خاصیت مترجم کی ہونی چاہیے۔یعنی وہ دونوں زبانوں میں سوچ سکے۔تخلیقی صلاحیت مترجم کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ افسانوی ادب کا ترجمہ کرتے وقت اپنے تخیل کی مدد سے خود کو دونوں زبانوں میں اس طرح جذب کرسکے۔ظاہر ہے کہ یہاں روح سے مراد معنوی جہتیں اور جسم سے مراد اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔

زبان کی معنوی اور اظہاری جہتوں میں اضافہ ہوگا تو اس میں تنوع کے ساتھ اجنبیت بھی آئے گی اور اس طرح زبان کا چٹخارہ لینے والوں کو اس میں کچھ نہ کچھ کھردرا پن بھی محسوس ہوگا۔اسی لیے بعض لوگ تخلیقی ترجمے سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ترجمہ شدہ تحریر ترجمہ نہ معلوم ہو۔بہ الفاظ دیگر اس میں کوئی اجنبیت یا کھردرا پن نہ ہو۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ کرتے وقت اپنی زبان کے محاوروں اور روزمرہ کا خیال رکھنا ضروری ہے۔مگر دوسری زبان سے ترجمہ کرتے وقت اکثر اس زبان کے محاورے اور روزمرہ کے ترجمے بھی کرنے پڑتے ہیں۔جو نہ صرف مشکل مرحلہ ہوتا ہے بلکہ اس سے ترجمے کی زبان میں بھی کافی وسعت آتی ہے۔جس سے انگریزی کے متعدد محاورے اور الفاظ ہماری زبان میں داخل ہوگئے ہیں۔مختلف تہذیبوں کا روحانی تحرک، کرب و انبساط کی ساعتیں، فقروں کے مختلف آہنگ اور اسالیب کا تنوع یہ سب اردو کے پیکر میں ڈھل کر اردو افسانوی ادب کے حدود میں مزید وسعتوں کا سبب بنے ہیں۔

المختصر تخلیقی ادب کا ترجمہ بھی تخلیقی سطح کا ہونا چاہیے۔بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تخلیقی فنکار نہیں ہیں لیکن اپنے وسیع مطالعے کا اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل کے باعث تخلیقی فنکاروں کے ساتھ قدم ملا کر چل سکتے ہیں۔اس طرح سے ایسے حضرات مترجم کی دیگر خصوصیات سے لیس افسانوی ادب یا تخلیقی ادب کا بہتر ترجمہ کرسکتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. افسانوی ادب کے ترجمے میں کیا دو تہذیبوں اور دو نثری روایتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟
2. طاقت اور حسن دو نسلوں کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔کیا اس اصول کا اطلاق ترجمے پر ہوسکتا ہے؟
3. کیا تخلیقی ادب کا ترجمہ تخلیقی قسم کا ہونا چاہیے؟

3.6 شعری ادب کے تراجم کے مسائل

ہر فن کے ترجمے کے مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔نظم کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔نثر میں افسانے، ناول وغیرہ کا ترجمہ ٹیکنیکل کتابوں کے مقابلے میں آسانی سے کیا جاسکتا ہے اور بولی جانے والی زبان کا ترجمہ اور بھی زیادہ آسان ہے۔سب سے زیادہ مشکل اور بعض اوقات تو ناممکن حد تک مشکل کام نظم کا ترجمہ ہے، جس کے لیے ڈاکٹر جانسن نے سیدھے سادے الفاظ میں کہا تھا کہ

"نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

اور وکٹر ہیوگو نے فیصلہ سنایا تھا کہ نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔لیکن اس کے باوجود دنیا میں نظم کے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔مغرب میں صفِ اول کے ادیبوں اور شاعروں نے ایسے بے معنی اور ناممکن فن کی طرف توجہ کی ہے۔مثلاً لوتھر،سیسرو، ہوریس،شیلی اور کالرج،پوپ،ڈرائی ڈن وغیرہ نے اہم ترجمے کیے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعری کا شاعری میں ترجمہ نہایت مشکل کام ہے۔تاہم تمام مشکلات کے باوجود شاعری کا ترجمہ شاعری ہی میں ہونا چاہیے ورنہ شاعری سے مخصوص جامعیت کے ساتھ اثر انگیزی اور کیف وانبساط پیدا کرنے کی خاصیت شاعری کے نثری ترجمے میں جاتی رہے گی کیوں کہ نثری ترجمہ اصل شعری متن کے مزاج کے ساتھ غالباً انصاف نہیں کرتا اور اس طرح نثری ترجمے کے باعث اصل شعری متن کی تاثیر ضائع ہو جاتی ہے۔مترجم کے سامنے یہ نکتہ ہمیشہ رہنا چاہیے کہ ترجمے اور اصل کا باہمی رشتہ برابر قائم رہے اور اصل متن کے ساتھ ان نئے لوگوں کے لیے برابر سود مند ہو جن کے لیے اصل شعری متن کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف ضروری اور ممکن ہے کہ کوئی بھی ترجمہ سو فیصد اصل متن کے مطابق نہیں ہوتا اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ خواہ گفتگو ہی کے جملوں کو دو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تو جہاں زبانیں ایک ہی لسانی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں وہاں جملے کی ساخت تقریباً یکساں ہو سکتی ہے لیکن جہاں ایسے یکساں لسانی گھرانے نہ ہوں وہاں جملے کی ساخت میں بھی ردوبدل لازمی بات ہے ان دونوں باتوں کو ترجمے کے عمل کی بنیادی دشواری قرار دیا جا سکتا ہے۔تاہم ایسی دشواری ایک اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ترجمے کی صورت میں متن کی شکل ہر طور بدلتی ہے۔متن ترجمے کے عمل سے گزرتے ہوئے ایک نیا قالب اختیار کرتا ہے اور نئے لسانی پیکر میں نئے لفظوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ہر زبان کے الفاظ کی اپنی محاکاتی فضا ہوتی ہے۔یوں ترجمے کا عمل متن کو ایک نئی لسانی آب وہوا میں آباد کرتا ہے۔اس بات کو دوسرے اصول کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔اس لیے اگر دو اصولوں کی روشنی میں ترجمے کے عمل کو دیکھا جائے تو علم ہوگا کہ ترجمے کے ذریعے الفاظ اور جملوں کی ساخت بدلتی ہے لیکن متن کا مافیہ قائم رہتا ہے۔ان پہلوؤں سے متعلق مترجم کی فہم میں گیرائی و گہرائی پائی جائے۔

شعری ادب کے تراجم کے دوران سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ ایک زبان کا شعری فن پارہ کسی مخصوص صنف میں تخلیق پاتا ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ دوسری زبان میں بھی وہ صنف پائی جائے۔اس لیے شعری متن کا ترجمہ ایک بہت بڑی مشکل کھڑی کرتا ہے۔اسی سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا شعری متن کو مروجہ شعری صورت ہی فراہم کرنا ضروری ہے۔اس لیے کہ مختلف لسانی گھرانوں کے عروضی نظام عموماً مختلف ہوتے ہیں نظم وشاعری کی سب سے خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں صوتی توازن اور آہنگ پایا جاتا ہے اور ترجمے کے دوران انہیں منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔قدامت پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہوتی ہے۔ان دونوں صورتوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اگر انگریزی نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہے تو اس شعریت کے ضروری اجزا زیر و بم یا آہنگ اور صوتی توازن بھی ہیں۔لہٰذا انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت ردھم (Rhythm) اور کیڈنس (Cadence) کو منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔اس لیے کسی انگریزی نظم کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اپنی پسند اور انگریزی نظم سے مطابقت رکھتے ہوئے کسی عروض کا استعمال کرنا چاہیے۔

شعری ادب کے تراجم میں ایک مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ بعض شعرا کی زبان اور ان کا انداز بیان بیانیہ اور شفاف ہوتا ہے اور بعض شعرا کی زبان اور ان کا انداز بیان استعاراتی ہوتا ہے۔اور اسکی امیجری زبان کے بطن سے پھوٹتی ہے۔اس بات کو ملحوظ رکھا جائے تو استعارے کی شعری زبان کو ترجمہ کرنا نہایت غیر مناسب اور مشکل کام ہے بالخصوص اس وقت تک جب تک کہ استعارے کو خارج کرنے کا اصول طے اور تسلیم نہ کیا جائے۔کیوں کہ استعارہ شعری زبان کے لسانی پیکر میں ضم ہوتا ہے اور اسے ترجمہ کرتے وقت زبان کی محض ایک جہت کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے جو حقیقتاً شاعری کے مافیہ سے بے تعلق ہوتی ہے۔

شعری ادب کے تراجم کے لیے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض قافیے اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہیں تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔لیکن ان پابندیوں کو نرم کرتے وقت شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی شرط کا عائد

کرنا لازمی ہے۔ اگر تراجم کی زبان، شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی اپنی صلاحیت کو بروئے کار لا سکتی ہے تو تراجم کی زبان کا ایک نیا شعری آہنگ ظاہر ہو کیوں کہ شاعری جب بھی کوئی قالب اختیار کرتی ہے تو شاعری ہی کو رونما کرتی ہے۔

انسان کے قلب و نظر کی گفتگو شاعری ہے اور اسے قلب و نظر کی گفتگو ہی میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ترجمے کے عمل کو قلب و نظر کی گفتگو بنا دینے سے اعلیٰ شعری ادب کے در و بام کھل سکتے ہیں۔

ہوتا یوں ہے کہ جب کسی مترجم کو کوئی نظم پسند آتی ہے اور وہ اس سے بہت متاثر ہوتا ہے تو اُس کا جی چاہتا ہے کہ اُس کے پڑھنے والے بھی اس نظم سے لطف اندوز ہوں۔ عام طور سے تو ترجمے کا محرک یہی جذبہ ہوتا ہے اور اس محرک جذبے کا تجزیہ یوں کیا جاتا ہے کہ مترجم کی حیثیت ایک ایسے شخص کی ہوتی ہے جو کسی نظم کو پڑھتے ہوئے کسی ایک مصنف کو تلاش کرتا ہے۔ جب وہ اس مصنف کو پا لیتا ہے تو اُس کے سہارے خود میں چھپے ہوئے مصنف کو بھی پا لیتا ہے۔ صاف اور سیدھے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ مترجم کو کوئی نظم پڑھتے ہوئے اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ جو خیالات، جذبات اور احساسات اس کے شعور اور لاشعور میں عرصے سے تھے اور جن کے اظہار کے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے، اسے کسی اور شاعر نے وہ موثر الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔ بقول غالبؔ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اگرچہ یہ دوسری زبان میں ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں ان خیالات کا اپنی زبان میں منتقل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

جب کوئی شاعر اپنا تجربہ بیان کرتا ہے تو اس تجربے میں حقیقت کے ساتھ شاعر کے اپنے احساس اور جذبے کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ پھر دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے۔ جو انسان کے احساسات اور تجربات کو مکمل طور پر الفاظ کے سانچوں میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جائے۔ بعض شاعروں کے کلام کی شرحیں لکھی جاتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شعر کی شرح میں مختلف شارحین کو آپس میں نہ صرف اختلاف ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کی شرحیں متضاد ہوتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیال و فکر کے لیے مناسب الفاظ نہیں ملے (میں یہاں اس ابہام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو جان بوجھ کے پیدا کیا جاتا ہے) ہمارے یہاں اس کی مثال غالبؔ اور تھوڑے بہت مومنؔ ہیں۔ غالبؔ کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جن میں فکر اور الفاظ ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ اس لیے جتنی کلامِ غالب کی شرحیں چھپی ہیں اتنی کسی اور شاعر کی نہیں چھپیں۔ بلکہ خود غالبؔ نے اپنے ایک خط میں نہ بیان کرتے تو آج اردو میں نہ جانے اس کا کیا مفہوم ہوتا۔ اگر شارحین کی شرح ہی میں تضاد ہو تو بے چارہ مترجم کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی تحقیقی کام نہیں کر رہا ہے جو تمام شرحوں کا ترجمہ کر کے اپنے پڑھنے والوں کو بدمزہ کرے۔ مجبوراً وہ ان شرحوں میں سے کوئی ایک انتخاب کرے گا اور اس کا پورا پورا امکان ہے کہ وہ ایک ایسی شرح سے مدد لے جو ہرگز شاعر کا مطلب نہ ہو۔ غالبؔ کا ایک سادہ سا شعر ہے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

حالیؔ نے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے..... اگر موت نہ آیا کرتی اور ابد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزا نہ آتا۔ اس کے برعکس طباطبائی نے اس شعر کی شرح یوں کی ہے۔ ''رقیب بوالہوس کو ہوس کی نشاطِ کار و لطفِ وصلِ نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا مزا کیا رہا۔

اگر حالیؔ کی علمیت اور قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، تو طباطبائی کے فہم و ادراک پر بھی شبہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان دونوں نے مترجم کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ وہ دونوں شرحوں میں سے کسے انتخاب کرے۔ بعض شعر تو ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق قطعی اور آخری فیصلہ کوئی شارح نہیں کر سکتا کہ شعر کا اصل مطلب کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کیا شاعری کی جامع اثر انگیزی اور کیف وانبساط کا نثر میں ترجمہ ممکن ہے؟
2. صوتی توازن وآہنگ اور غنائیت کس صنف کی خاصیت ہے؟
3. شاعری کے ترجمے کے لیے کیا مترجم کا موزوں طبع ہونا ضروری ہے؟
4. کس مغربی نقاد نے کہا تھا 'نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا'۔؟
5. نظم اور نثر میں کس کا ترجمہ آسان ہے؟
6. مغرب کے ممتاز مترجمین میں سے دو کے نام لکھیے۔

3.7 مترجم کی ذمّے داریاں

مترجم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس متن کا ترجمہ کر رہا ہے، اُسے ایک یا دو دفعہ شروع سے آخر تک پڑھے تا کہ متن کا سیاق وسباق اس پر پوری طرح روشن ہو جائے۔ ترجمے کے لیے محض زبان کا جاننا ضروری نہیں ہے۔

مترجم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس متن کا وہ ترجمہ کر رہا ہے وہ جس ملک میں لکھا گیا، اُس کی تاریخ وتہذیب اور جغرافیہ سے پوری واقفیت حاصل کرے۔

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اگر وہ فکشن یا شاعری کا ترجمہ کر رہا ہے تو اصل زبان کے ملک کے رسم ورواج پر اُسے پوری قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ وہ اس ملک کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

مترجم کو کسی ایسی کتاب کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے جو کسی ایسے علم سے متعلق ہو جس سے مترجم واقف نہ ہو۔

ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ مترجم کسی ایک زبان کے مصنف کے شعر یا تقریر میں بیان کیے گئے خیالات ترجمے میں اس طرح بیان کرے کہ آسانی سے پڑھنے والوں کی سمجھ میں آجائے۔

لفظی ترجمہ کبھی کبھی مضحکہ خیز اور اکثر مقامات پر ناقابلِ فہم ہو جاتا ہے، اس لیے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اصل زبان کے متن کے ترجمے کو ایسے الفاظ میں ڈھالے کہ ترجمے کا متن ترجمے کی زبان کے بنیادی میلانات کے مطابق ہو، جسے پڑھتے ہوئے قاری اجنبیت محسوس نہ کرے۔

اگر کوئی ترجمان دو ملکوں کی اہم سیاسی شخصیات کے درمیان ترجمانی کرتا ہے تو ترجمے کی معمولی غلطی کے دور رس نتائج ہو سکتے ہیں، اس لیے ان مواقع کے لیے حکومتیں کوشش کرتی ہیں کہ ایسے ترجمان کا انتخاب کریں جسے دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔ یہ احتیاط صرف زبانی ترجمانی تک محدود نہیں ہے، مذہبی، علمی، سائنسی اور ادبی تحریروں میں بھی ضروری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مترجم کو کس کتاب کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے؟
2. مترجم کو ترجمے کا کام شروع کرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟
3. مترجم کو کسی متن کا ترجمہ کرنے کے لیے کس زبان پر قدرت حاصل ہونی چاہیے؟ اُس زبان پر جس سے وہ ترجمہ کر رہا ہے یا اُس زبان پر جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے؟ یا دونوں پر قدرت حاصل ہونی چاہیے۔

3.8 مترجم کی صلاحیتیں

ترجمے کا اصل مقصد ایک زبان میں بیان کیے گئے خیالات کا دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ جس کے لیے اصل میں مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے:

1- اصل زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ترجمے کی زبان میں من وعن ادا ہو گیا ہو۔ اگر شاعری یا فکشن کا ترجمہ ہے اور مترجم نے ترجمے کی شرط سختی سے پوری نہ کی ہو تب بھی کوئی زیادہ حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر فنی اور تکنیکی کتاب ہے اور ترجمے میں غلطیاں ہو گئی ہوں تو یہ معاملہ خاصا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

2- جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، اُس کے الفاظ روزمرّہ اور زبان کے مزاج پر مترجم کو پوری قدرت حاصل ہونی ضروری ہے ورنہ مترجم سے غلطیاں سرزد ہونے کا اِمکان ہوتا ہے۔

3- جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اُس پر بھی مترجم کو پوری قدرت حاصل ہونی ضروری ہے۔

4- بعض مترجم اپنی زبان دانی کے زعم میں لغتوں کے استعمال کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بہت ضروری ہے اور مترجم کے پاس دونوں زبانوں کے مستند لغات ہوں اور اگر کسی مقام پر اسے ذرا بھی اُلجھن ہو تو وہ لغت میں ان الفاظ کا مطلب دیکھے اور پھر یہ ضروری نہیں کہ لغت میں لفظ کا جو مفہوم دیا گیا ہو وہ صد فی صد درست ہو اور اصل لفظ کے مفہوم کی مکمل نمائندگی کرتا ہو، اس لیے مترجم کو اگر ذرا بھی شبہ ہو تو اسے چاہیے کہ ایک سے زیادہ لغتیں دیکھے۔

5- یہ عین ممکن ہے کہ اصل متن میں عبارت کا کوئی حصّہ صاف نہ ہو اور مصنف کی قدرتِ بیان کی کمی کی وجہ سے اُلجھن پیدا ہو جائے اور مترجم کو یہ معلوم ہو جائے کہ متن کا کوئی حصّہ گنجلک ہے تو وہ اسے زیادہ وضاحت، سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کر دے۔ ترجمہ کرنے والے کی قابلیت اس میں ہے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے کچھ ایسے الفاظ کا اضافہ کرے، جس سے متعلقہ عبارت سُلجھ سکے اور بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔

جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے وہ اگر مترجم کی مادری زبان ہے تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان کے ہر لفظ کے مزاج سے پوری طرح واقف ہو۔ ترجمہ کرتے ہوئے بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ محض زبان پر قدرت حاصل رکھنا کافی نہیں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو زبان پر اُن کی قدرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے یہ ترجمہ عام فہم، سلیس اور آسان زبان میں کیا ہے۔ اُن کی کوشش رہی ہے کہ ترجمہ دہلی کی ٹکسالی زبان میں ہو۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں ایک دو مقام پر ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ اُنھوں نے سورہ اسرٰی کے ترجمے میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ایک رات آنحضرت کو مکّے سے مدینے کی ہجرت کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ''آنحضرتؐ راتوں رات سٹک گئے''۔ ترجمہ غلط نہیں ہے لیکن سٹک' کے لفظ سے آنحضرتؐ کے احترام میں فرق آتا ہے۔ اس لفظ کو آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی سمجھا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خلاف بڑے بڑے جلسے ہوئے، تجویزیں پاس کی گئیں اور احتجاج ہوئے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ڈپٹی نذیر احمد نے کون سا فقرہ لکھا تھا، جس سے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلتا تھا؟
2. ترجمے کا اصل مقصد کیا ہے؟
3. اگر مترجم کو کسی لفظ کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟

3.9 ترجمے کی اخلاقیات

ترجمہ علم کا ایک بہت اہم شعبہ ہے۔ جس طرح تمام علوم کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے اسی طرح ترجمے کی بھی اخلاقیات ہوتی ہے اور مترجم سے

ہماری یہ توقع غلط نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ متن کے عین مطابق ہو۔ اگر مترجم نے لاپرواہی سے کام لیا ہے اور دماغ پر زور ڈالے اور محنت کیے بغیر متن کا غلط سلط ترجمہ کر دیا ہے تو یہ مصنف اور قاری کے ساتھ سخت ناانصافی بلکہ مجرمانہ ناانصافی ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اصل متن کی زبان اتنی مشکل اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ مترجم مختلف لغات دیکھنے کے بجائے اس عبارت کو مختصر کر دیتا ہے یا حذف کر دیتا ہے۔ یہ امر یقیناً غیر اخلاقی ہے۔

اس سے زیادہ غیر اخلاقی بات یہ ہے کہ اگر اصل متن میں مترجم کے عقیدے کے خلاف کچھ ہوتا ہے تو وہ اس عبارت کو حذف کر دیتا ہے یا اپنے عقیدے کے مطابق بدل دیتا ہے۔ ایسی بھی کئی مثالیں ہیں کہ مترجم نے اپنے عقائد کو ترجمے میں اس طرح داخل کر دیا ہے کہ یہ ہرگز پتا نہیں چلتا کہ وہ مصنف کے نہیں خود مترجم کے اپنے خیالات ہیں۔

غرض یہ کہ ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کی بہت اخلاقی ذمے داری ہوتی ہے۔ اسے قدم قدم پر یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ وہی ہونا چاہیے جو منشائے مصنف ہے۔

اسے یہ خیال بھی ہونا چاہیے کہ مترجم کو اصل متن میں ترمیم، حذف اور اضافے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر اسے مصنف سے کسی معاملے میں اختلاف ہے یا مصنف نے جو کچھ کہا ہے، اس میں وہ اضافہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق ہے لیکن اس طرح کہ وہ کتاب کے حواشی میں اپنے خیالات کا اظہار کر دے تاکہ قاری مصنف اور مترجم کے خیالات میں فرق کر سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمہ کس کے عین مطابق ہو؟
2. مترجم کو اصل متن میں کن چیزوں کی اجازت نہیں ہے؟

3.10 خلاصہ

ترجمے کے فن کی ابتدا ہزاروں سال پہلے اُس وقت ہوئی تھی، جب انسان نے اپنے تجسس کے باعث اپنے پڑوس اور دور دراز کے ملکوں کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں سے گفتگو کا ذریعہ یقیناً کوئی نہ کوئی ترجمان ہوتا رہا ہوگا یعنی وہ شخص جو ایک شخص کی بات سنتا رہا ہوگا اور وہ بات دوسرے شخص کو اس کی زبان میں بتا دیتا رہا ہوگا۔ اس شخص کو ہم ترجمان کہتے ہیں۔ یہ دونوں گفتگو کرنے والے لوگوں کی زبان سے واقف ہوتا ہے۔

ترجمے کے میدان میں ہمارے بزرگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ علم جسے انسانیت کا عظیم ورثہ کہا جاتا ہے، وہ ترجموں کے ذریعے ہی ہم تک پہنچا ہے۔ قدیم زبانوں مثلاً یونانی، سنسکرت، عربی، سریانی، پارسی، لاطینی اور انگریزی سے براہِ راست استفادہ کرنے والے گنتی ہی کے اسکالر ہوتے ہیں۔ انسانیت کا یہ بیش بہا علمی سرمایہ ترجموں کے ذریعے ہی پوری دنیا تک پہنچا ہے۔

لفظوں اور اصطلاحوں کے معقول انتخاب کا مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ معاشرے کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اس معاشرے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے، اس کے اقدار ہوتے ہیں، علاقائی اور جغرافیائی تقاضے ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی مذکورہ پہلو اس معاشرے کی زبان و بیان اور اس کا لہجہ طے کرتے ہیں۔

ترجموں کے دوران اصطلاحوں کا مسئلہ آتا ہے۔ اس کے حل کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ موضوع مخصوص کے ماہرین اور دونوں زبانوں کے ماہرین کی کمیٹی بنائی جانی چاہیے۔ وضع اصطلاحات میں یکسانیت رہے اس کے لیے کسی قومی ادارے کو یہ ذمے داری دی جانی چاہیے تاکہ لوگ اسے تسلیم کریں۔ اچھے مترجمین کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر عبور حاصل کریں اور متعلقہ موضوع کے رموز سے کماحقہ واقفیت رکھیں۔ تبھی جا کر کہیں وہ اچھے ترجمے کر پائیں گے۔

ترجمے کے دوران مترجم کو دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا سفر کرنا پڑتا ہے اور یہ اکادمک سفر کافی مشکل ہوتا ہے کیوں کہ دونوں کے درمیان، باریک

فرق ہوتا ہے جسے ملحوظ رکھے بغیر اچھا ترجمہ معروض موجود میں نہیں آ سکتا۔ اچھا ترجمہ رواں، بامحاورہ اور سلیس ہوتا ہے تاہم معنی کے دامن سے کنارہ کشی کیے بغیر ہی یہ خاصیت لائق تحسین ہے۔ ترجمے میں اگر کچھ اجنبیت کا شائبہ ملتا ہے تو واجبی بات ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک علاحدہ لسانی نظام ہوتا ہے اور اس سے ترجمے کی زبان متمول ہوتی ہے۔

اردو میں انگریزی اردو لغات کا حال بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ لہٰذا بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انگریزی اردو لغت میں چند معلوماتی ضمیمے ضرور شامل کیے جائیں۔ مثلاً شخصیتوں کے ناموں پر مبنی ایک ضمیمہ ہونا چاہیے۔ مقامات پر مبنی ایک ضمیمہ ہونا چاہیے۔ مخففات اور مختصرات پر مبنی ضمیمہ بھی ہونا چاہیے۔ نیز تلمیحات پر مبنی ضمیمہ بھی شامل ہونا چاہیے۔

اپنی زبان کو سائنسی علوم و معلومات سے مالا مال کرنے کی ضرورت ہے۔ سائنسی علوم کے ترجمے میں سب سے بڑا مسئلہ وضع اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ اردو میں سائنسی علوم کی منتقلی کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اقوام کے درمیان لین دین اور افہام و تفہیم محض معاشی و سیاسی سطح پر نہیں ہوتی بلکہ فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے۔ افسانوی ادب کے ترجمے کے دوران صرف دو تہذیبیں ہی ایک دوسرے سے باہم دگر نہیں ہوتیں بلکہ دو نثری روایتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔

شاعری کا ترجمہ شاعری میں نہایت مشکل کام ہے۔ تاہم تمام مشکلات کے باوجود شاعری کا ترجمہ شاعری میں ہونا چاہیے۔ ورنہ شاعری سے مخصوص جامعیت کے ساتھ اثر انگیزی اور کیف و انبساط پیدا کرنے کی خاصیت شاعری کے نثری ترجمے میں جاتی رہے گی کیوں کہ نثری ترجمہ اصل شعری متن کے مزاج کے ساتھ غالباً انصاف نہیں کرتا۔ شعری ادب کے تراجم کے لیے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے جو عروض، قافیے اور اضافتوں کی سکہ بند زبان سے تعلق رکھتی ہے تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان پابندیوں کو نرم کرتے وقت شاعری کو شاعری میں منتقل کرنے کی شرط کا عائد کرنا لازمی ہے۔

ترجمے کا اصل مقصد ایک زبان میں بیان کیے گئے خیالات کو دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے۔ اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اصل زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ترجمے کی زبان میں من و عن ادا کر دیا جائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظی ترجمہ کیا جائے یا آزاد۔ اس کا انحصار دراصل اُس متن پر ہے جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ بیشتر متن ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کا لفظی ترجمہ ممکن ہوتا ہے لیکن بعض کا ممکن نہیں۔ جس کا ممکن نہیں ہوتا اُس میں مترجم کو تھوڑی سی آزادی لینی ہوتی ہے یعنی وہ اصل مفہوم کی **ادائگی** کے لیے الفاظ گھٹا بڑھا سکتا ہے اور کبھی کبھی مصنف کے خیالات کو اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہے، اسے آزاد ترجمہ کہا جاتا ہے۔

ترجمے کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے یعنی مترجم کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ وہ مصنف کے خیالات میں کوئی تبدیلی کرے یا متن میں اپنے عقیدوں کو داخل کر دے۔ نثر کا ترجمہ آسان ہوتا ہے جب کہ شاعری کا ترجمہ نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ انگریزی کے ایک بہت بڑے نقاد ڈاکٹر جانسن نے شاعری کے ترجمے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' ڈاکٹر ہیوگو نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔''

3.11 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. تراجم کے عمومی مسائل پر تفصیل سے لکھیے۔
2. سائنسی علوم کے تراجم کے مسائل سے بحث کیجیے۔
3. سماجی علوم کے تراجم کے مسائل پر روشنی ڈالیے۔

4. افسانوی ادب کے تراجم کے مسائل پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کا فن کیوں اور کس طرح وجود میں آیا؟
2. شعری ادب کے تراجم کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔
3. مترجم میں کن صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے؟
4. ترجمے کی اخلاقیات سے بحث کیجیے۔

3.12 فرہنگ

فقرہ = عبارت کا ٹکڑا' کلام' جملہ' ریڑھ کی ہڈی

محاورہ = باہمی گفتگو' اصطلاحاً وہ کلام جسے اہل زبان نے لغوی معنی کی مناسبت یا غیر مناسبت سے کسی خاص مفہوم کے لیے مخصوص کر لیا ہو

آمد = آنا' تشریف لانا' خیال آنا' بلا تکلف مضمون ذہن میں آنا

آورد = تکلف اور بناوٹ' تکلف سے شعر کہنا' کوشش سے بات پیدا کرنا

عرق ریزی = سخت محنت

نشاۃ الثانیہ = کسی قوم یا ملک کا از سر نو ترقی کرنا

مرکبات = دو لفظوں کو ملا کر الفاظ بنانا

بندشیں = ترتیب الفاظ' عبارت کی ترکیب' الفاظ کا ربط' گرہ' بندھن

قالب = ڈھانچا

تعبیر = خواب کا نتیجہ نکالنا' بیان کرنا

براہین = دلائل

مضمر = پوشیدہ' مخفی

امتزاج = ملاوٹ' آمیزش' ہم آہنگی

منطبق = برابر' موافق' اوپر تلے ٹھیک آنے والا

پیکر = چہرہ' شکل صورت

محاکات = باہمی بات چیت' باہمی داستان گوئی' ایک دوسرے سے مشابہ ہونا

عروض = وہ علم جس سے نظم کے قواعد معلوم ہوتے ہیں

3.13 سفارش کردہ کتابیں

1. عطش درّانی — اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1994ء
2. اعجاز راہی — روداد سمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، 1994ء
3. محمد صدیق خاں — شبلی، سرکاری خط و کتابت، سرکاری مراسلات، اسلام آباد، اگست 1987ء
4. خلیق انجم، — فنِ ترجمہ نگاری، دہلی، 1995ء
5. محمد صدیق خاں شبلی — سرکاری خط و کتابت (جلد پنجم) غیر رسمی کیفیات، (طبع دوم)، اسلام آباد، نومبر 1991ء
6. ابو سلمان شاہجہاں پوری — اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1984ء
7. قریشی، نثار احمد — ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد، ستمبر 1985ء
8. سید مصطفیٰ کمال — حیدر آباد میں اردو کی ترقی [تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے]، حیدر آباد، دسمبر 1990ء
9. قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت، دہلی، جون 1976ء

اکائی 4 : ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات

ساخت

4.1 تمہید

4.2 ترجمے کے تقاضے

4.3 ترجمے کے عمومی تقاضے

4.3.1 اصل زبان میں مہارت

4.3.2 ترجمے کی زبان میں مہارت

4.3.3 اصل زبان کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت

4.4 ترجمے کے موضوعاتی تقاضے

4.4.1 علمی تراجم کے تقاضے

4.4.2 ادبی تراجم کے تقاضے

4.4.3 مذہبی تراجم کے تقاضے

4.4.4 قانونی تراجم کے تقاضے

4.4.5 صحافتی تراجم کے تقاضے

4.5 مترجم کی خصوصیات

4.6 خلاصہ

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

4.8 سفارش کردہ کتابیں

4.1 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے یہ معلومات حاصل کی کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں خیال، فہم، احساس، جذبے اور علم کو منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ ترجمے کی مدد سے دوسری زبانوں کے ادب اور دوسری قوموں کے فکری رجحانات سے آشنائی ہوتی ہے۔ علم کی وسعت، سائنسی ایجادات اور علمی تحقیقات کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے اہم کردار انجام دیا ہے۔ اسی لیے بجا طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم وفنون کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں دوسری زبانوں سے ترجمے نہ کیے گئے ہوں۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، طب، مذہب، سائنس اور دیگر بے شمار علوم کے ترجمے مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو زبان میں بھی ترجمے کی روایت نہایت قدیم ہے۔ اردو میں پہلے پہل عربی اور فارسی سے ترجمے ہوئے۔ بعد کے دور میں مغربی زبانوں بالخصوص انگریزی کی بے شمار کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

موجودہ زمانے میں ترجمے کو تخلیق کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ترجمے کو بازتخلیق (Recreation) بھی کہا جاتا ہے۔ گویا یہ بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ ترجمہ محض ایک زبان کے الفاظ کی جگہ دوسری زبان کے الفاظ رکھ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک زبان کے مطالب و خیالات کو ترتیب و تنظیم کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم اس میں اصل کی بہت سی خوبیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

ترجمہ اپنی جگہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے نئے الفاظ، نئی اصطلاحیں، نئے محاورے اور کہاوتیں اختراع کی جاتی ہیں۔ ایسا ترجمہ تخلیق کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسری طرف کسی متن کو اس کے حقیقی معنی و مفہوم اور مکمل سیاق و سباق کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کر دیا جائے تو ایسا ترجمہ کرافٹ کا کام کرتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا ترجمہ آرٹ اور کرافٹ کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل بھی ہے اور ہنرمندی بھی۔ ترجمے کو جب فن کہا جاتا ہے تو ہر فن کی طرح اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں جن کی تکمیل کے بغیر ترجمے میں حسن و خوبی اور فنی کمال پیدا نہیں ہوتا۔ اس اکائی میں ترجمے کے تقاضوں اور مترجم کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

4.2 ترجمے کے تقاضے

ترجمے کے تقاضوں پر گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل اس بات کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ کسی بھی فن کے تقاضے اس کے اصولوں کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں۔ یعنی ہم کسی فن مثلاً شاعری کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر یہ طے کر سکتے ہیں کہ شاعری کے کیا تقاضے ہیں یا مصوری کے اصولوں کی روشنی میں مصوری کے تقاضوں کا تعین کیا جاسکتا ہے لیکن جب ہم ترجمے کے تقاضوں پر غور کرتے ہیں تو ہمیں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمے کے کوئی عالمی اصول متعین نہیں ہیں۔ یہ بات نہایت حیرت ناک ہے کہ دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمے کا عمل انجام دیا جارہا ہے لیکن اس کے باوجود ترجمے کے ایسے اصول وضع نہیں کیے جاسکے جن پر سب کا اتفاق ہو۔ تھیوڈر ساوری نے اپنے مضمون ''آزاد اور لفظی ترجمہ'' میں ترجمے کے متعلق ماہرین فن کے خیالات و نظریات کے اختلافات کی دلچسپ صورت حاصل پیش کی ہے۔ وہ رقم طراز ہے :

> ''یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ ترجمے کے کوئی عالمی اصول تسلیم نہیں کیے گئے ہیں کیوں کہ ان اصولوں کی تشکیل کرنے والے حضرات خود آپس میں کبھی متفق نہیں ہو سکے اور ان کے خیالات میں بے انتہا مغائرت ہے، انہوں نے جو کچھ بھی ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ متشر خیالات کا ایک ایسا ابتر مجموعہ ہے جس کی ہمیں ادب کے دوسرے شعبوں میں مثال نہیں ملتی۔''

آگے اُس نے ترجمے کے بارے میں مختلف ماہرین کی متناقض آرا پیش کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. ترجمے میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہیے۔
2. ترجمہ اصل متن کے معانی و مفاہیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔
3. ترجمہ اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
4. ترجمے کو ترجمے ہی کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
5. ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہیے۔
6. ترجمے کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہیے۔
7. ترجمہ اصل متن کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔
8. ترجمے کو مترجم کے ہم عصر کی طرح پڑھا جانا چاہیے۔

9. ترجمے میں اصل تصنیف سے حذف واضافہ کیا جاسکتا ہے۔
10. ترجمے میں اصل متن سے حذف واضافہ کبھی ممکن نہیں۔
11. نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔
12. نظم کا ترجمہ نظم میں ہونا چاہیے۔"

(تھیوڈ ساوری، مضمون 'آزاد اور لفظی ترجمہ' مترجمہ آصفہ جمیل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت۔ مرتبہ قمر رئیس۔ ص 166)

ترجمے کی ماہیت، مقصد اور تکنیک کے متعلق ماہرین کے مندرجہ بالا خیالات فنِ ترجمہ کے ایسے اصول پیش کرتے ہیں، جن میں ہر پہلا اصول دوسرے اصول کی نفی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان متخالف اور متناقض اصولوں کی روشنی میں ترجمے کے تقاضوں یا مترجم کی خصوصیات کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ تاہم اس اکائی میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اختلافِ نقاطِ نظر کی موجودگی میں کسی ایک نقطۂ نظر کو قبول کرنے اور دوسرے کو مکمل طور پر رد کرنے کے بجائے دونوں مکاتبِ فکر کے مفید اصولوں کو لیتے ہوئے بین بین چلا جائے تاکہ ترجمے کے تقاضوں اور مترجم کی خصوصیات کے بارے میں بنیادی امور کا ایک واضح خاکہ ہمارے ذہنوں میں موجود رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. عام طور پر کسی فن کے تقاضوں کا تعین کس طرح کیا جاتا ہے؟
2. کیا عالمی پیمانے پر فنِ ترجمہ کے مسلمہ اصول موجود ہیں؟
3. فنِ ترجمہ کے تقاضوں کے تعین میں دشواری کیوں پیش آتی ہے؟

4.3 ترجمے کے عمومی تقاضے

ترجمے کے عمل میں زیرِ ترجمہ مواد کی نوعیت کے لحاظ سے ترجمے کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ادبی تراجم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں اور علمی تراجم کے تقاضے کچھ اور۔ لہٰذا دونوں کے تقاضوں پر الگ الگ گفتگو کرنا ضروری ہے۔ لیکن پہلے کچھ ایسے تقاضوں پر روشنی ڈالی جائے گی جو ہر طرح کے تراجم میں مشترک ہیں۔

4.3.1 اصل زبان میں مہارت

ہر نوعیت کے ترجمے کا اولین تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ مترجم کو زیرِ ترجمہ متن کی زبان جسے اصطلاحاً اصل زبان (Source Language) کہا جاتا ہے اور ترجمے کی زبان جو (Target Language) کہلاتی ہے، دونوں میں مہارت حاصل ہو۔ دونوں زبانوں کی واقفیت کے بغیر ترجمے کا کام انجام نہیں پاسکتا۔ مترجم کو اصل زبان کی قواعد، اس کے محاوروں اور ضرب الامثال، صنائع و بدائع اور تاریخی و تہذیبی پس منظر سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں ظ۔ انصاری لکھتے ہیں :

"جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس زبان کی لغت سے، اصطلاحات اور محاوروں سے، کسی قدر ادبیات سے اور تھوڑی بہت تاریخ سے واقفیت اور نکھرا ہوا ذوق ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس زبان کی تصنیف کا ترجمہ کرنا ہے اس زبان پر بھی ترجمہ کرنے والے کو ماہرانہ عبور حاصل ہو، یا وہ اصل عبارت یا اصل تصنیف والی زبان میں خود بھی اسی طرح بے تکلف اور بے تکان لکھ سکتا یا بول سکتا ہو۔ بلکہ اس زبان کا صرف کتابی علم کافی ہے۔ اگر کتابی علم بھی نہ ہوا تو خیال کی نزاکتیں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ اصل عبارت کی نوک پلک پر ترجمہ کرنے والے کا دھیان نہیں جائے گا اور وہ اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی طرف سے غافل رہے گا۔"

آگے وہ لکھتے ہیں کہ

''مترجم کو اصل زبان کا علم کم از کم اتنا ضرور ہو کہ وہ اصل عبارت کے سیاق وسباق کو سمجھ سکے یا پا سکے کہ فلاں قسم کا لفظ نظر انداز کر کے فلاں لفظ مصنف نے خاص اس مقصد سے رکھا ہے یہ مقصد اگر سمجھ میں آ جاتا ہے تو ترجمہ کرتے وقت اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس مقصد کو کسی ہم پلہ لفظ سے پورا کیا جا سکے ورنہ نہیں۔''

(ظ۔انصاری مضمون۔ترجمے کے بنیادی مسائل۔مشمولہ ترجمہ: روایت اور فن ص۔114)

اصل زبان سے سرسری واقفیت کے باوجود کامیاب ترجمے کی سب سے عمدہ مثال ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ ''تعزیرات ہند'' ہے۔مولوی نذیر احمد انگریزی میں شدھ بدھ رکھتے تھے لیکن ترجمہ کرنے کا انہیں خاص ملکہ تھا وجہ یہ تھی کہ وہ کئی زبانوں جیسے عربی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے۔اگر ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوتا تو دوسری زبان کا لفظ وہاں رکھ دیتے۔ان کے ترجمے کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے لیکن وہ لفظ ایسا ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔انہوں نے تعزیرات ہند (Indian Penal Code) کے ترجمے میں بھی لفظ پر وہی لفظ بٹھایا ہے جو معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔کمال یہ ہے کہ یہ شاندار کارنامہ انہوں نے سوا روپے کی رائل ڈکشنری کی مدد سے انجام دیا۔(بحوالہ مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی : کچھ میری کچھ ان کی زبانی، مرتبہ رشید حسن خاں، ص 60) لیکن مولوی نذیر احمد کی مثال سے قطع نظر ہمیں یہ مان کر چلنا ہوگا کہ مترجم کو اصل تصنیف یا اصل عبارت کی زبان کا علم جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی اس کے ترجمے میں عمدگی پیدا ہوگی۔

4.3.2 ترجمے کی زبان میں مہارت

ترجمے کے تقاضوں میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے کی زبان میں مہارتِ تام اور دستگاہِ کامل حاصل ہونی چاہیے بلکہ اُسے اصل زبان سے زیادہ ترجمے کی زبان پر قدرت وعبور ہونا چاہیے یہاں تک کہ اسے ترجمے کی زبان میں خود لکھنے کی پختہ مشق ہونی چاہیے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ مترجم کو اپنی زبان میں محسوس کرنے اور سوچنے پر قدرت ہونی چاہیے۔(بحوالہ شمس الرحمٰن فاروق، مضمون، دریافت اور بازیافت، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم۔ص 133)۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ مترجم کو خود بھی اپنی زبان کا مصنف، ادیب یا شاعر ہونا چاہیے۔لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔البتہ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ غیر۔ ادیب یا شاعر مترجم کے مقابلے میں ادیب یا شاعر مترجم کا ترجمہ اعلیٰ ہوگا۔اردو میں مولانا ظفر علی خاں، نظم طباطبائی اور محمد حسن عسکری کے ترجمے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔چوں کہ ادیب یا شاعر اپنی زبان پر حد درجہ عبور رکھتا ہے اور اپنی زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کا رمز شناس ہوتا ہے۔اس لیے قدرتی طور پر اس کا ترجمہ بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔لیکن عملاً یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اچھے شاعروں کے شعری ترجمے ناقص ثابت ہوئے۔جیسے پوپ انگریزی کا بڑا شاعر ہے لیکن اس نے ہومر کی الیڈ کا جو ترجمہ کیا اس پر کافی اعتراضات ہوئے۔اس کے برخلاف میکس ہیورڈ Max Hayward شاعر یا افسانہ نگار نہیں تھا لیکن اس نے روسی شاعری اور افسانوں کے بہترین تراجم پیش کیے۔اردو میں مولوی عنایت اللہ دہلوی سب سے کثیر التراجم مترجم گزرے ہیں لیکن وہ نہ شاعر تھے نہ ڈرامہ نگار۔

بہر حال مترجم کا بذات خود مصنف یا تخلیقی فن کار ہونا ترجمے کا اصل تقاضہ نہیں ہے۔اصل تقاضہ یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے کی زبان کی گہری آگہی ہو۔اُسے اپنی زبان کے الفاظ کے ماخذ اور سرچشموں کا علم ہو۔ان کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے واقفیت ہو۔روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کی اصلیت اور ان کے محلِ استعمال سے باخبر ہو اور سیاق وسباق کے اعتبار سے لفظ کے معنی میں ہونے والے بدلاؤ کا درک رکھتا ہو۔اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کے قدیم وجدید ادب پر نظر رکھے تاکہ وہ ترجمے کی زبان کے متنوع اسالیب سے واقف ہو اور اصل زبان کے اسلوب کے لیے ترجمے کی زبان میں مناسب متبادل اسلوب تلاش کر سکے۔اپنی زبان کے مختلف اسالیب سے واقفیت مترجم کے لیے کس طرح مددگار ثابت ہو سکتی ہے اس کی ایک اچھی مثال محمد حسن عسکری کا میلول کے ناول ''موبی ڈک'' کا ترجمہ ہے۔اصل ناول میں بے شمار اسالیب گھلے ملے ہیں۔عسکری نے بھی اپنے ترجمے میں اردو کے اتنے اسالیب گھلا ملا دیئے ہیں کہ ترجمہ اصل کے تاثر کی ہو بہو ترسیل کرتا ہے۔یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ محمد حسن عسکری اردو کے مختلف نثری اسالیب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

4.3.3 اصل زبان کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت

زبان اور تہذیب میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کسی زبان میں پیش کیے گئے متن کو سمجھنے کے لیے نہ صرف زبان سے واقفیت ضروری ہے بلکہ زبان کی تہذیب کا علم بھی ضروری ہے۔ ترجمہ دراصل کسی متن کو ایک تہذیبی فریم سے نکال کر دوسرے تہذیبی فریم میں پیش کرنے کا عمل ہے۔ اس میں ایک تہذیب کے تصورات کو دوسری تہذیب کے پیکر میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ مترجم کا کام ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا نہیں بلکہ ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں منتقل کرنا ہے۔ کوئی خاص لفظ اپنے تہذیبی پس منظر میں ایک منشور کی طرح ہوتا ہے جس سے تصورات کے کئی رنگ پھوٹتے ہیں لیکن دوسری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ اپنے تہذیبی سیاق میں تصورات کی اس ست رنگی چھوٹ سے عاری ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمے میں مکھی پہ مکھی بٹھانے سے کام نہیں چلتا۔ مترجم کو اصل متن کے تہذیبی تصورات کی ترجمے کی زبان میں باز آبادکاری کرنی پڑتی ہے۔ اسکے لیے مصنف کو زبان کے تہذیبی عناصر اور اس کے تہذیبی رچاؤ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس اہم نکتے سے عدم واقفیت کے سبب ہمارے بعض مترجمین خصوصاً ابتدائی دور کے مترجمین نے غیر ملکی ماحول میں مقامی ماحول کو شامل کر دیا۔ چنانچہ ابتدا میں ہمارے ہاں جارج ولیم۔ ایم۔ اور رینالڈز کے جن ناولوں کے ترجمے ہوئے ان میں قارئین کی دلچسپی یا سہولت کے پیش نظر ہمارے مترجمین نے مرزا حامد بیگ کے بقول :

> ''لندن کے بازاروں میں جمن حلوائی اور لکھنؤ کے بانکوں کو جدی پشتی وہاں کا ثابت کر دیا۔ کرداروں کے نام اور جگہوں کے آثار تو تبدیل ہوئے ہی ان کے عادات و خصائل تک بدل گئے۔'' (مرزا حامد بیگ 'اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ' مشمولہ 'روداد سیمنار' اردو زبان میں ترجمے کے مسائل' مرتبہ اعجاز راہی۔ ص 81)

ظاہر ہے کہ اسی طرح کے تراجم پر ''خیانتِ مترجمانہ'' کا جرم عائد کیا جا سکتا ہے کیوں کہ مترجم کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی متن کے تہذیبی سیاق کو بدل ڈالے۔

سطور بالا میں ہم نے ترجمے کے کچھ خصوصی تقاضوں کا مطالعہ کیا۔ آج کل ترجمے سے ایک اور تقاضہ یہ بھی کیا جا رہا ہے کہ ترجمہ اصل زبان کے اسالیب اور طرزِ احساس کو ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرے کہ ترجمے کی زبان اس سے متاثر ہو۔ ایک زمانے میں ترجمے کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بالکل اصل معلوم ہو۔ لیکن موجودہ زمانے میں اسے ترجمے کی خوبی نہیں بلکہ خامی تصور کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کسی متن کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس میں وہ روانی ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جو خود اپنی زبان میں براہ راست لکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور جب ترجمے میں وہ روانی پیدا نہیں ہو سکتی تو کیسے معلوم ہوگا کہ ترجمہ اصل تخلیق ہے؟ مترجم کا فرض ہے کہ وہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کا خیال رکھے۔ اصل لفظ کی جگہ محض ہم معنی یا قریب المعنی لفظ رکھنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ضرورت پڑنے پر نئے مرکب بنائے۔ نئی بندشیں تراشے اور نئے الفاظ وضع کرے۔ ایسے ترجمے سے حقیقت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جو سلاست و روانی تو پیدا کر دے لیکن مصنف کی روح' اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کر دے اور ساتھ ساتھ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو اس کے مزاج کو اسی طرح روایتی روش اور اظہار بیان پر قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے' اسلوب کے نئے امکان یا بیان کے نئے تجربے کی کوشش نہ کرے۔ ایذرا پاونڈ نے اس قسم کے ترجمے کو ادب کے لیے سب سے کارآمد قرار دیا ہے جو اپنی زبان میں ایک ایسا طاقتور اسلوب پیدا کر دے جس کا اثر نہایت دور رس ہو۔ اردو کے مشہور نقاد محمد حسن عسکری بھی اچھا ترجمہ اس کو سمجھتے ہیں :

> جس میں چاہے اصل کتاب کی روح برقرار نہ رہے لیکن اس کے ذریعے جس بدولت تخلیقی جذبہ ملے اور جن کے ذریعے زبان کے اسالیب میں اضافہ یا تغیر واقع ہو۔ (محمد حسن عسکری۔ مضمون' گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے' مشمولہ ترجمہ : روایت اور فن۔ ص 145)

ترجمے کے عمومی تقاضوں پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم ترجمے کے موضوعاتی تقاضوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے عمومی تقاضوں سے کیا مراد ہے؟
2. اصل زبان میں مہارت کیوں ضروری ہے؟
3. ترجمے کی زبان پر عبور کیوں ہونا چاہیے؟
4. ترجمے میں تہذیبی پس منظر کی کیا اہمیت ہے؟

4.4 ترجمے کے موضوعاتی تقاضے

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے کہ ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور اس کے تقاضے مخصوص اور متنوع ہیں۔ دنیا میں علوم وفنون کی بے شمار قسمیں ہیں جیسے شعروادب، سائنس، سماجی علوم اور مذہب وقانون وغیرہ۔ ذیل میں کچھ اہم علوم کے ترجمے کے مخصوص تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

4.4.1 علمی تراجم کے تقاضے

علمی تراجم میں تمام سائنسی اور عمرانی علوم جیسے تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، معاشیات، حیوانیات، نباتیات، طبیعیات، کیمیا، انجینئرنگ اور دیگر ٹکنالوجی کے علوم شامل ہیں۔ علمی تراجم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ غیر تخلیقی ہوں۔ ان میں معلومات کی ترسیل اور نفس مضمون کے ابلاغ اور صحت مفہوم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ علمی تراجم میں اصل مسئلہ مواد کی منتقلی کا ہے اسلوب کا نہیں۔ اس لیے علمی تراجم میں اصل تصنیف کے خیال اور مفہوم کا صحیح ادراک اور اس کی ٹھیک ٹھیک ترسیل ضروری ہے۔ خیال کے ساتھ قوت استدلال کا اظہار لازمی ہے۔ طبیعی اور عمرانی علوم میں جذبہ واحساس کی بجائے معلومات وافکار اور تجزیے کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لیے اصطلاحات کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ علمی تراجم کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ حتی الامکان اصل تصنیف کی اصطلاحات کا متبادل ترجمے کی زبان میں بھی وضع کیا جائے۔ ناگزیر صورتوں میں اصطلاح کے ترجمے کے بجائے اصل اصطلاح جوں کی توں قبول کی جاسکتی ہے۔

4.4.2 ادبی تراجم کے تقاضے

ادبی تراجم کو وسیع پیمانے پر دو حصوں یعنی منثور اور منظوم ترجمے میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ منثور یعنی نثری تراجم میں مصنف کے خیال کے علاوہ جذبات، احساسات، کیفیات، تاثرات اور اسلوب وغیرہ سبھی لوازمات کو ترجمے میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ ادبی تراجم میں فنی محاسن اور جمالیاتی قدروں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جمالیاتی انبساط ایک پیچیدہ عمل ہے اس کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کوئی میکانکی فعل نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح سے بازتخلیق ہے۔ ادبی تراجم کا ایک اہم شعبہ منظوم ترجمہ کا ہے۔ منظوم ترجمے کا تقاضہ یہ ہے کہ اصل متن کے مرکزی خیال کے ساتھ ساتھ اصل کے آہنگ، موسیقی، فضا اور صوتی اثرات کی بھی ترسیل کرے۔ منظوم ترجمے کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ منظوم ترجمہ زبان کی دلکشی، صنائع وبدائع کے حسن، جمالیاتی کیفیت اور شعریت کے اوصاف سے متصف ہو۔

4.4.3 مذہبی تراجم کے تقاضے

مذہبی کتب تقدس کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں لفظ قطعی اور مستقل اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لیے ان کے ترجمے میں لفظ یا ترکیب کے مطابق لفظ اور ترکیب کا ہونا ضروری ہے۔ مقدس کتابوں میں جو شان اور شکوہ وجلال ہوتا ہے ان کی ترسیل کے لیے ترجمے کی زبان میں بھی پرشکوہ اور عالی شان الفاظ و محاورات برتنے چاہئیں تاکہ اصل کے تقدس اور کیفیت کی بازآفرینی ہو۔

4.4.4 قانونی تراجم کے تقاضے

قانونی تراجم میں خصوصی احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ قانون کی زبان نہایت جامع اور محتاط ہوتی ہے۔ اس میں ایک لفظ کے اِدھر اُدھر ہونے سے مفہوم میں فرق آجاتا ہے۔ اس لیے قانونی تراجم کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ وہ اصل کے وفادار رہیں۔ ان ترجموں کی زبان میں صحت اور قطعیت کا ہونا ضروری ہے۔

4.4.5 صحافتی تراجم کے تقاضے

صحافتی مواد چوں کہ عوام الناس کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کے تقاضے ادبی یا علمی تراجم سے مختلف ہوتے ہیں۔ صحافتی تراجم کو سادہ اور عام فہم ہونا چاہیے۔ صحافتی تراجم میں طویل، پیچیدہ اور مرکب جملے نہ ہوں۔ ترجمے میں عام بول چال کی زبان استعمال کی جائے۔ جملے مختصر ہوں اور کفایت لفظی کے ساتھ ابلاغ و ترسیل کا فعل انجام دیتے ہوں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے موضوعاتی تقاضوں سے کیا مراد ہے؟
2. علمی تراجم کے اہم تقاضے کیا ہیں؟
3. صحافتی ترجمہ کیسا ہونا چاہیے؟

4.5 مترجم کی خصوصیات

ترجمہ ایک صبر آزما اور دقت طلب کام ہے۔ اس میں مہارت اور کمال پیدا کرنے کے لیے مترجم کو کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ایک اچھے مترجم کی خوبیوں اور خصوصیات کے بارے میں مختلف ماہرین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس طرح ترجمے کی مختلف اقسام کے ساتھ اس کے تقاضے بھی بدلتے جاتے ہیں اسی طرح مختلف علوم، مختلف موضوعات اور مختلف اصناف میں ترجمے کا کام انجام دینے والوں کی خصوصیات بھی الگ الگ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب مترجم میں پائی جانے والی خصوصیات کے بارے میں مختلف ماہرین کے خیالات درج ذیل خصوصیات ہیں :

شاہ پرتگال کنگ ڈیوراٹ (1391-1438) نے ''دی لائل کونسلر'' نامی کتاب میں مترجم کی پانچ خصوصیات بیان کی ہیں :

1. مترجم، اصل متن کے معانی کو سمجھے اور ترجمے میں انہیں کسی تبدیلی کے بغیر بہ تمام و کمال منتقل کرے۔
2. مترجم، ترجمے میں ترجمے کی زبان کا روزمرہ اور محاورہ استعمال کرے۔ اصل متن کی زبان سے مستعار نہ لے۔
3. مترجم، ترجمے کی زبان میں ایسے الفاظ استعمال کرے جو اصل زبان کے الفاظ کے راست اور مناسب متبادل ہوں۔
4. مترجم، درشت اور ناپسندیدہ الفاظ سے گریز کرے۔
5. مترجم، ان تمام اصولوں کی پابندی کرے جو عبارت نگاری کا لازمہ ہیں یعنی اس کی تحریر واضح، قابل فہم اور مفید ہو۔

اسی طرح (Etienne Dolet 1509-1546) اپنی کتاب "The best way translating from one language to another" میں لکھتا ہے کہ مترجم کو چاہیے کہ :

1. اصل معنی کو سمجھے۔
2. اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور رکھے۔
3. لفظی ترجمے سے گریز کرے۔
4. ترجمے میں بامحاورہ زبان استعمال کرے۔
5. الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں احتیاط برتتے ہوئے جملوں میں مناسب آہنگ پیدا کرے۔

مذکور ماہرین فنِ ترجمہ نے مترجم کی جو خصوصیات بیان کی ہیں اُن میں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ظاہر ہے آج کے

بدلے ہوئے تقاضوں میں ان کے خیالات سے صد فیصد اتفاق کرنا مشکل ہے' تاہم ان کی بیان کی ہوئی کئی باتیں آج بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

مذکورہ خصوصیات سے قطع نظر مترجم کو ترجمے کا ذوق وشوق بھی ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اسے ترجمے کے کام سے فطری مناسبت ہو۔ اگر کسی کو ترجمے سے فطری مناسبت نہ ہو تو وہ ترجمے کا کام ٹھیک ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا۔ فطری مناسبت کی بدولت مترجم ترجمے کا کام شوق وانہماک سے کرے گا اور اس کا ترجمہ اعلیٰ درجے کا ہوگا۔

لغات بالخصوص ذولسانی لغات مترجمین کے لیے مطالعے کے اہم ترین وسیلے ہیں۔ مترجم کا مطالعہ وسیع' عمیق اور متنوع ہونا چاہیے۔ ترجمے میں ذخیرۂ الفاظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مترجم کا مطالعہ جس قدر وسیع اور ہمہ جہتی ہوگا اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ مختلف علوم کی لفظیات و اصطلاحات سے اسی قدر مالا مال ہوگا جس سے مترجم کو ترجمے میں بڑی مدد ملے گی۔ لہٰذا اُسے چاہیے کہ فنون لطیفہ فلسفہ' نفسیات' سائنس' مذہب' معاشیات' سیاسیات غرض یہ کہ ہر طرح کے مضامین اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کتابوں کو مطالعہ میں رکھے۔

ترجمہ ایک فن ہے۔ دیگر فنون کی طرح اسے بھی باقاعدہ سیکھنے' اس کی تربیت حاصل کرنے وراس میں کمال پیدا کرنے کے لیے مستقل اور مسلسل مشق اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ ترجمے کے فن کا باضابطہ اکتساب کرے اور اس میں مشق بہم پہنچائے۔

ترجمہ خلوص' موضوع سے مکمل وابستگی اور ذہنی مشقت کا متقاضی ہوتا ہے۔ مترجم کو محنت کش اور متشکک مستقل مزاج ہونا چاہیے۔ مترجم کو عجلت پسند اور جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ جلدی بازی میں کیا گیا ترجمہ سہو وسقم سے پُر ہوتا ہے۔ مترجم کو لغت سے رجوع کرنے میں تن آسانی یا تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اُسے یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی شخص ہمہ دان نہیں ہوسکتا۔ مترجم خواہ کتنا ہی قابل ہو اور اس کا ذخیرۂ الفاظ خواہ کتنا ہی وسیع ہو ترجمے کے وقت بعض اوقات اسے لغت دیکھنے کی ضرورت ضرور محسوس ہوگی۔ لغت دیکھنے میں کاہلی سے کام لینا یا اسے کسر شان سمجھنا غلطی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں لکھتے ہیں :

> ''ایک مشہور مترجم سے میں نے اس کے ترجموں کی کامیابی کے بارے میں سوال کیا تو اس نے انکساری سے یہ کہا کہ لغت میں دیکھ لیتا ہوں۔ باقی لوگ اس کام میں سُبکی محسوس کرتے ہیں۔''
>
> (ڈاکٹر سہیل احمد خاں' مضمون : ترجمہ' تالیف' تلخیص اور اخذ کرنے کا فن' مشمولہ ترجمہ : روایت اور فن۔ ص۔ 78)

دورانِ ترجمہ' مترجم کو صرف ایک لغت سے نہیں بلکہ کئی لغات سے بار بار رجوع کرنا لازمی ہے۔ اسے نہ صرف اُن لغات کو دیکھنا پڑے گا' جن میں الفاظ کے معنی بیان کیے گئے ہیں بلکہ ان لغات پر بھی نظر ڈالنی ہوگی' جن میں اصطلاحوں کے ترجمے اصطلاحوں کی صورت میں دیے گئے ہیں۔ موضوع مخصوص فرہنگ اصطلاحات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ لغات سے بار بار رجوع کرنا ایک صبر آزما اور محنت طلب کام ہے لیکن اچھے مترجم کے لیے اس صبر اور محنت کا مظاہرہ ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ لغت کا کام ترجمے میں مدد دینا ہے اور لغت ترجمے میں کام دیتا ہے لیکن ایک حد تک جو چیز لغت سے زیادہ کارآمد ہے وہ ہے اس زبان کا وسیع اور عام مطالعہ جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے۔

مترجم کو زیر ترجمہ کتاب کے موضوع یا مضمون سے بھی گہرا شغف اور ذہنی لگاؤ ہونا چاہیے۔ کسی علمی مضمون یا کتاب کا ترجمہ وہی کرسکتا ہے' جسے اس کے موضوع سے دلچسپی ہو۔ جس مترجم کو کسی خاص موضوع کی کتاب یا مضمون سے دلچسپی اور انسیت نہ ہو' اسے صرف زباندانی کے بل پر اس علم یا مضمون کی کتاب کا ترجمہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہر علم کا ماہر اپنے علم کی کتاب کا ترجمہ جس بہتر طور پر کرسکتا ہے' دوسرے علوم کی کتابوں کا اس بہتر ڈھنگ سے انجام نہیں دے سکتا۔

ترجمہ اصل متن کو سمجھ کر دوسروں کو سمجھانے کا نام ہے۔ جو شخص کسی متن کو خود نہ سمجھتا ہو وہ دوسروں کو کیا سمجھا سکتا ہے۔ اس لیے مترجم پر لازم ہے کہ کسی تصنیف کا ترجمہ کرنے سے قبل اس علم کی ضروری کتب کا مطالعہ کرے تاکہ اس علم کے اہم مباحث اور دیگر مشمولات کو صاف اور واضح طور پر بیان کرسکے۔ جب تک اصل متن کے نکات اور مطالب مترجم کے لیے آئینہ نہ ہو جائیں وہ ترجمے کے آئینے میں اس کا صحیح عکس پیش نہیں کرسکتا۔

موضوع سے شغف اور اصل عبارت کے مکمل فہم کے ساتھ ساتھ مترجم میں یہ خاصیت بھی ہونی چاہیے کہ اگر وہ کسی صاحب طرز ادیب یا مخصوص

رجحان اور خاص ذہنیت کے مصنف کی تصنیف کا ترجمہ کر رہا ہو تو اس ادیب یا مصنف کے طرز بیان، رجحان اور ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہو۔ ماہرین کا خیال ہے کہ موثر ترجمے کے لیے مترجم کو اصل عبارت کے مصنف کے حالات زندگی، اس کے مزاج، فلسفۂ حیات اور اسلوب کا علم ہونا چاہیے۔ ان نکات سے لاعلمی کے سبب اصل تصنیف کے بعض اشارے، کنایے اور نزاکتیں مترجم کی گرفت میں آنے سے چھوٹ جاتی ہیں جن پر پوری تصنیف کے لطف یا اہمیت کا دارومدار ہوتا ہے۔ اچھے ترجمے کے لیے مصنف کی سوانح و شخصیت کے علاوہ اس کے لسانی رویے، مخصوص الفاظ، تراکیب، محاوروں اور استعاروں سے اس کے لگاؤ اور اس کی پسندیدہ تشبیہات وغیرہ سے گہری واقفیت ضروری ہے۔ علاوہ ازیں مترجم کو مصنف کے دور کے سیاسی و معاشی اور تہذیبی و ثقافتی پس منظر، اس کے عہد کے اقدار و روایات تحریکات و رجحانات اور دیگر زمانی و مکانی حوالوں کو بھی پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے۔

مترجم کو اپنے مترجم ہونے اور ذولسان ہونے پر فخر ہونا چاہیے اور کسی بھی طرح کہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ نیز اصل تخلیق کے تئیں مکمل طور پر وفادار ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ متن کے تئیں مکمل وفاداری کو قبول کیے بغیر اچھا ترجمہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی طرح مترجم میں خودنمائی کی خواہش بھی نہیں ہونی چاہیے۔ مترجم کا اصل مقصد اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں بلکہ دوسری زبان کے شاہ کار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا یا ادبی اسالیب میں تازگی پیدا کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں :

> ''ترجمہ کرنے والا اپنی شخصیت اور مزاج کو کھو کر دوسرے کی شخصیت اور مزاج میں انہیں تلاش کرتا ہے۔ کھو کر پانا اور پا کر کھونا اچھے ترجمے کے بنیادی عناصر ہیں۔ اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے، جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے۔''
>
> (ڈاکٹر جمیل جالبی، ترجمے کے مسائل۔ مشمولہ ترجمہ۔ روایت اور فن مرتبہ نثار احمد قریشی۔ ص 156)

ترجمے کے دوران اپنی ذات کی نفی کے ساتھ ساتھ مترجم میں یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ اصل مصنف کے باطن میں جھانک سکے۔ اس کے ذہنی و فکری میلانات اور جذباتی لہروں اور نفسیاتی کیفیات سے آشنائی پیدا کر سکے۔ مترجم کو چاہیے کہ اپنے وجود، خیال، جذبے اور قلم کو اصل مصنف کے حوالے کر دے یعنی یہ سوچے کہ فلاں خیال، جملے، محاورے یا عبارت کو مصنف اگر ترجمے کی زبان میں لکھتا تو کیسے لکھتا۔ اس سلسلے میں پروفیسر نصیر احمد خاں لکھتے ہیں

> ''دراصل صحت مند اور کامیاب ترجمہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب ہم لکھنے والے کے ذہن میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم ان کیفیات اور احساسات سے گزر سکتے ہیں۔ جو تصنیف کا باعث بنی ہیں۔ اس طرح ترجمہ ہونے والے فن پارے کی روح تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح لے آنا ہے کہ دونوں قالبوں میں ایک ہی روح ہو۔ یہاں لباس، جسم اور روح سے مراد ترجمے کی زبان، اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے جو پڑھنے کے بعد دل و دماغ میں قائم ہوتا ہے۔''
>
> (ڈاکٹر نصیر احمد، مضمون، ترجمے کے مسائل اور مترجم۔ مشمولہ اردو لسانیات، دہلی 1990۔ ص 136)

مندرجہ بالا عمومی خصوصیات کے علاوہ ہر علم و فن کے ترجمے کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ مترجم میں ان تقاضوں کی کما حقہٗ تکمیل کی خاصیت ہونی چاہیے۔

مترجم کے خصوصیات کے سلسلے میں آخری لیکن نہایت اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ مترجم کو ذہین اور فطین ہونا چاہیے۔ غبی اور بلید آدمی ماہر مترجم تو درکنار سرے سے مترجم ہی نہیں بن سکتا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مترجم میں بنیادی طور سے کن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے؟

2. ترجمے میں لغت پر کس حد تک انحصار کیا جا سکتا ہے؟

3. مترجم کو کیوں اپنے فن پر فخر کرنا چاہیے اور احساسِ کمتری کا شکار ہوئے بغیر اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کی سعی جمیلہ کرنی چاہیے؟

4.6 خلاصہ

ترجمہ ایک خاص فن ہے جس کا تعلق ایک خاص ادبی اور تہذیبی سرگرمی سے ہے۔ ہر فن کی طرح ترجمے کے بھی خاص تقاضے ہیں۔ ترجمے کے تقاضوں کو ہم دو زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (1) عمومی تقاضے (2) موضوعاتی تقاضے

ترجمے کے عمومی تقاضے یہ ہیں :

اصل زبان میں مہارت : اصل زبان سے مراد زیرِ ترجمہ متن کی زبان ہے۔ ترجمے کی اصل زبان پر عبور و مہارت لازمی ہے جس کے بغیر متن کے مفاہیم اور مطالب کو سمجھنا ناممکن ہے۔

ترجمے کی زبان میں مہارت : اصل زبان کے ساتھ ساتھ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس میں بھی کامل مہارت ضروری ہے۔ بلکہ اصل زبان کے مقابلے میں ترجمے کی زبان پر کہیں زیادہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اصل زبان کے متن کو صرف سمجھنا ہوتا ہے جب کہ ترجمے کی زبان میں اس متن کو فنی، موضوعی اور لسانی نزاکتوں کے ساتھ بیان کرنا ہوتا ہے۔

اصل زبان کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت : زبان اور تہذیب ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ زبان کے بغیر تہذیب اور تہذیب کے بغیر زبان کو سمجھنا ناممکن ہے۔

ترجمہ دراصل کسی متن کو ایک تہذیبی سیاق سے نکال کر دوسرے تہذیبی پیکر میں ڈھالنے کا کام ہے اس لیے اصل زبان کی تہذیبی روایات اور ثقافتی اقدار سے اچھی واقفیت ترجمے کے لیے ضروری ہے۔

ترجمے کے موضوعاتی تقاضوں کی تفصیل درج ذیل ہے :

علمی تراجم کے تقاضے : علمی تراجم میں سائنسی اور عمرانی علوم اور ٹکنالوجی کے مضامین کے ترجمے شامل ہیں۔ علمی ترجموں میں تین اہم تقاضے ہوتے ہیں۔ موضوع سے دلچسپی و شغف، معلومات کی صحیح ترسیل اور موزوں اصطلاحات کا استعمال۔

ادبی تراجم کے تقاضے : ادبی تراجم کا کام نہایت مشکل ہوتا ہے۔ ان میں مصنف کے خیال کے علاوہ جذبات و احساسات، کیفیات اور تاثرات کو سمجھنا اور انہیں ترجمے میں منتقل کرنا لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے جمالیاتی تقاضوں اور فنی قدروں کی پاسداری بھی کرنی پڑتی ہے۔

مذہبی تراجم کے تقاضے : مذہبی کتابیں تقدس اور جلال کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کے ترجمے میں زبان اور اسلوب کو جلال اور شکوہ سے پُر ہونا چاہیے۔

قانونی تراجم کے تقاضے : قانونی تراجم میں لفظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کیوں کہ لفظ کے تغیر سے قانون کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس لیے قانونی تراجم لفظی ترجمے پر مبنی ہونے چاہئیں۔

صحافتی تراجم کے تقاضے : صحافتی تراجم میں ''ادبیت'' سے زیادہ مواد کی ترسیل کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے صحافتی تراجم کی زبان سادہ اور عام فہم اور اسلوب سلیس اور شفاف ہونا چاہیے۔

ترجمے کے مندرجہ بالا تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مترجم کو کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جو درج ذیل ہیں :

- مترجم کو ترجمے کا ذوق ہونا چاہیے۔ اسے ترجمے کے کام سے شغف اور فطری مناسبت ہونی چاہیے۔
- مترجم کو اصل تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان پر کما حقہٗ عبور ہونا چاہیے۔
- مترجم کا مطالعہ وسیع اور عمیق ہونا چاہیے۔

- مترجم کو ذہین، محنتی، متشکک اور مستقل مزاج ہونا چاہیے۔
- مترجم کو زیرِ ترجمہ کتاب کے موضوع سے بھی دلچسپی اور اس میں مہارت ہونی چاہیے۔
- مترجم کے لیے کسی تصنیف کے ترجمے سے قبل اس علم کی ضروری کتب کا مطالعہ بھی لازمی ہے۔
- مترجم کو اصل عبارت کے مصنف کی حیات و فلسفۂ حیات، اس کی زبان و اسلوب اور اس کے عہد کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کی واقفیت رکھنا ضروری ہے۔
- مترجم میں خود پسندی نہیں بلکہ اطاعت و انکسار کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اصل متن کی پوری تقلید کر سکے اور اپنی ذات کو بالائے طاق رکھ کر اصل مصنف اور فن پارے کی روح تک پہنچ سکے۔

4.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے میں اصل زبان اور ترجمے کی زبان سے مترجم کی واقفیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. ترجمے کے موضوعاتی مسائل پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
3. مترجم کی خصوصیات سے بحث کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے میں اصل زبان کے تہذیبی پس منظر کی اہمیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. قانونی تراجم کے تقاضوں پر مختصر اً روشنی ڈالیے۔
3. صحافتی تراجم کے تقاضوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

4.8 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت
2. ڈاکٹر خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری
3. نثار احمد قریشی — ترجمہ: روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
4. اعجاز راہی — روداد سیمنار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
5. ڈاکٹر حسن الدین احمد — انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

اکائی 5 : ترجمے کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل

ساخت

5.1 تمہید

5.2 ترجمے کی مختصر تاریخ

5.2.1 اے گلاسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو ٹرمز

5.3 ترجمے کی تعریف اور فن

5.3.1 ترجمہ کیا ہے؟

5.3.2 ترجمے کی تعریف

5.3.3 ترجمے کے اصول

5.3.4 مترجم کی ذمے داریاں

5.3.5 ترجمے کی قسمیں

5.4 تراجم اور اصطلاحات

5.4.1 اصطلاح کیا ہے؟

5.4.2 اصطلاح سازی کے عمومی اصول

5.5 ترجمے کے دوران اصطلاحات کے مسائل

5.5.1 مذہبی تراجم

5.5.2 علمی تراجم

5.5.3 ادبی تراجم (منظوم)

5.5.4 نثری تراجم

5.5.5 صحافتی تراجم

5.6 خلاصہ

5.7 نمونۂ امتحانی سوالات

5.8 فرہنگ

5.9 سفارش کردہ کتابیں

5.1 تمہید

کسی بھی زبان میں تبدیلیاں، سماج میں پائے جانے والے باہمی امتیازات سے جڑی ہوتی ہیں۔ یہ امتیازات ہمارے ظاہری و باطنی تجربات کے

ترجمان ہوتے ہیں۔ ہماری خواہشیں، آرزوئیں، احساسات، جذبات، خیالات وافکار، فیصلے وعقیدے، بیانی یا تحریری شکل اختیار کر لیتے ہیں تو درحقیقت یہ ہمارے دل ودماغ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کسی زبان میں محفوظ طبیعی وسماجی علوم وفنون، شعروادب کے ذخیرے جب کسی دوسری زبان میں بذریعہ تحریر منتقل کیے جاتے ہیں تو ہم انہیں ترجمہ کہتے ہیں اور بذریعہ تقریر ہو تو ترجمانی کہیں گے۔ ترجمے کے وسیلے سے علوم وفنون اور زبان وادب کی بتدریج ترقی ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کے سپاٹ ترجموں کے بعد ان میں پختگی اور کمال پیدا ہوتا گیا جس میں بڑا دخل اصطلاحات کا ہے۔ ترجمے کے دوران اصطلاحات کے ہمہ جہت استعمال نے ترسیل و ابلاغ میں معنویت، اختصار اور حسن اظہار پیدا کر دیا ہے۔

5.2 ترجمے کی مختصر تاریخ

ہمارے یہاں اردو میں ترجمے اور اصطلاحات وضع کرنے کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ یہ ترجمے لاطینی، عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، فرانسیسی اور بہت بعد میں انگریزی سے اردو میں ہوتے رہے۔ تراجم کی یہ ابتدائی کوششیں انفرادی یا شخصی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ترجموں کے لیے باضابطہ اداروں، مدرسوں اور انجمنوں کی جانب سے کوششیں کی جانے لگیں۔ مدرسہ غازی الدین (1792)، فورٹ ولیم کالج (1800)، دہلی کالج (1825)، دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد (1825)، محکمہ علوم وفنون، حیدرآباد دکن اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ (1917) نے مختلف علوم کے ترجموں اور اصطلاحوں کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تراجم کے دوران اصطلاح سازی کا بڑا صبر آزما اور نازک مرحلہ آتا ہے۔ جس کی طرف بیسویں صدی میں خصوصی توجہ کی گئی۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم کو وضعِ اصطلاحات سے ہی نہیں بلکہ نئے نئے الفاظ بنانے سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم، شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے اولین صدر تھے۔ مولوی عبدالحق، محکمۂ دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ کے ناظم اور انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ پروفیسر سلیم کو نئے الفاظ بنانے اور اصطلاح سازی میں کمال حاصل ہے۔ انہیں کی تحریک پر وحیدالدین سلیم نے اپنی گراں قدر تصنیف ''وضع اصطلاحات'' طبع کر کے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے شائع کی۔ مولوی عبدالحق ہی کی خواہش پر برکت علی چودھری نے ''طریق تسمیہ'' تصنیف کی۔ فن ترجمہ نگاری اور اصطلاحات سازی کے موضوع پر اردو میں کئی اور کتابیں، مضامین اور رسائل بھی منظر عام پر آنے لگے، جن سے ترجمے اور ترجمے سے متعلق موضوعات پر کام کرنے کے لیے سہولتیں پیدا ہوئیں۔ یہ تو بیسویں صدی کی تصانیف اور مضامین تھے، جو علوم وفنون اور زبان وادب کے بدلتے ہوئے رجحانات اور بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر منظر عام پر آئے۔ ان سے تقریباً پون صدی قبل یعنی 1855ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس طرف توجہ کی تھی۔

5.2.1 اے گلاسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو ٹرمز A Glossary of Judicial and Revenue Terms

انیسویں صدی کا نصف آخر اردو کی نہ صرف ثقافتی تاریخ کے لیے اہم رہا بلکہ زبان وادب نے عمودی اور افقی اعتبار سے بھی خوب ترقی کی۔ 1855ء میں ایچ۔ ایچ ولسن نے ایک بہت بڑا کام انجام دیا۔ ولسن نے دفتری، قانونی، عدالتی، مالگزاری اور انتظامیہ کے علاوہ عام ثقافتی ذخیرۂ الفاظ و اصطلاحات کی ایک لغت مرتب کی جس کا نام ''اے گلاسری آف جوڈیشیل اینڈ ریونیو ٹرمز'' ہے اس میں اردو، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، بنگالی، مراہٹی، گجراتی اور پنجابی میں موجود اصطلاحات اور الفاظ کا انگریزی مفہوم بیان کیا گیا ہے، جو برٹش انڈیا کی سرکاری دستاویزات میں مستعمل تھیں ان کی لسانی اور تہذیبی وعلمی ضرورت کے تحت 1940 میں کلکتے سے ایسٹرن ہاؤس نے شائع کی۔ 1985 میں ''اصطلاحاتِ عدلیہ و مالگزاری'' کے عنوان سے ایک فرہنگ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (پاکستان) نے بھی شائع کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمہ اور ترجمانی میں کیا فرق ہے؟

2. انیسویں صدی کے بعض اداروں کے نام بتایئے جہاں تراجم کی باضابطہ کوششیں کی گئیں۔

3. ایچ۔ایچ ولسن نے کونسی فرہنگ (Glossary) مرتب کی؟

5.3 ترجمے کی تعریف اور فن

5.3.1 ترجمہ کیا ہے؟

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے۔عرب تہذیب میں اگر کسی شخص کی سوانح لکھی جاتی ہے تو اس سوانح حیات یا حالاتِ زندگی کو ترجمہ کہتے ہیں۔یہی معنی زمانۂ قدیم میں اردو میں بھی رائج تھے لیکن بہت معروف نہیں تھے۔ترجمہ کا تلفظ بہر حال اول وسوم مفتوح کے ساتھ ہے۔کہیں کہیں مضموم بھی سنائی دیتی ہے۔شاید اس وجہ سے کہ اسم فاعل ترجمان' سوم مضموم کے ساتھ' بر وزنِ بدگمان بولا جاتا ہے۔اول وسوم مفتوح قابلِ ترجیح ہے۔ترجمے کو انگریزی میں Translation کہتے ہیں اور ترجمہ کرنے والے کو Translator یا مترجم کہتے ہیں اس کا تلفظ بر وزن مقابل ہے۔

5.3.2 ترجمے کی تعریف

ایک زبان سے دوسری زبان میں مطلوبہ مواد کی منتقلی کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ترجمہ ترسیل علم کا کام انجام دیتا ہے۔یعنی اس کے ذریعے وہ علمی اور ادبی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں' جن کی کسی خاص زمانے میں ضرورت ہوتی ہے۔علم کی وسعت اور علمی سائنسی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں سے بڑی مدد ملتی ہے۔یعنی ترجمہ ''مفتاح العلوم'' ہے۔علم کی اس کنجی سے علوم وفنون کے خزانے دوسروں کے لیے بھی کھل جاتے ہیں۔

ترجمہ بڑا مشکل اور نازک کام ہے' جس کے لیے دونوں زبانوں پر قدرت رکھنا ضروری ہے۔نہ صرف زبانوں پر بلکہ موضوع پر اور دونوں زبانوں کی قواعد' نزاکتوں اور کلچر پر بھی ترجمہ نگار کو عبور حاصل کرنا چاہیے۔ترجمہ لفظی نہ ہو۔یہ مکھی پہ مکھی بٹھانے کا کام نہیں بلکہ معانی ومطالب' سیاق وسباق' مقصد و نقطۂ نظر کی منتقلی کا نام ترجمہ ہے۔مترجم میں اگر عقل سلیم نہ ہو' سمجھ بوجھ سے کام نہ لیتا ہو تو لفظی ترجمہ مضحکہ خیز معنی دیتا ہے اور اصل مفہوم ومطلب غائب ہو جاتا ہے جیسے Outstanding Scientists کا لفظی ترجمہ کسی نے ''باہر کھڑے ہوئے سائنس داں'' کیا ہے' جب کہ اس کا صحیح ترجمہ ''ممتاز سائنس داں'' ہوتا ہے۔اردو کا ایک مشہور محاورہ ہے ''میرا دل باغ باغ ہو گیا'' انگریزی میں اس کا لفظی ترجمہ مشہور ہے۔ "My heart became garden and garden" جو اردو محاورے کا مضحکہ خیز ترجمہ ہے۔

5.3.3 ترجمے کے اصول

اردو ادب کے ابتدائی دور میں بہت بڑی تعداد میں فارسی' عربی اور سنسکرت سے ترجمے کیے گئے۔یہ ترجمے مذہب' تصوف' شاعری' ہیئت' فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے تھے۔یہ ترجمے باقاعدہ ترجمے نہیں بلکہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمے ہوتے تھے۔ان میں ترجمہ نگاری کے سائنٹفک اصولوں کی پابندی نہیں کی جاتی تھی جو اچھے ترجموں کے لیے ضروری ہیں۔آئندہ کی سطروں میں ہم ترجمہ نگاری کے چند اہم اصولوں کے بارے میں انگریزی کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔کیوں کہ آج ہم اور ہمارا میڈیا انگریزی ہی کے وسیلے سے تراجم کے کام انجام دے رہے ہیں۔اردو میں انگریزی سے ترجمے کے چند بنیادی اصول یہ ہیں :

1. عموماً کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔سیاق وسباق کی مماثلت کی بنا پر معنی میں توسیع کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ترجمہ نگار کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ موقع ومحل کے اعتبار سے لفظ کا انتخاب کرے۔

2. اگر انگریزی محاورے کا متبادل محاورہ اردو میں ملتا ہے تو ترجمے میں جوں کا توں محاورہ استعمال کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے ترجمے کا حسن بڑھ جاتا ہے۔مثلاً Take to task آڑے ہاتھوں لینا۔

3. کسی انگریزی لفظ کا اردو متبادل جہاں تک ممکن ہو ایسا لفظ منتخب کریں جس سے مشتقات وضع ہو سکیں مثلاً ایڈمنسٹریشن کا ترجمہ انتظام ہو سکتا ہے، جس سے کئی لفظ اور نکلتے ہیں۔ اس سے ہم تنظیم، منتظم، انتظامیہ، تنظیمی وغیرہ الفاظ مشتق کر سکتے ہیں۔

4. اگر انگریزی کے بعض الفاظ ہماری زبان اور کلچر کا جزو بن چکے ہیں تو ان کے ترجمے کی ضرورت نہیں جیسے کالج، پن (Pun) یعنی ابہام، ہوم ورک، پروگرام، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور کرکٹ، فٹبال وغیرہ۔ بعینہٖ انگریزی ڈکشنریوں میں بھی اردو کے بعض الفاظ جوں کے توں شامل کر لیے گئے ہیں جیسے ہڑتال، لاٹھی، چمچہ (خوشامدی کے معنی میں)

5. اسم خاص، جسے اسمائے معروضہ بھی کہتے ہیں، کے متعلق اصول یہ ہے کہ انہیں ہو بہو لے لیا جائے۔ بعض اسماء کا تلفظ اردو میں ثقیل اور مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے اسمائے معروضہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لینے میں کوئی برائی نہیں اور ماضی میں ایسا ہوا بھی ہے جیسے Plato اور Aristotle کو اردو میں افلاطون اور ارسطو بنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح مقامات کے ناموں میں بھی حسب ضرورت رعایت برتی جا سکتی ہے۔ جیسے Africa ہم نے افریقہ بنا لیا اسی طرح China کو چین بنا لیا۔

6. انگریزی کے اکثر الفاظ جمع میں برتے جاتے ہیں لیکن اردو میں ان کے مترادف الفاظ واحد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً Scissors کے ترجمے کے لیے اردو میں واحد قینچی آئے گا۔ انگریزی میں بعض اوقات واحد اور جمع مختلف معنوں میں برتے جاتے ہیں۔ یعنی ایک لفظ واحد میں جو معنی دیتا ہے جمع میں اس کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں۔ مثلاً Good کے معنی اچھا یا عمدہ کے ہوتے ہیں جب کہ یہی لفظ جمع میں صفت سے اسم بن جاتا ہے، Goods بمعنی مال و اسباب، اسی طرح Arm بازو (اسم)۔ Arms اسلحہ (اسم) ایسے الفاظ کے ترجمے میں احتیاط اور اردو روزمروں اور محاوروں کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

7. انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت ایک مرحلہ اصطلاحات سازی کا آتا ہے۔ اس سلسلے میں آگے تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اگر کوئی انگریزی اصطلاح اور اس کا اردو متبادل دونوں یکساں طور پر اردو میں مقبول ہوں تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں کو برتا جائے۔ مثلاً مجلس اور کمیٹی وغیرہ۔

8. اگر بعض انگریزی اصطلاحیں استعمال میں آ کر ہماری زبان کا جزو بن چکی ہیں تو ان کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً باڈی گارڈ، کسٹوڈین، ڈیفنس ایریا، وغیرہ۔ انگریزی میں بھی ہماری مالگزاری کی بہت سی اصطلاحیں شامل کر لی گئی ہیں جیسے چنگی، لگان، حرجانہ، خریف وغیرہ۔

9. انگریزی کی فنی اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھا جانا چاہیے کہ اردو میں بھی وہ لفظ اصطلاح کی شان رکھتا ہو نہ کہ لفظی معنی و مطلب ادا کرتا ہو۔ مثلاً Electrify (کسی چیز میں بجلی پہنچانا) اب اس کا اصطلاحی ترجمہ ہوا ہے۔ ''برقانا''۔ کسی ٹھوس مائع میں مقناطیسیت پیدا کرنے کے لیے اردو اصطلاح ''مقنانا'' استعمال ہوتا ہے۔

10. ہماری بعض اصطلاحیں تجارت، صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اب ان کا ترجمہ کرتے وقت متعلقہ فنون کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بعض وقت ان پڑھ لوگ بڑی اچھی اصطلاحیں ڈھال لیتے ہیں اور ترجمے کر لیتے ہیں۔ مثلاً Denting کے لیے ''مٹھارنا''

11. اردو زبان ایک مخلوط زبان ہے۔ اردو کا عربی اور فارسی زبانوں سے تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ کا تعلق ہے، جن کا اردو کی لسانی اور ادبی سطح پر کافی اثر پڑا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے انگریزی سے بھی الفاظ مستعار لیے ہیں۔ خود انگریزی بھی دوسری زبانوں سے اخذ و ماخوذ کے ذریعے اپنا دامن وسیع کرتی رہتی ہے۔ مخلوط زبانیں اس طرح دوسری زبانوں سے اپنا رشتہ استوار کر کے نہ صرف اپنی لفظیات میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ مختلف لسانی علاقوں، تاریخ اور تہذیب میں قبول عام کی سند بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ چنانچہ ترجمے کے دوران ہمیں مناسب لفظ، محاورے اور اصطلاح کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً افریقہ کے ایک قبیلے کا نام بربر ہے جو ظلم اور سفاکی کے لیے مشہور ہے۔ اس کی مناسبت سے عربی میں ایک اصطلاح بربریت نے جنم لیا ہے، جسے انگریزی میں Barbarism کہتے ہیں۔ اردو میں بربریت عربی سے آیا ہے۔ عربی میں ایک لفظ ہے ''ہرج''، جس کے معنی ہیں شورش، ہنگامہ، خلل، وقفہ، ڈھیل، مضائقہ، برائی۔ انگریزی کی اصطلاح جو کورٹ میں استعمال ہوتی ہے وہ "Penalty" ہے اس کے

لیے اردو میں جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ ''ہرجانہ'' ہے۔ ہرجانہ بمعنی ''تاوان'' اہل اردو نے فارسی طرز پر بنائی ہے۔

ترجمے کے یہ چند بنیادی اصول ہیں۔ ویسے مترجم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی لسانی و ادبی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے موقع و محل کے لحاظ سے بروقت مناسب اصول متعین کرے یا متعینہ اصولوں میں کمی و بیشی ترمیم و اضافے سے کام لے۔

5.3.4 مترجم کی ذمے داریاں

ترجمہ خواہ ادبی ہو یا علمی، آزاد ہو کہ پابند اس کے لیے مترجم میں غیر معمولی فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ متن کے مفہوم کی صحیح تفہیم اور تعین کرے اور پھر اُسے ویسے ہی برجستہ اور برمحل الفاظ و اسلوب میں ادا کرے۔

مترجم جب تک زبان کی نزاکتوں اور اسلوبیاتی نظام پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق بہم نہیں پہنچاتا، اس وقت تک وہ ترجمے کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

زبان دانی کی سطح پر اچھے مترجم کی خصوصیات میں جہاں اور بہت سے امور شامل ہیں وہیں زبان کی گرامر، لفظ کی شناخت، روزمرہ، محاورہ، استعارات، کنایات، علامات، تشبیہات، ضرب الامثال سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اس میں زبان کے مزاج، اسلوبی نظام اور پیرایۂ اظہار کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے۔

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ جس زبان کے ادب یا فن کو وہ اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے سوچ رہا ہے پہلے اس زبان کے تہذیبی رچاؤ سے بھی واقفیت حاصل کرے۔

اسی طرح اردو مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو کی ہیئتِ ترکیبی کا علم رکھتا ہو، اس میں چار باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے :

1. ترجمہ کرنے کا ذوق، صبر و تحمل، زبان پر قدرت اور مضمون پر گرفت ہو۔
2. اصل متن اور مصنف سے وفاداری ہو۔
3. اصل متن اور مصنف سے عصبیت نہ رکھتا ہو۔
4. اصل متن کی روح، نوعیت، جذبات، محاکات، اسلوبیاتی نظام کا خیال رکھتا ہو۔

اصطلاحات کو کماحقہٗ سمجھ سکتا ہو اور وقتِ ضرورت اصطلاحات سازی کرسکتا ہو۔

5.3.5 ترجمے کی قسمیں

ترجمے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک عام، روایتی اور رسمی ترجمہ ہوتا ہے، خواہ وہ کسی قسم کا ترجمہ ہو۔ اسے سبک رواں اور عام فہم ہونا ضروری ہے، تاکہ ترجمے کا اصل مقصد یعنی ترسیل و ابلاغ بہ آسانی ممکن ہوسکے۔ ترجمے کے تین اقسام کا یہاں ذکر کریں گے، جن سے ترجمے کے دوران عموماً سابقہ پڑتا ہے۔

الف) لفظی ترجمہ

یہ ایک عام، روایتی اور رسمی ترجمہ ہوتا ہے، جس میں عبارت و مفہوم و مطالب کے گہرے احساس اور شعور کے بغیر لفظ بہ لفظ ترجمہ کردیا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک ناقص ترجمہ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس سے ترجمے کا مقصد ادا نہیں ہوتا۔

ب) بامحاورہ ترجمہ

اس قسم کے ترجمے میں مترجم، ترجمے کے تقاضوں، اصول و ضوابط، مضمون کی گہرائی اور اسلوب کی صفائی کا خیال رکھتا ہے۔ اس میں زبان و بیان کے لسانی شعور و احساس کے دوش بدوش مضمون کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مضمون کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کامیاب ترجمہ کہلاتا ہے۔

ج) آزاد ترجمہ

یہ ترجمہ مضمون کے عین مطابق نہیں ہوتا بلکہ فکر و خیال کی کچھ آزادی کے ساتھ اظہار میں بھی آزادی برتی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک پیراگراف پڑھ لیا جاتا ہے اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ خیال یہ رکھا جاتا ہے کہ پیش کردہ متن کے معانی و مفاہیم ادا ہو جائیں، جس کے نتیجے میں اندازِ بیان میں فطری بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ترجمے ادبی اعتبار سے عمدہ سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے علی حیدر نظم طباطبائی نے "Elegy Written in a Country Churchyard" کا ترجمہ ''گورِ غریباں'' کے عنوان سے کیا تھا اس میں مفہوم کی پابندی کے ساتھ اس کی ادائیگی آزادی کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔

د) متنی ترجمہ

بعض ترجمے ایسے ہوتے ہیں جن میں True to the text ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے قانونی، عدالتی، دفتری اور سائنسی ترجمے، جن کا اصل کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اس میں کافی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس میں الفاظ محاورے اور اصطلاحات کے استعمال میں احتیاط برتنی پڑتی ہے اور پوری ہوش مندی سے سمجھنا اور ادا کرنا پڑتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. صحیح تلفظ پر نشان لگائیے۔
   - تَرجَمہ ○
   - ترجُمہ ○
   - ترجِمہ ○
2. ترجمہ کسے کہتے ہیں؟
3. ترجمے کے کوئی تین اصول بتائیے۔
4. اصطلاح ''بربریت'' کا ماخذ کیا ہے؟
5. ترجمے کی کتنی قسمیں ہیں؟

5.4 تراجم اور اصطلاحات

کسی بھی زبان میں الفاظ اور کلمات کے بعد اصطلاحات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ علمی اور سائنسی شعبوں میں مختلف مضامین اور مختلف تجربات، افکار و خیالات کو پیش کرنے کے لیے اصطلاحات درکار ہوتی ہیں۔ یہ معاملہ زبان کے لسانی ڈھانچے اور ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اصطلاح اور لفظ میں کیا فرق ہے؟ اس کے لیے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ اصطلاح کسے کہتے ہیں جس کے ساتھ ہی لفظ خود بخود سمجھ میں آ جائے گا۔

5.4.1 اصطلاح کیا ہے؟

کسی علمی یا فنی گروہ کا کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ کوئی خاص مفہوم مقرر کر لینے کو اصطلاح کہتے ہیں، جو عام طور سے تشریح طلب ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب کوئی خاص گروہ، کسی علم و فن کے سلسلے میں کسی مفرد یا مرکب لفظ کو اس کے اصلی معنی کے سوا کسی اور معنی میں استعمال کرتا ہے تو وہ لفظ اس گروہ اور اس علم و فن کی اصطلاح کہلاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصطلاح اُس لفظ کو کہتے ہیں جس کے کسی خاص علم و فن میں لغوی معنی سے الگ کوئی مناسب معنی یا عام اور متعدد معانی میں سے کوئی ایک معنی متعین کر لیے جائیں۔ اور اس علم و فن کی متداول کتابوں میں وہ لفظ اپنے

اسی متعینہ معنی میں عام طور پر مستعمل ہو۔ جیسے ''حرف'' کے معنی ہیں ''کنارہ'' گرامر میں ''حرف'' ایک کلمہ ہے جس کے کوئی مستقل معنی نہ ہوں۔ ''فقہ'' کے معنی ہیں ''جاننا اور سمجھنا''۔ دینیات میں فقہ ''علم دین یا شریعت کا جاننا'' ہے لغت میں یہ لفظ عام تھا' اصطلاح میں خصوصی معانی میں لیا گیا ہے۔ مطلع' رباعی' تخلص' بحر' تقطیع اردو شعر و ادب کی اصطلاحات ہیں۔ یہ الفاظ اپنے اصلی معنی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معنی بھی رکھتے ہیں جن پر ماہرین علم وفن کا اتفاق ہے۔ مثلاً ''مطلع'' کے لغوی معنی ہیں طلوع ہونے یا نکلنے کی جگہ ''لیکن ادب و شعر کی اصطلاح میں غزل کے پہلے شعر کو' جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوں مطلع کہتے ہیں۔ ایک مثال سے اسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ''صرفیات (Morphology) لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ اردو کی عام قواعد میں اس شاخ کو ''صرف'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چوں کہ لسانیات میں یہ اصطلاح ایک خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے اس لیے اسے مارفولوجی یا صرفیات کہتے ہیں۔

اصطلاح کی اس تعریف سے کبھی اس پر محاورے کا بھی گمان ہوتا ہے۔ محاورہ سے مراد ایسے الفاظ ہیں جن سے حقیقی لغوی معنی کے بجائے کوئی اور معنی مراد لیے جائے۔ ان لفظوں میں کوئی نہ کوئی مصدر بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہی مصدر حقیقتاً اپنے اصل معنی سے الگ دوسرے معنی میں آتا ہے۔ روزمرہ کا تعلق حقیقی معنوں سے ہوتا ہے جب کہ محاورں کا تعلق مجازی معنوں سے ہوتا ہے۔ اصطلاح میں مفرد یا مرکب لفظ کو اصلی معنی کے بجائے دوسرے معنی میں لایا جاتا ہے۔ اصطلاحیں عموماً مفرد ہوتی ہیں۔ لیکن اصطلاحیں مرکب بھی ہیں جیسے حرارت پیما' حلف نامہ' مہنگائی بھتہ وغیرہ۔ عام بول چال کے الفاظ پر تو کسی کا بس نہیں جو لفظ عوام کی ٹکسال سے چل نکلا وہ رائج الوقت سکہ ہے۔ اصطلاح سازی البتہ اہل علم کا کام ہے۔ اصطلاح میں عظمت اور ایک طرح کی گمبھیرتا ہوتی ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اصطلاحیں صوتی لحاظ سے موزوں' قواعد زبان کے مطابق اور بناوٹ میں وقار رکھتی ہوں اور معنی کی دلالت کی رو سے مناسب ہوں۔

5.4.2 اصطلاح سازی کے عمومی اصول

علوم وفنون کی کتابوں کے تمام ترجمے کے دوران سب سے مشکل مرحلہ اس شعبۂ علم کی اصطلاحوں کے مترادف یا مساوی المعنی اصطلاحات کی تدوین کا ہوتا ہے۔ تمام انگریزی اصطلاحوں کو جوں کا توں اردو رسم الخط میں لکھ لینا مناسب نہیں ہوگا اور نہ ہی اردو زبان بحسن وخوبی متحمل ہوگی۔ اسی طرح سنسکرت یا عربی و فارسی کے الفاظ کو اصطلاحوں کے نام سے ترجمے کی عبارت میں استعمال کرنا بھی مفید نہیں۔ لہٰذا دوران ترجمہ اصطلاح سازی لازمی عمل ہو جاتا ہے اس کے لیے کچھ اہم و بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جو ذیل میں پیش کیے گئے ہیں :

1. اصطلاحات حتی الامکان مختصر اور جامع ہوں اور جس مفہوم کے لیے بنائی گئی ہوں اس کے پورے معانی و مطالب کے اظہار کی ان میں صلاحیت ہو۔ پڑھنے اور بولنے میں آسان ہوں۔ مثلاً Light کے تین معنی سامنے آتے ہیں۔ (1) روشنی (2) نور اور (3) پرکاش۔ اردو میں ''نور'' کو اپنایا گیا جو لکھنے اور بولنے میں آسان ہے اور اس سے بہت مشتقات بن سکتے ہیں۔
2. سنسکرت' عربی' فارسی اور ہندی الفاظ' اردو کے الفاظ شمار کئے جائیں اور اصطلاحات وضع کرنے میں اردو قواعد کے مطابق انہیں استعمال کیا جائے۔ ترجیح ان الفاظ کو دی جائے' جو مقبول اور مروّج ہوں۔
3. عربی ہندی یا فارسی ہندی کے میل سے اصطلاحیں وضع کر کے الفاظ اور اصطلاحات کی گویا متحدہ قومیت کو بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ رجحان علمی اور ادبی نقطہ نگاہ سے مستحسن ہے۔ لفظوں کو جوڑنے اور مختلف زبانوں کے الفاظ میں پیوند لگانے کے لیے ان میں صوتی مناسبت اور ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ تاکہ مرکب الفاظ گھل مل کر ایک ہو جائیں' زبان اور کان پر بار نہ گزریں' جیسے مورت نگاری (ہندی + فارسی) (تصویر نگاری) ' عبادت گاہ (عربی + فارسی) ' کلاونت (ہندی + ہندی)
4. دو یا دو سے زیادہ لفظ پاس پاس رکھ دیے جائیں خواہ ان کے درمیان کوئی رشتہ یا ربط ہو یا نہ ہو جیسے گھڑ دوڑ' موم روغن' عمر قید وغیرہ۔
5. الفاظ تو پاس پاس رکھے جائیں مگر ان میں گرامر کے لحاظ سے کوئی رشتہ یا ربط ضرور ہو جیسے جیب کترا (Pick Pocket) ' Pick کے معنی چننے یا

اٹھانے کے ہیں۔ Man Eater ' (Man = آدمی' Eater = کھانے والا) اس سے بنا آدم خور حالانکہ انگریزی میں زیادہ موزوں لفظ Cannibal ہے۔

6. حتی الامکان عصری اور رائج الوقت الفاظ سے وضع اصطلاحات کا کام لیا جائے یعنی موجودہ الفاظ کو نئے نئے معنی میں استعمال کریں مثلاً نظر سے ناظر' نظارہ' منظر' ناظرہ' نظریہ وغیرہ۔

7. انگریزی الفاظ مقبول عام اور زبان زد ہو تو انہیں بجنسہٖ استعمال کیا جانا چاہیے۔ جیسے جج' پولس' موٹر وغیرہ۔

8. ہندی زبان کے الفاظ جو ہماری زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں انہیں بے تکلف وضعِ اصطلاحات کے دوران کام میں لانا چاہیے' جیسے ٹھٹھول' دھن وان' گن وان' گھروندا' کٹوتی۔ جوٹ وغیرہ۔

9. اصطلاحات کے بنانے میں سابقوں اور لاحقوں سے کام لینا اصطلاحات سازی کے مرحلے کو آسان کر دیتا ہے۔ جیسے خشمگیں' پائمال' ریگ مال' بنوٹ' کوتوال' گاڑی بان۔

10. جب کسی انگریزی مصدر کے مقابل فعل یا مصدر بنانا ہو تو پہلے مصدر کے مادے کا ترجمہ کریں' پھر اس کے آگے اردو کی علاماتِ مصدر سے کوئی مناسب علامت لگائیں۔ مثلاً Nationalise (قوم میں داخل کرنا) قومیانا - Electrify (بجلی پہنچانا) برقانا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اصطلاح سے کیا مراد ہے؟
2. اصطلاح اور محاورے میں کیا فرق ہے؟
3. اصطلاح سازی کے عمومی اصولوں میں سے دو کی تشریح کیجیے اور مثالیں بھی دیجیے۔

5.5 ترجمے کے دوران اصطلاحات کے مسائل

مختلف علوم وفنون کے تراجم کے دوران اصطلاحوں کے آجانے سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے' کیوں کہ اصطلاح کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ اصطلاح کا مفہوم سمجھنا اور اس کا اردو میں ترجمہ کرنا اور اسی مفہوم کو ادا کرنے والی یا اسی مفہوم کی متحمل اصطلاح تراشنا آسان مرحلہ نہیں۔ مختلف علوم وفنون کی اصطلاحوں میں فرق ہوتا ہے' مخصوص علم کے جس نوع کی اصطلاح درکار ہے' ویسی اصطلاح تراشنا ایک صاحب علم' ماہر فن اور زبان پر قدرت رکھنے والی شخصیت ہی کا کام ہے۔ وہ زبانیں جو موضوع کے مزاج اور اس کی سرشت سے لگا نہیں کھا سکتیں ان سے مدد نہیں لی جا سکتی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے امہات الامہ لکھتے وقت ہجرت کے لیے رسول اکرم ﷺ کی شان میں غیر شعوری طور پر ایک ایسا ہندی لفظ استعمال کر گئے جو موقع' محل اور شانِ رسول اکرم ﷺ میں گستاخی سمجھا گیا۔ لکھتے ہیں ''وہ راتوں رات سٹک گئے'' یہاں موقع تھا ''راتوں رات تشریف لے گئے'' کے استعمال کا۔ تھوڑی سی بے احتیاطی نے بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

ترجمے کے لیے بے پناہ موضوعات ہو سکتے ہیں مگر عام طور پر ہمیں چار میدانوں میں ترجمے کی اشد ضرورت پڑتی ہے اور ان چار میدانوں میں اصطلاحات کا بھی بڑا ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود نئی اصطلاحات کے امکانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ چار میدان درج ذیل ہیں:

1. مذہبی 2. علمی 3. ادبی اور 4. صحافتی

5.5.1 مذہبی تراجم

مذہبی تقاضوں کے پیش نظر اور پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت کے لیے مشنریوں اور علمائے دین نے انگریزی اور عربی سے ترجمے کے میدان میں

گرانقدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ دیگر مذاہب کے بھی اردو میں ترجمے ہوتے آئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک عام آدمی تک خدا کا کلام اور پیغام خود اس کی زبان میں پہنچایا جائے۔ یا پھر مذہبی تراجم بہت سے مترجمین کی روحانی ضرورت بن گئے ہیں۔ اس طرح کے تراجم میں اصطلاحات کا وضع کرنا اور ان کا برمحل استعمال کرنا کارِ شیشہ گراں سے کم نہیں۔ یہاں دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک اصطلاح کے لیے مترادف اصطلاح کی تلاش' دوسرے زبان کی تحدیدات کا لحاظ۔ تھوڑی سی بھی لغزش مترجم کے شخصی اور علمی مرتبے اور وقار کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ الفاظ' تراکیب اور اصطلاحات کا انتخاب مترجم کی لیاقت اور پرکھ کی دلیل ہوتا ہے اردو میں مذہبی ترجمے اور اصطلاحات کے استعمال کی بہترین مثال مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ ''معرکہ مذہب و سائنس'' ہے۔ جس میں انہوں نے مذہب اور علمی تراجم و اصطلاحات کے انتخاب و استعمال میں باریک بینی اور تہہ داری کا خوب خیال رکھا ہے۔ مذہبی تراجم میں فارسی اور عربی سے مدد لیے بغیر چارہ نہیں' کیوں کہ وہ ہمارے مذہبی مزاج کی غماز زبانیں ہیں۔

5.5.2 علمی تراجم

اس ذیل میں تمام سائنسی علوم کی کتابیں آتی ہیں۔ علمی تراجم میں اصل زبان کی اصطلاحات کے مترادفات کو ترجمے کی زبان میں ڈھونڈ کر لانے کی اہمیت ہے' بشرطیکہ وہ پہلے سے موجود ہوں ورنہ اس مخصوص موضوع سے متعلق اصطلاحوں کو مترجم کو خود بنانے کی زحمت کرنی پڑتی ہے۔ اصطلاحات کے تراشنے میں اصل لفظ کے انتخاب' صحیح سابقے اور لاحقے وغیرہ میں یکسانیت کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ اصطلاح' اصطلاح کی شان رکھتی ہو صرف یہ نہ ہو کہ مفہوم ادا کر دیا جائے۔ ہر علم و فن کی اپنی مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ دوسرے علوم و فنون کا اصطلاحی لفظ وہی معنی و مفہوم ادا کرے مثلاً (Analogy) منطق کی اصطلاح ہے قوس (Segment) اور اساس یا قاعدہ (Base) ریاضی کی اور استعارہ (Metaphor) علم بیان کی اصطلاحیں ہیں۔ انہیں ہم لسانیات کی اصطلاحات میں شامل نہیں کر سکتے۔ صوتیات (Phonetics)' معنیات (Semantics) لسانیات (Linguistics) کی اہم اور بنیادی اصطلاحیں ہیں۔ انہیں ہم گرامر / قواعد میں شامل نہیں کر سکتے۔ اصطلاحیں فن کے لحاظ سے موزوں و مناسب ہونی چاہئیں مثلاً ثقافت' عمرانیات کی ایک اصطلاح ہے' جس کے لغت میں متعدد معنی ہیں' جیسے عقل مند ہونا' مہذب ہونا' نیک ہونا وغیرہ۔ تاریخ و ثقافت سے متعلق سید علی بلگرامی کے تراجم ''تمدن ہند'' اور ''تمدن عرب'' معرکے کے تراجم ہیں۔

''ببلیوگرافی'' (Bibliography) لائبریری سائنس میں مستعمل انگریزی اصطلاح ہے۔ اس کے ابتدائی لغوی معنی ''تحریر کتب'' یعنی کتابوں کا تحریر کرنا تھا۔ سترہویں صدی کے بعد اس کے مفہوم میں تبدیلی آئی اور کتاب کے بارے میں لکھنا اس سے مراد لیا جانے لگا۔ لائبریری سائنس میں برطانوی مفکر ڈبڈن (T.F. Dibdin) نے پہلی بار کتابیات کو فہرست سازی کے معنوں میں استعمال کیا۔ اس اصطلاح کا استعمال فنِ طباعت اس کی تاریخ اور کتابوں کی تجارت اور انہیں جمع کرنے کے لیے بھی ہوا ہے۔ علمی تراجم میں صحتِ خیال کے ساتھ ساتھ قوت استدلال کا اظہار لازمی ہے۔ لہٰذا اصطلاحات کی صحت اور موزونیت اشد ضروری ہے۔

5.5.3 ادبی تراجم (منظوم)

ادبی تراجم دو طرح کے ہوتے ہیں نثری اور منظوم۔ زندگی جتنی پیچیدہ ہے ادب بھی اتنا ہی پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے۔ ترجمہ بھی ایک خاص ہنر ہے جیسے زندگی بسر کرنا ایک ہنر ہے۔ ترجمے کا ہنر اور فن ادبی ترجمے میں مترجم کے مقام و مرتبے اور صلاحیت کا بھرپور امتحان لیتا ہے۔ دوسرے پیشوں یا ہنروں کی طرح ادبی ترجمہ بھی بڑا ریاض مانگتا ہے۔ ادبی ترجمے بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن ادبی ترجمے میں شاعری کا ترجمہ نہایت ہی دشوار' تقریباً ناممکن امر ہے۔ سر جان ڈینہم (Sir John Deinhan) نے تو اسے محض حماقت قرار دیا ہے۔ کالی داس سے لے کر اقبالؔ' غالبؔ' فیضؔ اور مخدومؔ درجنوں بڑے بڑے شعرا کا کلام کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ منظوم ترجمہ کرنے والوں میں شاعرانہ جوہر ہی وہ عنصر ہے جو ترجمے کی باقی تمام شرطوں کے علاوہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمہ میں خصوصاً اور ادبی تراجم میں عموماً ان احساسات کا اظہار زیادہ اہم ہے' جن کے ذریعے خیالات ادا کیے گئے ہیں۔ شاعری صرف دماغ ہی کو اپیل نہیں کرتی بلکہ انسان کے تمام قوائے احساس کو اپیل کرتی ہے' جن میں احساس جمال بھی شامل ہے۔ اس لیے شاعری میں' جو

ادب کی اہم قسم ہے' الفاظ کی اہمیت صرف معنوی نہیں بلکہ صوتی اور روحانی بھی ہوتی ہے' جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایمرسن کی ایک نظم کا ترجمہ علامہ اقبال نے ''رخصت اے بزم جہاں'' کے عنوان سے پیش کیا ہے' جو منظوم ترجموں میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی خوبی الفاظ و تراکیب اور اصطلاحات کے مترادفات تلاش کرنا ہی نہیں ہیں بلکہ نظم کی روح' جذباتی اور نغماتی زیر و بم کی پیش کشی میں مضمر ہے۔ نظم کا ترجمہ ایک مسلسل عمل ہے' جس میں افکار' جذبات' خیالات اور احساسات بدرجہ اتم شریک ہوتے ہیں۔ شعری ترجمے میں محاوروں' علامتوں' تشبیہوں' استعاروں' کنایوں اور صنعتوں کے مترادفات و ممکنات اور اصطلاحات کی تلاش بھی ایک مشکل امر ہے۔ ان میں سے کچھ کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ گرامر کا بہت سارا حصہ بھی ترجمے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ منظوم ترجمے میں لغت سے مدد تو لی جا سکتی ہے لیکن احساسات و جذبات اور شاعرانہ تہذیب کی عکاسی اولین مقصد ہوتا ہے۔ منظوم ترجمے میں اصطلاح سازی یا اصطلاحات کا استعمال بھی نزاکت اور نفاست کا طلب گار ہے۔ کامیاب ترجمہ وہ ہے' جو اصل کے مطابق ہو اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ فٹز جیرالڈ کی شہرت کا دارومدار عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے پر ہے۔

5.5.4 نثری تراجم

نثر کے ترجمے میں وہ مسائل پیدا نہیں ہوتے' جو شاعری کے ترجمے میں ہوتے ہیں۔ فکشن کا ترجمہ شاعری سے آسان ہوتا ہے۔ اگر زبان پر قدرت ہو اور دونوں زبانوں کے تہذیبی پس منظر پر باقاعدہ نگاہ ہو تو ذرا سی توجہ کے باوصف نثری ترجمے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ترجمہ نثری ہو کہ منظوم' زبان کا اپنا جو مزاج ہوتا ہے' اس سے بھی واقفیت ضروری ہے' ورنہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بعض وقت سنجیدگی باقی نہیں رہتی بلکہ مسخرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ٹیگور کے ایک ڈرامے ''اُچلیاتن'' کا ترجمہ ہوا ہے۔ جس کا عنوان مترجم نے ''لڑکھڑاتا ہوا گھر'' لکھا ہے۔ ''اُچلیاتن'' بنگالی لفظ ہے' جس کے معنی ہیں وہ گھر جس کی دیواریں بوسیدہ یا کمزور ہو چکی ہوں' در و دیوار موجود تو ہیں مگر نہیں معلوم کب ڈھ جائیں۔ لہٰذا اُچلیاتن کا ترجمہ ''لڑکھڑاتا ہوا گھر'' نہایت بھونڈا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ ''گرتا ہوا مکان'' ہوتا تو مناسب ہوتا۔ یہ ایک مثال ہے اُس مترجم کی جو لفظ کے صحیح معنی سے واقف نہیں۔ ادبی ترجمہ چوں کہ ان کتابوں' افسانوں یا ادب پاروں کا ہوتا ہے' جن کے لکھنے والے زبان و ادب کے رمز شناس مانے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کا مترجم بھی اسی مرتبے کا ہونا چاہیے۔ عبدالمجید سالک نے ایک اصطلاح کے ترجمے کی مثال دی ہے۔

There was an explosion in a coal mine, resulting in the death of five persons.

ترجمہ: ''ایک معدنِ زغال میں دھماکہ ہوا' نتیجے کے طور پر پانچ نفوس کی ہلاکت وقوع پذیر ہوئی۔''

ہلاکت وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ محاورے اور روزمرہ کے بجائے مترجم نے مرکب لفظ وقوع پذیر استعمال کیا۔ وہ صرف یہ کہتا کہ ''کوئلے کی کان میں دھماکہ ہوا۔ نتیجتاً پانچ افراد ہلاک ہو گئے۔'' تو صاف صاف ترجمہ ہو جاتا۔

ادبی ترجمہ افکار و خیالات کا ترجمہ ہوتا ہے' جن کا اظہار احساسات کے ذریعے ہوتا ہے۔ ترجمے میں تجربات کی مصوری' محاکات کی عکاسی اور خیالات کو محسوس کرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اصل عبارت میں تصرف بھی کرنا پڑتا ہے۔ غلام السیدین نے موپساں کے ایک افسانے کا ترجمہ ''آخری سبق'' کے عنوان سے کیا تھا۔ اس ترجمے میں اصل کے تاثر کو اردو میں بہ خوبی پیش کیا گیا ہے۔ اختر حسن رائے پوری نے پرل بک کے ناول کا ترجمہ ''پیاری زمین'' میں خیالات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ایسے' جیسے وہ خود یہ ناول لکھ رہے ہوں' اس لیے اس میں روانی آ گئی ہے۔

5.5.5 صحافتی تراجم

صحافتی تراجم میں عموماً آزاد ترجمہ ہوتا ہے' جس میں روایتی موضوعہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ متن کے مفہوم کا ترجمہ سہل ترین ہوتا ہے۔ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان بلکہ اپنے اسلوب میں مطلب بیان کر دینا ہوتا ہے۔ اس میں ایک سہولت یہ ہے کہ طویل اور مرکب جملوں کو سادہ اور مختصر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنے مضمون ''فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات'' میں لکھتے ہیں۔

''اخباری ترجمہ میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے۔''

مرزا حامد بیگ لغت سے مدد لینے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اخباری ترجمے میں ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لی جاسکتی ہے۔ صحافتی ترجموں میں دن بدن سیاست و معاشرت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف نہ ہوں تو بڑی مضحکہ خیز غلطیاں سامنے آتی ہیں' یعنی صحافتی مترجم کو صحافت کی مختلف اصطلاحات اور لفظیات سے کما حقہٗ واقف ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست' معاشرت' کھیل' قانون اور جرائم کی دنیا سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ آج کے زمانے میں صحافت کا میدان بھی خاصا وسیع ہو گیا ہے۔ اسی حساب سے نئی نئی اصطلاحات کی بھی ضرورت پڑنے لگی ہے۔ صحافتی ترجمے کی بدولت ہماری زبان میں صفائی اور روانی آ گئی ہے۔ نئے نئے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ ان تراجم کے باوصف ہم نے واقعیت کے اظہار پر قابو پالیا ہے۔ سچی تلی بات کرنے کا سلیقہ' رواں دواں تحریر اور اصلیت سے مطابقت پیدا کرنے کا ڈھنگ آ گیا ہے۔ اخباری ترجمہ نفس مضمون ادا کرنے سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں ادبیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صحافتی ترجمہ روزمرہ کی زندگی سے قریب ہوتا ہے۔ زبان کو نئے پیرائے اظہار سے متعارف کرتا ہے۔ اصطلاحات کو وقعت بخشتا ہے اور اس میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ بعض اوقات صحافتی تراجم ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ظفر علی خاں نے بیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی' معاشرتی' علمی اور مذہبی اصطلاحیں وضع کر کے صحافت کے میدان میں اہم کام انجام دیا ہے۔ جن میں سے بعض انتہائی بھاری بھرکم اور بعض انتہائی برجستہ اور ہلکی پھلکی ہیں' لیکن ان کے زورِ قلم نے ہر دو قسم کی وضع کردہ صحافتی اصطلاحوں کو عام کر دیا ہے۔ جیسے دھرنا' ہڑتال' مرن برت' تانا شاہی' گھٹالا' تجویز' رابطہ' جرمانہ' حلف وفاداری' دائرۂ اختیار' اعزازی' غیر قانونی' عدم مساوات' ہنگامی' دستاویز' چالان' ضمانت' مچلکہ وغیرہ وغیرہ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علمی تراجم کے دوران اصطلاحات کے کیا مسائل پیش آتے ہیں؟
2. منظوم تراجم میں اصطلاحات کی کیا مشکل پیش آتی ہے؟
3. صحافتی تراجم کو کس صحافی نے وقار عطا کیا؟

5.6 خلاصہ

زبان کا تہذیب سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ زبان نہ صرف خیالات کا آئینہ ہوتی ہے بلکہ انسانی گروہوں اور قوموں کی زندگی' عادات و اطوار کو محفوظ کرنے کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی اور تحفظ کا ایک بڑا ذریعہ ترجمہ ہے۔ ترجمے کی روایت ہماری زبان میں زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ آج عصری تقاضوں کی وجہ سے ترجموں کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے اس کے اصول و ضوابط مقرر ہوئے ہیں۔ اس کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔

ترجمے کے دوران جہاں مترجم کو کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے' وہیں اصطلاحات سازی کے مرحلے سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اصطلاح کسے کہتے ہیں؟ اس کی کئی طرح سے تعریفیں کی گئیں ہیں۔ ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ کوئی خاص گروہ یا کسی علم و فن کے سلسلے میں کسی مفرد یا مرکب لفظ کو اس کے اصلی یا لغوی معنوں کے سوا کسی اور وسیع تر اور تشریح طلب معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو وہ لفظ اس علم و فن کی اصطلاح کہلاتا ہے۔ ترجمہ خواہ آزاد ہو کہ پابند' نظم کا ہو کہ نثر کا' سائنسی ہو کہ سماجی علوم کا ترجمے کے دوران نہایت ہی سخت اور مشکل مرحلہ اصطلاحات کا آتا ہے۔ اصطلاحات سازی کے بھی اپنے اصول اور قید و بند کے معیار ہوتے ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر اصطلاحات وضع کرنا ممکن نہیں۔ ساتھ ہی جس فن' موضوع یا علم کی اصطلاح وضع کرنا مقصود ہو' اس علم پر بھی اصطلاح ساز کو قدرت حاصل کرنا ضروری ہے۔

5.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی مختصر تاریخ بیان کیجیے۔

2. ترجمے کے عمومی اصول سے بحث کیجیے۔

3. ترجمے کی قسمیں اور اصطلاحات کے مسئلے پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. اصطلاح سازی کے عمومی اصول بیان کیجیے۔

2. نثری تراجم اور منظوم تراجم کی مشکلات کیا ہیں؟

3. صحافتی تراجم نے ہماری زبان کو کس طرح فروغ دیا؟

5.8 فرہنگ

مفتاح العلوم	=	علم کی کنجی
توسیع	=	وسعت، پھیلاؤ
مشتقات	=	وہ الفاظ جو اپنے مصدر سے بنے ہوں (Derivaties)
مزاولت	=	مشق
عہدہ برآ ہونا	=	فرض کو پورا کرنا
عصبیت	=	تعصب
مستحسن	=	قابل تحسین
موضوعہ	=	وضع کی ہوئی، مقررہ

5.9 سفارش کردہ کتابیں

1. وحیدالدین سلیم — وضع اصطلاحات، اورنگ آباد۔ 1921

2. نثار احمد قریشی — ترجمہ۔ روایت اور فن۔ اسلام آباد 1985

3. عطش درانی — اردو اصطلاحات سازی۔ اسلام آباد 1994

4. قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت

اکائی 6 : ترجمے کی روایت واہمیت اور اصطلاحی ولسانیاتی مسئلے

ساخت

6.1 تمہید

6.2 ترجمے کی اہمیت

6.3 اردو میں ترجمے کی روایت

6.4 ترجمہ اور اصطلاح سازی

6.4.1 اصطلاح سازی کے لیے دلی کالج کے مجوزہ اصول

6.4.2 مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کے مجوزہ اصول

6.4.3 سید میر حسن بلگرامی کے مجوزہ اصول

6.4.4 سید وحید الدین سلیم کے مجوزہ اصول

6.4.5 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مجوزہ اصول

6.4.6 اصطلاح سازی کے لیے لسانیاتی اشارے

6.5 ترجمے کے مسائل

6.5.1 کیفیت وشدت اور تہذیبی عناصر کی منتقلی کا مسئلہ

6.5.2 الفاظ، محاوروں اور صنعتوں کے انتخاب کا مسئلہ

6.6 ترجمہ اور لسانی ساخت

6.6.1 ترجمہ اور اسلوبی وتہذیبی پہلو

6.6.2 ترجمہ اور لسانی پہلو

6.7 خلاصہ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.9 فرہنگ

6.10 سفارش کردہ کتابیں

6.1 تمہید

قوموں کے درمیان تعلق اور باہمی اشتراک کے احساس نے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کو پروان چڑھایا۔ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ تعلق و اشتراک بڑھتا گیا لہٰذا ترجمے کی ضرورت کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ترقی یافتہ قوم وملک بننے کے لیے ترقی پذیر قوموں اور ملکوں نے ترقی یافتہ قوموں اور ملکوں کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کیا ہے۔ ترجمے ہی کی مدد سے ملک کے مختلف خطوں کے درمیان ہم آہنگی، قومی یکجہتی، علاقائی سالمیت برقرار رہتی ہے کیوں کہ ترجمے کے توسط سے لوگ ایک دوسرے کے اذہان وقلوب کو محسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں اور اسی کے مطابق ایک دوسرے کے لیے رویے طے کرتے ہیں۔ اس طرح سے کتابیں، جو انسانی فکر وعمل کے ارتقائی مدارج کے مانند ہوتی ہیں، ترجمے کے ذریعے اقوام عالم کا ورثہ بنتی ہیں اور دیگر اقوام میں نشاۃ الثانیے کا باعث ہوتی ہیں۔

اس اکائی میں ہم ترجمے کی روایت اور اہمیت کے موضوع پر مختصر تاہم جامع روشنی ڈالیں گے۔ نیز ترجمے سے متعلق اصطلاحی اور لسانیاتی مسئلوں پر

گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد اصطلاح سازی سے متعلق مختلف اداروں اور شخصیتوں کے تیار کردہ اصولوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد ترجمے کے کچھ اہم مسائل اور اصطلاح سازی کے لیے لسانیاتی اشاروں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس اکائی میں کیفیت وشدت اور تہذیبی عناصر کی منتقلی کے لیے مناسب لفظوں، محاوروں اور صنعتوں کے انتخاب کے مسئلے پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ آخر میں ترجمے اور لسانی واسلوبی اور تہذیبی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کی سہولت کے لیے اکائی کا خلاصہ، نمونہ امتحانی سوالات، فرہنگ اور مزید مطالعے کے لیے کچھ اہم کتابوں کے نام پیش کیے گئے ہیں۔

6.2 ترجمے کی اہمیت

مختلف قوموں کے درمیان تعلق اور باہمی اشتراک کے احساس نے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کو پروان چڑھایا۔ جیسے جیسے انسانی ذہن ارتقائی مدارج طے کرتا گیا اور مختلف سماجی اور انسانی علوم کی ترویج واشاعت ہماری زندگی کا حصہ بنتی گئی، ترجمہ نہ صرف ہماری علمی ضرورت بن گیا بلکہ ہماری زندگی میں اس کا تصور بھی ناگزیر ہو گیا۔ ترقی یافتہ سماج میں قومیں ایک دوسرے کے تجربات ومشاہدات سے استفادہ کرتی ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں تو صورت حال یہ ہے کہ ترجمے کے بغیر زندگی ادھوری محسوس ہوتی ہے۔ ترجمے کے بغیر ہم اپنے ہم وطنوں کے تہذیبی رویوں سے ناواقف رہتے ہیں۔ ان کی پسند اور ناپسند کو نہیں سمجھ پاتے، ان کی ادبی روایتوں کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کی سماجی زندگی کی انواع و اقسام کی سرگرمیوں سے بہرہ ور نہیں ہو پاتے۔ کثیر لسانی ملکوں میں اگر ترجموں کے ذریعے ایک دوسرے کو نہ سمجھا جائے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ لایا جائے تو قومی یکجہتی، علاقائی سالمیت اور سماجی آسودگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ آج گلوبلائزیشن کے تصور نے بنی نوع انسان کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ یہ ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہے۔ ترجمے کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے ہی ہماری یونیورسٹیوں میں اس طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ ترجمے کے شعبے اور ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور خود یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اس سلسلے میں مالی معاونت کر رہی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کی کیا اہمیت ہے؟
2. کثیر لسانی ممالک میں ترجمہ کیوں ناگزیر ہے؟
3. آج ترجمے کی ضرورت کیوں زیادہ محسوس ہو رہی ہے؟

6.3 اردو میں ترجمے کی روایت

اردو میں باقاعدہ ترجمے کی روایت دو ڈھائی سو برس پرانی ہے۔ اس کا آغاز قرآن شریف کے ترجمے اور بزرگوں کے اقوال وہدایات سے ہوا تھا۔ مدرسہ غازی الدین (قیام: 1792ء)، جو بعد میں ترقی کر کے اورینٹل کالج دہلی بنا، میں علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے تحت ترجمے کرائے گئے۔ یہاں شعبۂ مشرقیہ میں سنسکرت، عربی و فارسی کے علاوہ سماجی علوم اور جدید مغربی سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ ترجمے کا کام دہلی کالج، ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی سرپرستی میں ہوتا تھا۔ آل احمد سرور کی تحقیق کے مطابق یہاں 117 کتابیں ترجمے اور تصنیف وتالیف کے ذریعے تیار کرائی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (قیام 1800ء) میں اردو زبان وادب اور اس کے علمی وتعلیمی میدان میں ترجمے کے ذریعے ہی ایک انقلاب آیا۔ وہاں پرانے قصے کہانیوں کو لے کر ہی کتابیں لکھی گئیں۔ ترجمے ہوئے اور تاریخ پر بھی کتابی شکل میں کئی بڑے کام ہوئے۔ اس سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ (قیام: 1863ء) کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، جو سر سید احمد خاں کے ذریعے پروان چڑھی۔ سوسائٹی کی علمی مجلس، جسے کونسل مشیر کہتے تھے، نے مختلف موضوعات سے متعلق 48 کتابوں کے تراجم کی تجویز پیش کی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ نے نیچرل سائنس، ٹکنالوجی، پولیٹیکل اکانومی اور ہندوستان، یونان، جاپان، چین اور مصر وایران کی تاریخ پر تقریباً 17 کتابیں شائع کیں۔ سر سید احمد خاں نے سوسائٹی کے مقاصد کو سائنسی علوم کے اردو تراجم تک محدود رکھا۔ انجمن ترقی اردو (قیام: 1903ء) کے مقاصد میں اردو زبان کو فروغ دینا، اردو میں جدید علوم پر تصنیف وتالیف کا کام کرنا، دنیا کی اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کرانا، تحقیق کے سائنٹفک

اصولوں کی مدد سے اردو کے کلاسیکی سرمائے کو ترتیب دینا وغیرہ اہم مشاغل شامل تھے۔ یہاں ایک بڑا نام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کا آتا ہے، جہاں دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام 1917ء میں عمل میں آیا۔ جامعہ عثمانیہ میں قدیم وجدید، مشرقی ومغربی علوم وفنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر دارالترجمہ میں نصاب کی تیاری کے لیے تصنیف وتالیف کا کام شروع ہوا۔ عربی وفارسی اور انگریزی وغیرہ سے متعدد کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ اصطلاح سازی کے لیے کمیٹی بنائی گئی، جس کی سفارشات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہزاروں نئی نئی اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ یہاں لکھنؤ کی رسدگاہ کے ایک کارکن مولوی کمال الدین کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، جنھوں نے رسدگاہ کے ناظم کرنل ویکاک کی نگرانی میں کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا، جو ہیئت، حرارت، طبیعیات، ریاضی، مقناطیس، کیمیا وغیرہ پر مشتمل تھے۔ انجمن پنجاب اور اورینٹل کالج لاہور نے بھی متعدد علمی، ادبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کرکے انھیں شائع کیا ہے۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے زیر نگرانی اردو کی ترقی اور بقا کے لیے ترقی اردو بیورو قائم ہوا (قیام: 1971ء) جو آج قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں تعلیم، ادب، سائنس اور دوسرے جدید علوم کی کتابوں کی تیاری اور ان کی اشاعت کے علاوہ ترجمے کا کام بھی ہوتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام پر ترجمے کے ذریعے اردو میں جو علوم متعارف ہوئے ان میں تاریخ، تصوف، فلسفہ، علم نجوم، علم ہیئت، مذہب و اخلاقیات، جغرافیہ، علم حیات، طب اور زبان وادب اہم ہیں۔ اردو کا عربی، ترکی، فارسی اور سنسکرت سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ترجمے کے راستے سے ہمارے یہاں مشرقی علوم داخل ہوئے سماجی علوم کی دوسری شاخیں اور Pure و نیچرل سائنس جن کی ابتدا دلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ سے ہوئی تھی، انگریزی سے جدید مغربی علوم کی تعلیم کے لیے کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر نے 1845ء میں قدیم وجدید سائنسی علوم کو نصاب میں شامل کرکے متعدد کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً الجبرا، علم مثلث، تحلیل مستوی، علم ہیئت، ریاضیات، جغرافیہ، علم اقلیدس، معاشیات، طبیعیات، جراحی، حرکیات، نباتیات، سکونیات، علم کیمیا اور طبیعیات وغیرہ۔ سائنس، طب، ٹکنالوجی، زبان وقواعد اور اصطلاح سازی کی تبلیغ واشاعت میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اس سلسلے کو دارالترجمہ عثمانیہ اور جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (دکن) نے انتہا پر پہنچایا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے ان اداروں کے نام بتائیے جو انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں ترجمے کے مراکز تھے۔
2. سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ کب اور کیوں قائم ہوئی؟
3. انیسویں صدی میں ترجمے کے ذریعے اردو میں کون کون سے علوم متعارف ہوئے؟
4. دارالترجمہ عثمانیہ کب اور کہاں قائم ہوا؟

6.4 ترجمہ اور اصطلاح سازی

کسی بھی موضوع یا قسم کا ترجمہ ہو، ترجمہ کرتے وقت سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ مزید شدت اس وقت اختیار کرلیتا ہے، جب ہم مختلف درجوں کے لیے ایسے نصاب تیار کررہے ہوتے ہیں جو ہمارے لیے بالکل نئے ہوتے ہیں۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نئے نئے ادارے قائم ہوئے، وضع اصطلاحات کے اصول مرتب ہوئے اور ماہرین علوم اور اساتذہ کے مشوروں، ہدایتوں اور سفارشوں کی روشنی میں یہ کام انجام کو پہنچا۔ اس سلسلے میں اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ جیسے Society of knowledge in India through the medium of vernacular languages، انجمن ترقی اردو Institute of Scientific Society, Aligarh، دارالترجمہ عثمانیہ، حیدرآباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) وغیرہ۔ اس موضوع پر اردو میں کئی رسالے شائع ہوئے اور باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں گئیں۔ جن میں وضع اصطلاحات کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں ''اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ'' عبدالحق، فرہنگ اصطلاحات علمیہ، انجمن ترقی اردو ہند، اصطلاحات علم جدیدیہ، عثمانیہ یونیورسٹی، اصول وضع اصطلاحات، سید حسن بلگرامی اور وضع اصطلاحات وحیدالدین سلیم خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

6.4.1 اصلاح سازی کے لیے دلی کالج کے مجوزہ اصول

اصطلاح سازی پر سب سے پہلے باقاعدہ کام دلی کالج میں شروع ہوا۔ کالج کی مجلس ترجمہ کے اراکین نے سماجی علوم اور سائنس کی اصطلاحیں وضع کرتے وقت حسب ذیل باتوں کو پیش نظر رکھا۔

- اگر سائنس کے کسی ایسے لفظ کا مترادف اردو میں نہ ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہے تو وہ بجنسہٖ انگریزی سے مستعار لے لیا جائے، جیسے سوڈیم، کلورین وغیرہ۔
- سائنس کے کسی ایسے لفظ کا ہم معنی لفظ جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہے اگر اردو میں ہے تو اسے استعمال کیا جائے، جیسے آئرن کی جگہ لوہا وغیرہ۔
- اگر لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں جزو اردو میں نہیں ملتے تو اس لفظ کو بجنسہٖ اردو میں استعمال کیا جائے، جیسے ہائی ڈروجن، ایٹم وغیرہ۔
- اگر لفظ مرکب ہے اور اس کے دونوں جزو کے الگ الگ مترادف اردو میں ملتے ہیں تو انہیں ملا کر انگریزی لفظ کے مترادف اردو میں استعمال کیا جائے: جیسے ایروپلین کی جگہ ہوائی جہاز وغیرہ۔
- مرکب لفظ میں ایک جزو کا مترادف اردو میں موجود ہے اور دوسرے کا نہیں تو انگریزی سے دوسرے جزو کو لے کر اس میں اردو لفظ ملا کر مرکب بنا لیا جائے۔
- سائنس کا ترجمہ انگریزی سے کیا جا رہا ہے اس لیے دوسری زبان کے بجائے انگریزی سے ہی استفادہ کیا جائے۔
- اصطلاح کا ترجمہ کرتے وقت لفظی ترجمے کے بجائے مفہوم کو لے کر ترجمہ کیا جائے۔
- نباتیات کی اصطلاحوں کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ اس لیے انگریزی سے استفادہ کیا جائے، جس میں درختوں کی انواع کے نام یا تو اس نوع کے خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا نوع کی بعض مشترک خصوصیات کی بنا پر۔ اس قاعدے کی پابندی اردو میں بھی کی جانی چاہیے۔

6.4.2 مرکزی مشاورتی بورڈ برائے تعلیم کے مجوزہ اصول

Central Advisory Board of Education کے سامنے جب اصطلاحات کا مسئلہ آیا تو اس نے تجویز کیا کہ سارے ہندوستان کے لیے سائنس کی مشترکہ اصطلاحیں وضع ہوں۔ ان اصطلاحات کا مشترکہ اور بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات ہوں جو بجنسہٖ اختیار کر لی جائیں۔ اس بورڈ نے یہ بھی تجویز کیا کہ اصطلاحات کے لیے ہر ہندوستانی زبان میں تین خاص درجے ہونے چاہئیں:

الف) بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات پر مشتمل ہو۔

ب) ہر ہندوستانی زبان میں بہت تھوڑی تعداد اُسی زبان کے ایسے الفاظ کی ہو جو اس زبان سے متعلق ہوں۔

ج) سنسکرت اور دراوڑی خاندان کی زبانوں کے لیے سنسکرت کی اصطلاحیں اختیار کر لی جائیں۔ اور پراکرت زبانوں یعنی اردو، پشتو، سندھی کے لیے عربی و فارسی زبانوں سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن ایسی اصطلاحوں کی تعداد کم ہو۔

اسی غرض کے لیے ایڈوائزری بورڈ نے ایک کمیٹی بنائی، جس کا جلسہ 15/اکتوبر 1940ء کو حیدر آباد میں منعقد ہوا۔ اس میں صوبوں کے ڈائرکٹر تعلیمات، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور کچھ سائنس داں شریک تھے۔ کمیٹی کی تجاویز یہ تھیں:

- بین الاقوامی اصطلاحات تمام ہندوستان کی سبھی زبانوں میں یکساں استعمال ہوں۔
- جنرل ایجوکیشن کی خاطر ہر ہندوستانی زبان کی مخصوص اصطلاحوں کو معروف اور مروج ہونے کی وجہ سے قائم رکھا جائے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نئی اصطلاحیں وضع ہوں۔
- ایسے بورڈ مقرر کیے جائیں، جو ہندوستانی اور دراوڑی تقسیم کی بنیاد پر زبانوں کے لیے مشترک اصطلاحیں وضع کریں۔

- یکسانیت کی خاطر نصاب کی کتابوں میں ایک ہی اصطلاح استعمال ہو۔
- یکسانیت قائم رکھنے کے لیے اردو میں ریاضی کے سوالات اور مسئلے بائیں سے دائیں لکھے جائیں۔

6.4.3 سید میر حسن بلگرامی کے مجوزہ اصول

سید میر حسن بلگرامی نے انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ڈاکٹر عبدالحق کی درخواست پر ''اصولِ وضع اصطلاحات'' میں اصطلاح سازی کے چند اصول مرتب کیے ہیں، جنہیں اصطلاحات وضع کرتے وقت پیش نظر رکھنے کی تجویز کی گئی ہے۔

یہ اصول حسب ذیل ہیں:

- ایسی اصطلاحیں وضع کی جائیں، جن سے حافظے پر کم زور پڑے۔
- عربی و فارسی کی مروجہ اصطلاحوں کو قائم رکھا جائے۔
- نئی اصطلاحوں کے لیے حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی اور پھر انگریزی سے مدد لی جائے۔
- ثقیل تلفظ والی اور بڑی ترکیبوں والی اصطلاحوں سے گریز کیا جائے۔
- اصطلاح وضع کرتے وقت اضافت اور واوِ عطف سے کام لیا جائے۔
- عربی و ہندی کے ٹھیٹ یعنی خالص الفاظ سے گریز کیا جائے۔
- جہاں دو یا تین لفظوں کو ملا کر ایک مرکب اصطلاح بنانا مقصود ہو، وہاں اس قدر تصرف کیا جائے کہ ہر لفظ کی ایک دو آوازیں حذف ہو جائیں تا کہ اختصار بھی آئے اور لفظوں کی اصل شکل بھی قائم رہے۔
- اسم سے فعل بنالینا ایک قسم کا تصرف ہے، جس سے اصطلاح بناتے وقت کام لیا جا سکتا ہے۔

6.4.4 سید وحیدالدین سلیم کے مجوزہ اصول

اصطلاح سازی کے سلسلے میں ایک بڑا اہم کام وحیدالدین سلیم کا بھی ہے۔ جنہوں نے اصطلاحات کے مسائل اور اصول وضوابط پر ایک مستقل کتاب ''وضع اصطلاحات'' کے نام سے لکھی، جو اردو میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں سادہ اور مرکب اصطلاحوں کے مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے خیالات سے دارالترجمہ عثمانیہ میں اصطلاح سازی کے وقت کافی مدد لی گئی۔ وحیدالدین سلیم، انگریزی الفاظ کا اردو ترجمہ کرتے وقت انہیں چھے حصوں میں بانٹنے کی، سفارش کرتے ہیں۔ پہلی قسم ان معمولی الفاظ کی ہے، جو بطور اصطلاح استعمال ہوئے ہیں۔ ایسے الفاظ اردو میں ترجمہ ہونے چاہئیں۔ دوسری قسم میں ایسے جامد اسما اور مختلف چیزوں کے نوعی نام آتے ہیں، جو نہایت عام فہم ہیں، لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی وجہ سے انہوں نے اصطلاحی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایسے الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انہیں موزوں بنایا جائے۔ تیسری قسم میں سائنس کی اشیا کے غیر اشتقاقی نام آتے ہیں۔ ابتدا میں جب ایسے نام وضع کیے گئے، تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لیے استعمال کیے گئے، ان کی وہ خاصیت ظاہر نہیں کرتے تھے، لیکن ان میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنی عرصۂ دراز سے مفقود ہو گئے۔ یہ الفاظ دوسرے درجے کے جامد لفظ بن گئے۔ ایسے الفاظ کا ترجمہ نہ کر کے ان کی املا خاص قواعد کی پابندی کے ساتھ لکھی جائے۔ چوتھی قسم میں نباتات وحیوانات کے مرکب علمی ناموں کو شمار کیا جا سکتا ہے جو ابتدا میں اشتقاقی معنی رکھتے تھے۔ لیکن اب یہ کیفیت نہیں رہی، لہٰذا تیسری قسم کی طرح انہیں بھی جامد اسما تصور کیا جائے اور انہیں اردو میں جوں کا توں رکھا جائے۔ پانچویں قسم میں مفرد الفاظ کو رکھا گیا ہے، جن کے اشتقاقی معنی صاف وصریح ہوتے ہیں اور اسی حد تک کارآمد ہیں، جس حد تک سامع پر اشتقاقی معنی بخوبی واضح کریں، کیوں کہ یہ الفاظ علوم وفنون میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں خالص اصطلاحی الفاظ سمجھا جائے اور ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے موزوں بنایا جائے۔ چھٹی اور آخری قسم میں وہ مرکب الفاظ شامل کیے گئے ہیں جس کا ہر جزو کم از کم ایک اور اکثر

حالتوں میں کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنی ضرور رکھتا ہے۔ یہی معنی ان اصطلاحوں کی جان ہوتے ہیں اور ایسے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے۔ لیکن آلات کے ناموں کا صرف املا ہی زبان میں لکھا جائے۔

6.4.5 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مجوزہ اصول

یہاں آ کر اصطلاح سازی کا پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔ آزادی کے بعد نیا اندازِ فکر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات' اردو زبان پر بھی مرتب ہوئے' جس کی وجہ سے اردو کے معاملات دو حصوں میں بٹ گئے۔ پاکستان سے قطع نظر ہمارے یہاں اردو کے سلسلے میں جو بڑے کام ہوئے ہیں' ان میں ایک اصطلاح سازی بھی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (پچھلا نام : بیورو فار پروموشن آف اردو) کے زیر اہتمام مختلف ماہرین کی ایسی 18 کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں' جو قدیم و جدید تمام انسانی علوم کی اصطلاحیں وضع کر چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہاں مختلف علوم کی اس وقت تک تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار اصطلاحیں وضع ہو چکی ہیں۔ وضعِ اصطلاحات کے پرانے اصولوں اور جدید عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصطلاحات وضع کرنے کے سلسلے میں جو اصول و ضوابط پیش نظر رکھے گئے ہیں' یہاں ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

- ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دی جائے' جو مروج یا مقبول ہو چکی ہیں' خواہ ان میں کوئی معنوی یا لسانی سقم ہی کیوں نہ ہو۔
- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زیادہ معنوں میں مستعمل ہے تو اس کے مختلف مفاہیم کو علاحدہ علاحدہ الفاظ میں اصطلاح سے واضح کرنا چاہیے۔
- اصطلاح اور عام لفظ میں فرق کیا جانا چاہیے۔ تمام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔
- ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے بشرطیکہ وہ اصول نمبر دو میں نہ آتا ہو۔
- جہاں تک ممکن ہو اصطلاح یک لفظی ہونی چاہیے۔ ناگزیر صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہے' مگر ایسی اصطلاحیں کم وضع کی جائیں۔
- ہندی اصطلاحوں کو عربی اصطلاحوں پر ترجیح دی جائے اگر وہ با آسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکیں۔
- اگر کسی اصطلاح کو ایک سے زیادہ الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کی ضرورت پیش آئے' تو حسب ذیل تراکیب کو نیچے دی ہوئی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کیا جائے۔

  1. وہ ترکیبات جن میں اضافی یا حروفِ ربط و جار کے الفاظ و علامات نہ ہوں
  2. وہ ترکیبات جن میں ہائے نسبتی ہیں۔
  3. وہ ترکیبات جن میں اضافت ہو۔ اگر ان میں ایک سے زیادہ اضافتیں ہوں' تو ان میں سے کم از کم ایک کو 'کا' 'کی' 'کے' سے بدل دیا جائے۔
  4. وہ ترکیبات جن میں 'کا' 'کی' کے استعمال کیے گئے ہوں۔

- اگر کوئی اصطلاح ایک سے زیادہ علم یا فن میں مشترک ہے اور سبھی علوم میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے' تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے گا۔
- اصطلاح کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادگی ہونی چاہیے کہ ہندی' عربی' فارسی اور پراکرت تراکیب بھی قابلِ قبول ہوں۔
- اگر انگریزی اصطلاح مروّج ہو یا عام فہم ہو تو اسے برقرار رکھا جائے۔

6.4.6 اصطلاح سازی کے لیے لسانیاتی اشارے

کسی علمی یا تکنیکی مضمون کے ترجمے میں بنیادی مسئلہ اصطلاحوں کا ہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات اصطلاحوں کو ہم بے دریغ مستعار لے کر حاشیوں میں

ان کی تشریح کر دیتے ہیں۔ اگر اصطلاحیں زبان کے صوتی و صرفی مزاج کے مطابق ہیں اور عبارت میں ثقالت کو نہیں بڑھنے دیتیں، تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ کھڑا ہو سکتا ہے کہ اپنی وقتی ضرورت کے تحت ہم جو اصطلاح اپنا لیتے ہیں، اس قبیل کے معنوں کے لیے جب مختلف اشتقاقی عمل رکھنے والی اصطلاحیں آئیں گی تو کیا انہیں بھی جوں کا توں مستعار لیا جائے گا؟ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ پوری اصطلاح کے بجائے ہم اس کی ساق (Stem) کو ہی مستعار لیں اور مستعار لینے والی زبان کے مروج سابقے اور لاحقے ہی اس میں استعمال کریں، مثلاً انگریزی کی لسانیات کی ایک اصطلاح Morph کو لے کر اس کے سیاق میں لاحقوں اور سابقوں کی مدد سے متعدد اصطلاحیں بنائی گئیں ہیں۔ جیسے:

Morph > Morpheme > Allomorph > Morphemics > Morphology > Morphological > Morphologically > Morphophomemics > Morphenization

اس طرح اردو میں Morph یا Morpheme کو مستعار لے کر اردو سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے ان اصطلاحوں کے متبادل اختراع کیے جاسکتے ہیں: جیسے مارف > مارفیم > ذیلی مارف > مارفیمیات > علم مارفیم > مارفیمیاتی > مارفیمیاتی طور پر > مارف فونیمیات اور مارفیمیانہ وغیرہ۔ یہاں بہتر یہ ہوگا کہ ایک ساق کو لے کر اس سے جڑی جتنی اصطلاحیں ہیں، انہیں جمع کر کے چھوٹی چھوٹی بامعنی اکائیوں میں بانٹ لیا جائے اور ان کے متبادل اردو میں تلاش کر کے اصطلاحیں بنائی جائیں۔ جیسے

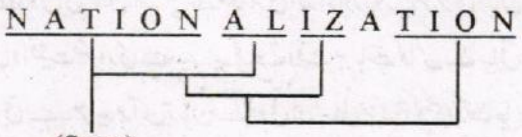

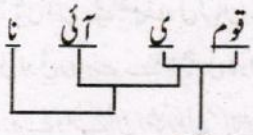

اصطلاحات وضع کرنے میں بعض دوسری قسم کی دشواریاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر لسانیات کی اصطلاحات کو لیجیے۔ اس علم کے کسی موضوع کو لے کر اس کا ترجمہ کرنے بیٹھیں تو جگہ جگہ ہمیں سوچنا پڑے گا، کیوں کہ ہماری زبان اس علم سے قطعی بے بہرہ ہے۔ الفاظ کی ساخت کو زیر بحث لاتے وقت Root اور Stem کے لیے ہم حسب ترتیب مادہ اور ساق استعمال کر سکتے ہیں لیکن Nucleus کے لیے جو مادے اور ساق سے ذرا ہٹی ہوئی چیز ہے، ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی طرح صوتیات میں Concoid اور Vocoid کے لیے مصمتے (Consonant) اور مصوتے (Vowels) کی اصطلاح نہیں رکھ سکتے کیوں کہ یہ وہ مفہوم ادا نہیں کرتے جو پائک نے اختیار کیے ہیں اور اپنی اپنی تعریفوں کے اعتبار سے Consonant اور Vowel سے الگ ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اردو میں اصطلاح سازی کا کام سب سے پہلے کب اور کہاں شروع ہوا؟
2. سید وحید الدین سلیم نے اصطلاح سازی پر کون سی کتاب مرتب کی؟
3. سید میر حسن بلگرامی کا نام اردو میں اصطلاح سازی کے تعلق سے کیوں لیا جاتا ہے؟
4. علمی یا سائنٹفک مواد کا ترجمہ کرتے وقت بنیادی مسئلہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟
5. اصطلاح سازی کے پانچ بنیادی اصول کیا ہیں؟

6.5 ترجمے کے مسائل

دراصل ترجمہ ایک مستقل فن / علم ہے۔ اس کے اپنے اصول و ضوابط ہیں، جو مسائل کی نوعیتوں کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ نفسِ مضمون اپنی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو جائے۔ صحت مند اور کامیاب ترجمہ اسی صورت

میں ممکن ہے، جب ہم (خصوصاً ادبی فن پارے کے تعلق سے) لکھنے والے کے ذہن میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس طرح ہم ان کیفیات اور احساسات سے گزر سکتے ہیں، جو تصنیف کا باعث بنی ہیں۔ اس طرح ترجمہ تحریروں کی روح تک پہنچتا ہے۔ ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح سے پیش کرنا ہے جس سے دونوں قالبوں میں ایک ہی روح رواں دواں محسوس ہو۔ یہاں لباس، جسم اور روح سے مراد ترجمے کی زبان، اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے، جو پڑھنے کے بعد قائم ہوتا ہے ترجمے کے وقت مختلف مسائل سامنے آسکتے ہیں اور ان کی نوعیتیں بھی مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ترجمے کا مواد کیا ہے۔ اگر ترجمہ ادبی شاہکاروں کا ہے تو ہمارے مسائل علمی و تکنیکی مضامین کے ترجمے کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوں گے۔ اول الذکر میں اگر شاعری ہے تو مجموعی تاثر، خیال کی شدت، مرکزی خیال، تخیل کی پرواز، امیجری کی نوعیت، الفاظ کی نشست و برخاست، صوتی آہنگ، بحری تناسب، اسلوب اور ہیئت وغیرہ سبھی کو ساتھ لے کر چلنا پڑے گا۔ نثر میں مرکزی خیال، مجموعی تاثر، سیاق وسباق میں پیوست الفاظ کے معنی اور اصطلاحوں جیسی باتوں پر ہماری خاص توجہ مرکوز ہوگی۔ شاعری اور نثر دونوں میں مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو اہمیت حاصل ہے۔ جن پر مترجم کی گرفت مضبوط ہونی چاہیے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تصنیف و ترجمے کی زبانوں پر ہمیں عبور حاصل ہو۔ شاعری کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے کیوں کہ اس میں مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو پالینا زیادہ مشکل نہیں۔ شاعری کے ترجمے میں شاعر کے دل و دماغ سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان کیفیات و محسوسات اور کرب کو پکڑنا پڑتا ہے جو شعری تخلیق کا باعث بنے ہیں۔ زبان بولنے والوں کی سماجی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار اور رویے مرکزی خیال کو پکڑنے میں رکاوٹ بنتے ہیں، اس لیے تصنیف کی زبان کے مذکورہ پہلوؤں سے مترجم کی واقفیت ضروری ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ہر بات کو اس کے سیاق میں دیکھنا چاہیے۔ زبان کی ادبی روایت سے مترجم کی ناواقفیت بھی ترجمے کو مجروح کر دیتی ہے۔ مزید برآں زبان کے صوتی اور لسانی مزاج کو بھی سمجھنا چاہیے۔ شاعری میں استعمال ہونے والے اُن اشاروں، کنایوں، استعاروں اور علامتوں کی جانکاری ضروری ہے جن میں خیال بن سنور کر سامنے آیا ہے۔ لسانی ساخت کے پیچ وخم پر بھی دسترس ہونی چاہیے۔ ان تمام باتوں کے بغیر ترجمے میں اصل مواد کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو پیش نہیں کر سکتے۔

6.5.1 کیفیت وشدت اور تہذیبی عناصر کی منتقلی کا مسئلہ

ترجمے میں بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے، جب ترجمے کی زبان ان پہلوؤں مثلاً مشاہدات و تجربات، تخیل کی پرواز، خیالات، کیفیات اور احساسات کو پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے جو تصنیف کی زبان میں ملتے ہیں۔ اس کمی کو زبان کے مزاج کے مطابق اختراعی عمل سے یا الفاظ مستعار لے کر پورا کیا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس زبان کی لسانی توضیحات سے پوری طرح واقف ہوں جس میں الفاظ اختراع کیے جارہے ہیں یا مستعار لیے جارہے ہیں، تصنیف کی زبان میں بھی یہ واقفیت ضروری ہے۔

مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کے علاوہ ترجمے میں تیسری اہم چیز ''شدت'' ہے یعنی جس نوعیت و کیفیت کے ساتھ فنکار نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں تقریباً وہی بات ترجمے میں آنی چاہیے۔ ورنہ وہ ترجمہ ناقص ہوگا۔ اس کے لیے الفاظ کا موزوں انتخاب اور مستحسن استعمال ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب الفاظ کے معنی کو سیاق وسباق میں جکڑ دیا جائے۔ اس طرح ترجمے کی زبان کے الفاظ کے معنی و مطالب اپنے استعمال سے ایسا ہی مفہوم ادا کریں گے جیسا کہ ترجمہ ہونے والی تحریر چاہتی ہے۔ تشبیہوں، استعاروں، علامتوں اور پیکر تراشی کا بھی خاطر خواہ ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ اصل تحریر و تخلیق اپنی ''شدت'' کی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ سامنے آسکے۔

6.5.2 الفاظ، محاوروں اور صنعتوں کے انتخاب کا مسئلہ

ترجمے میں الفاظ کا صحیح انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہوسکتی ہیں۔ اس عمل سے گزرتے وقت خصوصاً شاعری میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ہر لفظ، معنی کے اعتبار سے ایک دائرہ بناتا ہے۔ اس لیے یہ دائرے ترجمے میں اصل کے جتنے قریب ہوں گے، ترجمہ اتنا ہی اصل کے مطابق ہوگا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترجمے کے وقت زبان میں وہ لفظ نہیں ملتے جنہیں کسی خیال کی

ادائیگی کے لیے ہم ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔اس صورت میں زبان کی ساخت سے مطابقت رکھنے والے لفظ کو کسی قریبی زبان سے مستعار لے سکتے ہیں۔یہ بھی ممکن ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے کسی لفظ کو اپنالیں۔بہر حال جو بھی صورت ہو یہاں ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کی انفرادیت، مزاج، صوتی آہنگ اور گردانوں میں وہ لفظ لسانی مزاج کے اعتبار سے زبان میں اپنی اجنبیت برقرار نہ رکھے۔یہاں مناسب ہوگا کہ سادہ (Simple) الفاظ ہی مستعار لیے جائیں تاکہ ضرورت پڑنے پر ان کے مادوں سے پیچیدہ (Complex) یا مرکب (Compound) الفاظ وضع کیے جاسکیں۔یہ ترجمہ کی زبان کے عین مطابق ہوگا۔

ترجمے کے وقت سیاق وسباق کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ یہی واحد طریقہ ہے، جو لفظ کے صحیح معنی یا متن کا صحیح مفہوم ہم تک پہنچاتا ہے۔انگریزی لفظ ہاؤس (House) کا اردو میں ترجمہ کرنا بہت آسان ہے یعنی گھر یا مکان لیکن انگریزی میں یہ لفظ انفرادی طور پر یا دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر تحریر میں الگ معنی بھی دیتا ہے۔اب یہ سیاق وسباق ہی بتائے گا کہ عبارت میں لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔انگریزی کے اس لفظ ''ہاؤس'' کے مختلف استعمال اور معنی کو ذیل میں دیکھیے :

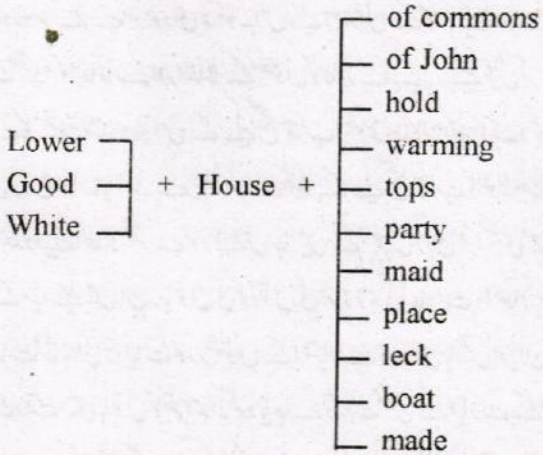

اسی طرح اردو میں رہنے کی جگہ کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں، جن میں معنی کے بڑے لطیف فرق موجود ہیں، جیسے گھر، مکان، جھونپڑی، کٹیا، محل، حویلی، رہائش گاہ اور دولت کدہ وغیرہ۔اب یہ سیاق وسباق ہی طے کرے گا کہ عبارت میں کہاں کون سا لفظ آئے گا کیوں کہ ہر لفظ میں رہنے کے الگ الگ معنی پوشیدہ ہیں۔کبھی کبھی الفاظ کردار سے منسوب ہوتے ہیں۔اس لیے یہ ترجمے کے وقت ہی طے ہوگا کہ کہاں کس لفظ کا کیا ترجمہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر ہندی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت اگر یہ جملہ ہے کہ ''سمراٹ اشوک نے پرستھان کا آدیش دیا'' تو اس کا مناسب ترجمہ 'شہنشاہ اشوک کے بجائے 'سمراٹ اشوک نے کوچ کا حکم دیا' ہوگا۔یہاں اشوک کی رعایت سے شہنشاہ کے بجائے سمراٹ لفظ ہی زیادہ درست ہے۔عام طور پر رسم ورواج، تیوہار، لباس اور مکانوں وعلاقوں کے نام کا ترجمہ نہیں ہوتا اور حاشیوں میں ان کی تشریح کردی جاتی ہے۔یہ اسی صورت میں مناسب رہے گا جب دونوں زبانوں کے معاشروں میں بڑا فرق ہو۔مثال کے طور پر عصمت چغتائی کے ''چوتھی کا جوڑا'' کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت ہمیں کچھ اس طرح کی حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا ترجمہ کرتے وقت کوئی خاص دقت نہیں ہوتی سوائے اس وقت کے جب وہ ترجمہ ہونے والی زبان میں نہ ملیں یا اس میں بے معنی ہوں۔زبان بولنے والوں کے رجحانات، کیفیات اور سوچنے کے انداز سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان میں کسی تشبیہ یا استعارے سے جو کام لیا جارہا ہے، دوسری زبان میں بھی یہ وہی تاثر یا شدت پیدا کریں۔

شاعری کا ترجمہ کرنا ایک مشکل عمل ہے۔یہاں کئی لغزشیں ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ایک شاعر اپنے اشعار کی تخلیق میں جتنی محنت کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ کاوشیں مترجم کو کرنی پڑتی ہیں۔شاعر کی ''آمد'' کو مترجم ''آورد'' سے گزار کر ''آمد'' بناتا ہے۔اس کے لیے دونوں زبانوں پر گرفت کے علاوہ مترجم اپنے دل ودماغ کے گداز پن کو اس ماحول میں ڈھال لیتا ہے جس میں تخلیق وجود میں آئی ہے۔شاعری کے ترجمے کے وقت مترجم کو شاعر کے Tention, Conflict اور Compromise کو سمجھ لینا چاہیے۔الفاظ کے معنی ومطالب سے صلح کرنے کے لیے مترجم کو جنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور

صوتی تاثر کے لیے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے۔ غرض ایک لمبی تراش خراش اور تلاش و کاوش کے بعد روح کو صحیح قالب ملتا ہے۔ شاعری کے ترجمے کے وقت ہئیت اور فارم کا صحیح فیصلہ کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو میں غزل، نظم، رباعی، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف سخن ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ خصوصیات اور اپنا الگ طرزِ بیان اور فضا ہے۔ ظاہر ہے ہر ادب میں یہ اصناف رائج نہیں ہیں۔ اس لیے ترجمے والی مروج اصناف میں سے کسی ایک صنف کو اپنے مقصد کے لیے اس طرح چننا چاہیے کہ وہ سارے تقاضے پورے کرے۔ شاعری کے ترجمے میں صرف مرکزی خیال کو ہی ظاہر کر دینا کافی نہیں ہے۔ ہمیں وہ تاثر بھی پیش کرنا چاہیے جو اصل کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں قائم ہوا ہے۔ ''زہر عشق'' میں وصیت نامہ کے ترجمے کے بعد مرکزی خیال کے ساتھ اگر وہ تاثر اور شدت ذہن میں قائم نہیں ہوگی جو زبان کے تعلق سے اصل میں قائم ہوئی ہے تو ترجمہ اور اصل دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ترجمے میں ایک خاص پریشانی محاورات کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ہر زبان کے محاورے، بولنے والوں کی روایات اور تہذیبی قدروں کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ جو مفہوم ادا کرتے ہیں ان کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ ایک خاص محاورے کے ذریعے ہم جو کہنا چاہتے ہیں بہت ممکن ہے کہ دوسری زبان میں اس خیال کو ادا کرنے کے لیے کوئی محاورہ سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اس لیے اعتدال سے کام لیتے ہوئے ہمیں محاورے کی جگہ محاورے کی جستجو کے بجائے اپنی ضرورت کے مطابق محاورے کے مفہوم کو الفاظ سے اور الفاظ کے معنوں کو محاورے کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ترجمے کی زبان میں کسی خاص محاورے کا مفہوم ملتا ہے تو اس کے لیے صحیح قالب ڈھونڈھ نکالنا یقیناً ایک دشوار کام ہوگا۔ انگریزی کے قالب میں اردو محاورہ ''بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی'' کی روح اتارنا یا! منہ سے بولو، سر سے کھیلو کے لیے صحیح قالب ڈھونڈھنا مشکل کام ہے۔ اردو میں بیگمات کی زبان کے ساتھ بھی تقریباً یہی بات ہے جہاں متعدد ایسے الفاظ، فقرے اور جملے مل جائیں گے جنہیں روسی، فرانسیسی، جرمن یا انگریزی کے قالب میں ڈھالنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے مقابلے میں ان زبانوں کی عورتوں کی طرز زندگی، عادات و اطوار، سوچنے اور بات کرنے کے انداز قطعی مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ مشرق میں بعض رسومات، خاندانی روایات اور رشتوں کے اعتبار سے بہت سی باتیں اور ان کے بیان کرنے کے انداز ایسے ہیں، جو مغرب والوں سے میل نہیں کھاتے۔ ترجمے کے وقت ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے عبارت کے منتہائے کمال پر اثر پڑے یا وہ فضا ہی قائم نہ رہے، جو اس تحریر کی جان ہے۔ مثال کے طور پر رجب علی بیگ سرورؔ کی ''فسانۂ عجائب'' سرشارؔ کی ''فسانۂ آزاد'' اور عصمت چغتائی کا ''چوتھی کا جوڑا'' کو لیجیے۔ ان نثر پاروں میں اتنی تہذیبی زندگی ہے کہ انہیں مغرب کی کسی زبان میں لانے کے لیے اس زبان کو ''اردو'' بننا پڑے گا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. شعری اور نثری فن پارے کے ترجمے میں کیا فرق ہے؟
2. شاعری کا ترجمہ کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟
3. ادبی ترجمہ، علمی ترجمے سے کیوں مختلف ہے؟
4. کسی لفظ کا ترجمہ کرتے وقت یا اصطلاح وضع کرتے وقت کیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے؟
5. ادبی ترجمہ کرتے وقت سب سے بڑا مسئلہ کہاں پیدا ہوتا ہے؟
6. ''چوتھی کا جوڑا'' کا ترجمہ کیوں ممکن نہیں ہے؟

6.6 ترجمہ اور لسانی ساخت

ترجمے کے دوران بعض اوقات قواعد کے کچھ ایسے بنیادی عناصر پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر جرمن سے اردو میں کسی ترجمے کو لیجیے۔ یہاں اسما کی تذکیر و تانیث مقرر کرتے وقت یہ مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے کہ جرمن کے مذکر، مونث اور Neutral کے فرق اردو اسما میں کس طرح ظاہر کیے جائیں، کیوں کہ اردو میں Neutral جنس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس طرح زمانوں (Tenses) میں Aeorist والے

جملوں کا کیا ہوگا۔ جب کہ اردو میں ماضی، حال اور مستقبل ہی ملتے ہیں۔ تحریر میں کبھی کبھی مکالمے سے وقت کا تعین ہو جاتا ہے۔ جرمن کی طرح اردو میں سلام کے لیے مختلف الفاظ ضرور ہیں، جیسے تسلیم، آداب وغیرہ، لیکن ان سے وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جب کہ جرمن میں مختلف وقتوں کے لیے سلام کے لیے الفاظ موجود ہیں۔ ایسے مسائل سے نمٹنے کے لیے بڑی سوچ کے بعد قدم اٹھانے پڑیں گے۔

6.6.1 ترجمہ اور اسلوبی و تہذیبی پہلو

کسی ادب پارے کے ترجمے کے وقت متعلقہ زبانوں کی ادبیات پر مترجم کی گہری نظر ہونی چاہیے۔ جس مصنف یا شاعر کی تخلیق زیر بحث ہے اس کے دوسرے شاہکاروں سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ مصنف کے اسلوب کی مجموعی خصوصیات بھی ذہن میں ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ دونوں زبانوں میں زبان اور بولی کے فرق کی جانکاری بھی ترجمے میں مفید ہو سکتی ہے، کیوں کہ نثری شہ پارے کے ترجمے کے دوران بہت ممکن ہے کہ مصنف نے اعلیٰ سوسائٹی اور متوسط یا دیہی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہو اور اپنی تحریر میں جگہ جگہ سماج کے ان طبقوں سے مکالمے ادا کروائے ہوں۔ مکالموں کے اس فرق کو زبان اور بولی کے فرق کو سمجھنے کے بعد ہی ترجمے میں صحیح طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور کرداروں کے مکالموں کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔

6.6.2 ترجمہ اور لسانی پہلو

نثری ترجمے میں جملہ، اس کی لسانی ساخت اور اس کے معنی و مفہوم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر جملے کی ساخت کو پوری طرح ذہن میں نہ رکھا جائے تو مفہوم کی روح تو متاثر ہوتی ہی ہے، خود تحریر میں خیال کا تسلسل اور جملوں کے درمیان منطقی ربط ٹوٹ جاتا ہے۔ معیاری نثر میں ہر پیراگراف کا آخری جملہ عام طور پر اس پیراگراف کا نچوڑ ہوتا ہے اس لیے خصوصاً اس جملے کے ترجمے کے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر جہاں جملوں کا مفہوم سمجھ میں نہ آ رہا ہو، جملوں کو چھوٹے چھوٹے بامعنی حصوں میں تقسیم کر کے عمل اور مطابقت کے مطابق جملوں کے معنی و مفہوم کو سمجھنا چاہیے۔ عمل اور مطابقت کو مارفیموں سے لفظوں میں، لفظوں سے فقروں میں اور فقروں سے کلموں یا نیم جملوں میں دیکھنا کارآمد ہو سکتا ہے۔ مثلاً

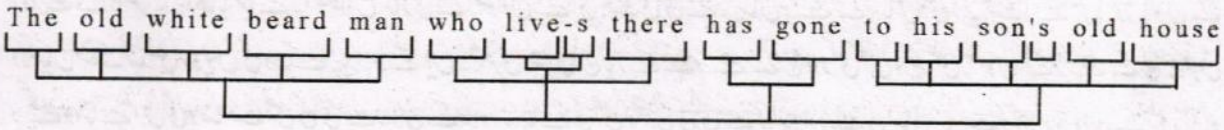

انگریزی کے اس جملے میں مختلف الفاظ، فقرے اور کلمے ملتے ہیں، جنہیں مربع قوسین کی مدد سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ مربع قوسین پہلے ساق اور لاحقوں کی مدد سے تشکیل پانے والے پیچیدہ الفاظ (Complex Words) کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پھر ان الفاظ سے مل کر بننے والے فقروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ اس بات کا بھی پتہ دیتے ہیں کہ فقروں کی ترتیب نیم جملوں یا کلموں میں کیا ہے۔ انہیں مربع قوسین کی مدد سے جملے کی مجموعی ساخت سامنے آتی ہے۔ یہ مربع قوسین جملے میں ہر یونٹ کی مطابقت کو ظاہر کرتے ہیں، جن کی مدد سے ہم با آسانی جملے کے صحیح مفہوم تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہی وہ طریق کار ہے جس سے یہ پتا لگایا جا سکتا ہے کہ ترجمے میں اصل یونٹوں کے مطابق مختلف عملوں اور مطابقتوں کا صحیح تعین ہوا ہے یا نہیں۔ اس طریق کار کی روشنی میں انگریزی کے مذکورہ بالا جملے کا اردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

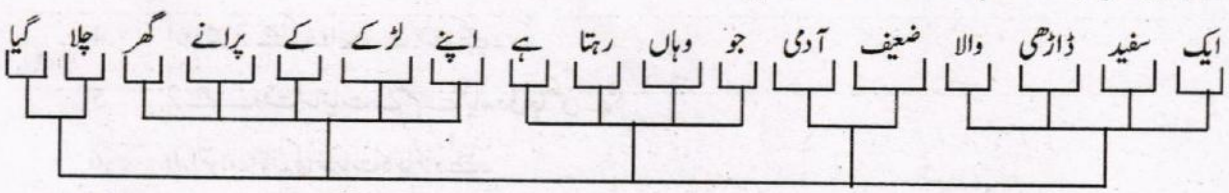

ترجمے کے وقت کبھی کبھی ایسے پیچیدہ فقرے یا نیم جملے سامنے آ جاتے ہیں، جن میں یونٹوں کے درمیان صحیح مطابقت کا پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً انگریزی کا اک نیم جملہ دیکھیے۔

Old man and woman

اس نیم جملے کا ساخت کے اعتبار سے دوطرح سے ترجمہ کیا جاسکتا ہے یعنی بوڑھا آدمی اور (ایک) عورت یا بوڑھا آدمی اور (بوڑھی) عورت۔ ایسی صورت میں صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے یا تو ہمیں پورے جملے کی ساخت کو ذہن میں رکھنا ہوگا یا پھر سیاق وسباق کی مدد سے اس نیم جملے کے معنی طے کرنے ہوں گے۔

انگریزی یا کسی اور زبان سے ترجمے کے وقت کبھی کبھی ہمارا واسطہ مخففات سے بھی پڑتا ہے۔ اس کے بجائے کہ ہم اردو میں ان مخففات کے مخففات بنائیں، مناسب یہ ہوگا کہ پورے پورے الفاظ لکھے جائیں۔ یا ان کے لیے اپنے مخففات طے کریں۔ البتہ ایسے مخففات جو بین الاقوامی حیثیت پا چکے ہیں یا ہماری زبان کی قریبی زبانوں میں رواج پا چکے ہیں انہیں مستعار لے سکتے ہیں، جیسے ٹی۔ وی (ٹیلی ویژن)، یو۔ این۔ او (یونائیٹڈ نیشنس آرگنائزیشن) وغیرہ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے میں لسانیات سے کہاں مدد لی جاسکتی ہے؟
2. اصطلاح سازی میں لسانیات کہاں اور کیسے مدد کرتی ہے؟
3. لفظ اور جملے کو کس طرح چھوٹی چھوٹی بامعنی اکائیوں میں بانٹا جاسکتا ہے؟

6.7 خلاصہ

اس اکائی میں ترجمے کی اہمیت، افادیت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مزید برآں اردو میں ترجمے کی تاریخ کو اصطلاح سازی کی روایت کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ اصطلاح سازی کے اصولوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہاں ترجمے کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، جو زبانوں کے درمیان مختلف تہذیبی رویوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ شعری ونثری فن پارے کے ترجمے کے بیچ اور کسی علمی وغیر علمی مضمون کے ترجمے کے بیچ جو فرق دیکھنے کو ملتا ہے، اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بتانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ لفظ اور جملے کی لسانی ساخت کو سمجھ کر ہی ان کے قطعی معنی و مفہوم تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اس کی چند مثالیں بھی دی گئی ہیں۔

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی اہمیت پر اظہار خیال کیجیے۔
2. ترجمے کے مسائل سے بحث کیجیے۔
3. اصطلاحات اختراع کرنے کے اصولوں سے بحث کیجیے۔
4. اردو میں ترجمے کی روایت سے بحث کیجیے۔
5. ترجمے کے وقت لسانیات کے علم سے کیا مدد لی جاسکتی ہے؟
6. دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. کسی فن پارے کا ترجمہ کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟
2. کثیر لسانی ممالک میں ترجمے کی زیادہ اہمیت کیوں محسوس کی جاتی ہے؟
3. وحیدالدین سلیم نے اصطلاح سازی کے وقت کن سفارشات کا ذکر کیا ہے؟
4. شاعری کا ترجمہ کرتے وقت کن کن باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے؟

6.9 فرہنگ

سقم = خرابی، عیب، نقص، دکھ

ثقالت = گرانی، بھاری پن، بدہضمی کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہونا

ساق = درخت کا تنا، ڈنڈی (Stem)

تصنیف = کتاب لکھنا، مضمون بنانا، طبیعت سے کوئی بات نکالنا

تالیف = دو چیزوں کو باہم ملانا یا جمع کرنا، مختلف کتابوں سے مضامین چن کر نئے پیرائے میں ترتیب دینا۔ دوستی پیدا کرنا

علم نجوم = ستاروں کا علم | علم ہیئت = اجرام فلکی کا علم

طبیعیات = علم الاجسام، فزکس | اشتقاق = ایک لفظ سے دوسرا لفظ بنانا

سکونیات = وہ علم جس میں اجسام حالت سکون سے بحث کی جاتی ہے

نباتیات = پیڑ پودوں کا علم (Botany)

مترادف = دو ایسے الفاظ جن کے معنی ایک ہی ہوں

مفقود = کھویا ہوا، گم کیا ہوا، ناپید، ندارد | صوتی = آواز سے متعلق

صرفی = علم صرف سے متعلق | مخففات = تخفیف کرنا، مختصر کرنا

لاحقہ = پیچھے لگا ہوا، وابستہ، لفظ بنانے کے لیے لفظ کے آخر میں کوئی لفظ بنانا (Suffix)

سابقہ = اگلا، اگلے زمانے کا، معاملہ، وابستہ، لفظ بنانے کے لیے لفظ کے شروع میں کوئی لفظ لگانا (Prefix)

6.10 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر خلیق انجم (مرتبہ) فن ترجمہ نگاری
2. پروفیسر قمر رئیس (مرتبہ) ترجمے کا فن اور روایت
3. اعجاز راہی اردو زبان میں ترجمے کے مسائل
4. نثار احمد قریشی (مرتبہ) ترجمہ: روایت اور فن
5. ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ترجمہ کا فن

اکائی 7 : اردو میں ترجمے کی روایت واہمیت

ساخت

7.1 تمہید

7.2 ترجمے کی اہمیت

7.3 ترجمے کے مقاصد

7.4 مترجم کی ذمے داریاں

7.4.1 آزاد اور لفظی ترجمے کا مسئلہ

7.4.2 معتدل رویہ

7.5 اردو میں ترجمے کی روایت

7.5.1 فورٹ ولیم کالج

7.5.2 ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

7.5.3 سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی

7.5.4 دارالترجمہ عثمانیہ

7.6 ترجمے کے دیگر شعبے

7.6.1 مذہبی لٹریچر کے تراجم

7.6.2 شاعری اور افسانوی ادب کے تراجم

7.6.3 بچوں کے ادب کے تراجم

7.7 خلاصہ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.9 فرہنگ

7.10 سفارش کردہ کتابیں

7.1 تمہید

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان ہے، یعنی وہ صرف سماج ہی میں رہ سکتا ہے۔ سماج سے باہر یا ایک دوسرے پر منحصر ہوئے بغیر تنہا رہنے کا رجحان انسان میں نہیں پایا جاتا۔ سماج میں رہنے کا رجحان اس میں فطرتاً موجود ہوتا ہے، جو دراصل اس بات کا غماز ہے کہ سوچنے سمجھنے اور عقل و دانش رکھنے کی فطری صفت کے سبب وہ اپنے آپ کو جاننا چاہتا ہے اور اپنے وجود کی پہچان وہ اپنے آس پاس موجود لوگوں، ان کے ساتھ رشتوں اور ماحول کے حوالے سے کرتا ہے نیز اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے لین دین اور ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس ضرورت

کے پیش نظر بہت سے ذریعوں میں سے ترجمہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ باشعور یا پڑھا لکھا شخص اپنی شخصیت کو اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنے علاقے، اپنی زبان اور اپنے مذہب کے پس منظر میں پہچانتا ہے۔ اس کے آگے دنیا و مافیہا میں اپنے کو رکھ کر مدلل طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے تشخص اور پہچان کے لیے اس کا بنیادی تجسس یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنی شناخت کو دوسرے لوگوں کے مقابل کر کے خود کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود کو برتر اور ممتاز حیثیت میں دیکھنے کی خواہش اسے دوسرے لوگوں کے بارے میں جاننے کی طرف مائل کرتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو جاننے اور سمجھنے کا تجسس اسے ان کے عادات واطوار، رسم ورواج، تہذیبی قدروں، زبانوں، تاریخوں، جغرافیائی صورت حال اور ماحول کے بارے میں جاننے کی طرف راغب کرتا ہے۔ دوسری اقوام اور ممالک کے بارے میں جاننے کے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں لوگوں کے ساتھ ذاتی رابطے، باہمی بات چیت اور مختلف خطوں کا سفر کرنے کے علاوہ ایک بے حد اہم وسیلہ کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ دنیا کی مختلف قوموں کی زبانیں مختلف واقع ہوئی ہیں۔ لہٰذا مختلف زبانوں میں لکھی گئی کتابوں میں پیش کردہ نسل انسانی کے تجربوں، مشاہدوں اور علوم تک رسائی کے لیے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترجمے کی مدد سے انسانی علوم ایک مقام سے دوسرے مقام تک بہ آسانی پہنچتے ہیں۔

7.2 ترجمے کی اہمیت

کتابیں علم وادب اور انسان کے ذہنی سفر کا ذخیرہ ہوتی ہیں۔ انھیں بنی نوع انسان کا حافظہ کہا جاتا ہے۔ علم جب کتابوں کی صورت میں مرتب ہو جاتا ہے تو پھر وہ کسی ایک قوم یا ملک کی میراث نہیں رہ جاتا بلکہ دوسری قومیں اور دور دراز کے خطوں کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس مشترکہ میراث سے مختلف زبانوں کے جاننے والے لوگ کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس کا سب سے بڑا ذریعہ ترجمہ ہے۔ اسی لیے جب ہم دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں کے زبان وادب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمام اہم زبانوں میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہ ترجمے کی روایت ہی ہے جس کے سبب قدیم دور میں عرب اور ہندوستان کی سائنس، طب، ریاضی، ادب اور فلسفے کی کتب کے تراجم یونانی اور لاطینی زبانوں میں ہوئے اور یوروپی اقوام نے ان تراجم کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارا اور ان علوم کو مزید آگے بڑھایا، اور پھر یہ علوم یورپی قوموں کی مسلسل تحقیق وجستجو کے نتیجے میں پوری دنیا کے سامنے آئے۔ عرب وعجم کے علماء نے یونانی اور ہندوستانی فلسفے، طب، ہیئت، نجوم اور داستانوں کے عربی زبان میں ترجمے کیے۔ انھوں نے لاطینی زبانوں سے ترجموں کی مدد سے مشرق کو یورپ کے علوم سے متعارف کرایا اور سنسکرت کے تراجم کے ذریعے مغرب کو مشرق کی علمی فتوحات سے باخبر کیا۔ سقراط اور افلاطون جیسے مفکرین کے خیالات ہم تک صرف اس وجہ سے پہنچ سکے کہ سیکڑوں برس پہلے عربی زبان کے اسکالروں نے انھیں اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور تمام دنیا کو ان سے متعارف کرایا۔ اسی طرح بوعلی سینا، ابن رشد اور ابونصر فارابی کے کارناموں کو عرب ممالک کے حصاروں سے نکالنے کا کام لاطینی زبانوں نے کیا اور پھر ان کے فلسفے اور افکار سے یوروپی اقوام نے استفادہ کیا۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں والٹیئر نے شیکسپیئر کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا اور پاسترناک نے روسی زبان میں اہم ادبی شاہکاروں کے تراجم کر کے اپنی زبان کی بیش بہا خدمت کی۔ اس طرح مشرق ومغرب ہر زمانے میں ایک دوسرے کے ادب سے استفادہ کرتے رہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانی علوم کے ارتقا اور فروغ میں تراجم کی اہمیت مستقل اور مسلّم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمے کی ضرورت کس لیے محسوس کی جاتی ہے؟
2. ترجموں کے ذریعے لوگ کن کن شعبوں میں ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں؟

7.3 ترجمے کے مقاصد

ترجمے کا بنیادی مقصد علم کی ترسیل ہے۔ یہ علم کس قسم کا ہے، اس کی بنیاد پر ترجمے کے کئی مقاصد گنائے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن اپنے مضمون ''ترجمہ: نوعیت اور مقصد'' میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں: پہلا معلوماتی دوسرا تہذیبی اور تیسرا جمالیاتی۔

معلوماتی مقصد کے ضمن میں سائنسی، بشری یا سماجی علوم کی کتب کے تراجم آجاتے ہیں۔ان تراجم کی کامیابی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ کتاب میں فراہم کردہ معلومات کو کتنی کامیابی کے ساتھ، بغیر کسی غلطی کے، صاف اور سادہ زبان میں اس طرح منتقل کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اسے سمجھنے میں کسی طرح کی الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے اور معلومات اس تک اپنے اصل مفہوم کے ساتھ پہنچیں۔اس طرح کے تراجم خصوصاً سائنسی کتب کے تراجم کو زیادہ مشکل کام نہیں سمجھا جاتا۔ مترجم کے لیے بنیادی مسئلہ صرف اصطلاحات (Terms) کے ترجمے کا ہوتا ہے۔اگر اس کی زبان میں مختلف علوم کی اصطلاحات پہلے سے موجود ہیں تو پھر یہ کام آسان ہو جاتا ہے۔البتہ بشری علوم یا سماجی علوم کے ترجمے نسبتاً مشکل ہوتے ہیں کیونکہ مترجم کو مختلف علوم سے متعلق اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ نظریات کو بھی منتقل کرنا پڑتا ہے جو ذرا پیچیدہ کام ہے۔بشری علوم میں سب سے زیادہ مشکل کام فلسفیانہ کتب کے ترجمے کا ہے کیونکہ فلسفہ اشیاء کی معلومات فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ اشیاء کے بارے میں تصورات اور نظریات پیش کرتا ہے۔یہ تصورات اتنے پیچیدہ اور تہہ در تہہ ہوتے ہیں کہ اکثر و بیشتر زبان ساتھ نہیں دے پاتی۔اس کے لیے مترجم کو ہر اصطلاح اور تصور کی تعریف نپے تلے لفظوں میں طے کرنا ہوتی ہے۔

ترجمے کی دوسری ضرورت تہذیبی ہے، یعنی کسی معاشرے اور اس کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے لوگ اس سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بھی ترجمے کا سہارا لیا جاتا ہے۔اس ضمن میں افسانوی ادب اور ناولوں کا ترجمہ آتا ہے کیونکہ ناول اور افسانے انسانی معاشرے اور تہذیب کی بھرپور عکاسی اور نمائندگی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ سماجی اور تہذیبی علوم سے متعلق ایسی کتابوں کے ترجمے کو بھی اسی دائرے میں رکھا جا سکتا ہے جن میں مختلف تہذیبوں اور تہذیبی مظاہر کا تفصیلی مطالعہ یا مشاہدہ کیا گیا ہو۔اس طرح کے تراجم میں ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ایسا عین ممکن ہے کہ کسی لسانی آبادی میں مستعمل کسی ایک لفظ سے یا پیرایۂ اظہار سے جو مخصوص تصورات وابستہ ہیں، دوسری تہذیب کے لوگوں کے لیے وہ تصورات ہی بے معنی ہوں۔اس طرح کی صورت حال پیش آنے پر لفظی ترجمہ اپنے مقصد میں پوری طرح ناکام ہو جائے گا۔اس کی ایک اچھی مثال پریم چند کے افسانے 'شطرنج کے کھلاڑی' سے دی جا سکتی ہے۔اس افسانے کی ایک کردار ایک بیگم صاحبہ ہیں جو مردانے میں بار بار اپنے شوہر کے پاس یہ پیغام بھیجتی ہیں کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اور وہ ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہیں۔ان کے شوہر جو بیٹھک میں دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں محو ہیں، ان کی بات پر کان نہیں دھرتے۔تنگ آکر بیگم صاحبہ خبر بھیجتی ہیں کہ اب اگر ان کی بات نہیں سنی گئی تو وہ اکیلی ہی ڈاکٹر کے یہاں چلی جائیں گی۔بظاہر یہ بڑی عام سی بات ہے۔اس واقعے کو اگر کوئی بھی ایسا شخص پڑھے گا جو ہندوستانی معاشرے کے ایک مخصوص دور کے ایک مخصوص کلچر سے واقف نہیں ہے تو وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتا کہ جاگیردارانہ یا زمین دارانہ معاشرے میں ایک اعلیٰ طبقے کی عورت کا تنہا گھر سے باہر نکلنے کی بات تک سوچنا حد درجہ معیوب سمجھا جاتا ہے، اور اُسے بیگم صاحبہ کی اس بظاہر سادہ سی بات کو دراصل اعلانِ بغاوت سے تعبیر کرنا چاہیے۔

ترجمے کا تیسرا مقصد جمالیاتی احساس کی تسکین یا جمالیاتی انبساط ہے۔یعنی انسان کے احساس جمال کی تسکین کے لیے فنون (جن کو فنون لطیفہ یا فائن آرٹس بھی کہا جاتا ہے) کی تفہیم۔ظاہر ہے کہ فنون لطیفہ میں صرف شاعری ایسی چیز ہے جس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے — مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی اور فنِ تعمیر کی تفہیم کے لیے کسی مخصوص زبان کو جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔شاعری کا ترجمہ غالباً سب سے دشوار کام ہے کیونکہ شاعری تصورات کا ایک ایسا علامتی نظام ہوتی ہے، جس میں بات کے لفظی اور سطحی معنی نہیں ہوتے بلکہ لفظوں کے آپسی تعلق کی رعایت سے تہذیبی تصورات اور افکار کو علامتی انداز میں یا رمز و ایمائیت کے وسیلے سے کہا جاتا ہے۔اس طرح بات کو براہِ راست کہنے کے بجائے بالواسطہ کہا جاتا ہے۔علامتوں، پیچیدہ استعاروں، رمز و کنایے اور صنعتوں کے نظام کی مدد سے قاری مفہوم تک پہنچتا ہے اور مفہوم تک پہنچنے کے اس عمل میں وہ ایک خاص مسرت اور انبساط سے گزرتا ہے۔اس سے ایک خاص طرح کی نفسیاتی کیفیت اور فضا کی تعمیر ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس انتہائی پیچیدہ عمل کو ایک دوسرے لسانی اور تہذیبی ڈھانچے میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔اس کے باوجود ہر دور میں شاعری کے ترجمے کی اچھی کوششیں ہوئی ہیں۔

شاعری کا ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں پر ماہرانہ گرفت ضروری ہے۔اس کے علاوہ ان زبانوں سے وابستہ تہذیب، طرزِ زندگی اور تہذیبی علامتوں اور تصورات سے واقفیت بھی لازمی ہے۔ترجمہ کی جانے والی کتاب کے عہد اور اس دور کی تاریخ اور لسانی صورتِ حال وغیرہ سے واقف ہونا بھی کبھی کبھی مترجم کے لیے لازمی شرط ہوتی ہے۔لیکن اس پر مترجم کے شعری ذوق، اس کی فہم و علم، زبان پر اس کی مہارت وغیرہ کو فوقیت حاصل ہے۔ان

بنیادی شرائط کو پورا نہ کرنے والے شخص کو شاعری کا ترجمہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ پھر بھی ضروری نہیں کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اور انتہائی احتیاط کے ساتھ ترجمہ کرنے کے باوجود مترجم شعری شاہکار کی تمام تر خوبیوں کو ترجمے والی زبان میں منتقل کر سکے۔ سنسکرت شعریات کے ماہرین نے لفظ کے معنی کی سات نوعیتیں یا سطحیں بیان کی ہیں۔ یہ نوعیتیں ظاہر ہے کہ ایک مخصوص فکری نظام اور تہذیب کی عکاس ہوتی ہیں۔ اب جب ہم شاعری کا ترجمہ کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کے ساتھ تبھی انصاف کر سکیں گے، جب تہذیبی اور فکری نظام کو بھی منتقل کر سکیں کیوں کہ اس کے بغیر اس مخصوص انبساط و کیفیت تک نہیں پہنچا جا سکتا جس کا حصول شعر فہمی کا مقصد ہے۔ اسی لیے شاعری کا ترجمہ سب سے دشوار کام بتایا گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمے کا بنیادی مقصد کیا ہوتا ہے؟
2. شاعری کا ترجمہ کرنا کیوں ناممکن سمجھا جاتا ہے؟

7.4 مترجم کی ذمے داریاں

مترجم کو دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ دو قوموں اور تہذیبوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے اور انھیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ اس اہم ذمے داری کے حامل شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ ترجمے کی بنیادی شرطوں سے واقف ہو، تبھی وہ اپنا کام ایمانداری سے انجام دے سکے گا۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اصل تصنیف کی زبان، اس کے ادب اور قومی تہذیب سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر وہ کسی کلاسکی کتاب یا پھر کسی مخصوص عہد کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو پھر اس دور کی تاریخ، لسانی رویّوں، لفظوں کے معنیاتی نظام اور سماجی صورت حال سے بھی واقف ہو، تاکہ اس فن پارے میں پیش کیے گئے عہد کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس زبان پر بھی مکمل قدرت رکھتا ہو، جس میں وہ ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ نئے یا اجنبی تہذیب کے خیالات کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ منتخب کر سکے، اور ضرورت پڑنے پر نئے الفاظ، نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کر سکے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے قواعد اور ان کی باریکیوں اور تہہ داریوں سے بہ خوبی واقف ہو۔ ان سب کے علاوہ اہم ترین شرط خود مترجم کی دلچسپی اور شوق و انہماک ہے۔ اگر وہ اس فن پارے اور اس کی زبان میں دلچسپی نہیں رکھتا تو پھر مشینی ڈھنگ سے ترجمہ کر کے وہ ترجمے کا حق ادا نہ کر سکے گا۔ مترجم کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی اس کا کام اصل تصنیف کے ترجمے تک محدود ہے، تشریح و توضیح، تحریف و تخفیف اور حذف و اضافہ کرنا اس کا کام نہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے لکھا تھا کہ ترجمے کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کسی بھی طرح اچھی بات نہیں ہے، اسے قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ تصنیف کی فنی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر اسے ترجمے کی زبان میں پوری ایمانداری سے منتقل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کام کبھی کبھی طبع زاد تخلیق سے بھی زیادہ نازک، پیچیدہ اور ذمے داری کا ہوتا ہے۔

7.4.1 آزاد اور لفظی ترجمے کا مسئلہ

دونوں ہی کا مقصد اصل تخلیق کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا ہے کہ معنوی اور ظاہری ہیئت میں وحدت قائم رہے۔ آزاد ترجمے میں اصل تصنیف کے تخلیقی اور جمالیاتی عناصر پر زور دیا جاتا ہے اور لفظی ترجمے میں معنی کو منتقل کرنے پر۔ لفظی ترجمے میں دیانت دارانہ منتقلی کو ترجیح دی جاتی ہے، جب کہ آزاد ترجمہ کرنے والوں کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے ترجمے کو تخلیقی بازآفرینی کا عمل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مترجم کا کام یہ ہے کہ وہ اصل تصنیف سے پیدا ہونے والے تاثرات میں اس طرح ڈوب جائے کہ وہ اس کا اپنا تجربہ معلوم ہوں۔ پھر وہ تخیل کی مدد سے اپنے تاثرات کو اپنی ہی زبان کے ایسے پیکر میں ڈھالے کہ اس کی زبان کے قارئین بھی اس کے اثرات سے اسی طرح محظوظ ہوں جس طرح وہ خود ہوا تھا۔ اس نظریے کی خامیاں بیان کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

ظاہر ہے کہ زمان و مکان کے مختلف نقطوں سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد پر اصل اثرات بھی مختلف ہوں گے۔ ہر

مترجم اپنے مخصوص تجربات اور اپنی ذہنی اور جذباتی افتاد کے آئینے میں ہی اصل تخلیق کے تاثرات قبول کرے گا اور پھر ان کی تخلیقی صورت گری میں اس کے تخیل کی منفرد کائنات اثر انداز ہوگی۔ اس طرح وہ ترجمے کے نام پر جو کچھ پیش کرے گا ضروری نہیں کہ وہ اصل تخلیق سے مطابقت رکھتا ہو۔

(ترجمہ: فن اور روایت۔ ص ص 17-16)

7.4.2 معتدل رویّہ:

اب سوال یہ ہے کہ مترجم آزاد ترجمہ کرے یا پھر لفظی ترجمے کا پابند ہو؟ دراصل اس کا کوئی سخت اصول طے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کوئی قید اچھے ترجمے کی راہیں محدود و مسدود کرتا ہے کیوں کہ ترجمے کا مقصد مفہوم اور لطفِ بیان کی ادائیگی ہے۔ اس لیے اگر یہ نکات منتقل نہیں ہوتے تو مترجم اپنے مقصد میں ناکام رہے گا۔ ظ۔ انصاری اپنے مضمون ''ترجمے کے بنیادی مسائل'' میں لکھتے ہیں:

ترجمے میں مصنف کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل کرنا دراصل ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ مقصد تو مفہوم اور لطفِ بیان کی ادائیگی ہے۔ اگر الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا، یا اسی وصف کے ساتھ ادا نہیں ہوتا تو کثر لوگوں کا ایک الزام سہہ کر اصل کے الفاظ، ان کی تقدیم و تاخیر، ان کے جوڑ اور جملوں کی ساخت کو بدل کر یہ مقصد پورا کرنا ہوگا۔ یہی ترجمے کا مقصود ہے۔ اور اسی مقصود کی تعمیلِ خاص اس فن کی دیانت داری ہے۔

(ترجمہ: فن اور روایت۔ ص 115)

دراصل ترجمہ ایک فن ہے جو دوسرے فنون، مثلاً موسیقی، گائیکی اور شاعری کی طرح تربیت اور ریاض چاہتا ہے، بس فرق صرف یہ ہے کہ گائیکی اور موسیقی کے مقابلے اس میں ریاض مستقل طور پر نہیں کرنا ہوتا یا کم کرنا ہوتا ہے۔ ایک بار یہ گرفت میں آجائے تو مترجم کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترجمے کی بنیادی شرائط کون کون سی ہیں؟
2. لفظی اور آزاد ترجمے میں کیا فرق ہوتا ہے؟
3. کس قسم کی کتابوں کا لفظی اور کس قسم کی کتابوں کا آزاد ترجمہ کرنا مناسب رہتا ہے؟

7.5 اردو میں ترجمے کی روایت

ترجمے کی اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ بادشاہوں اور جاگیرداروں کے زمانے میں ترجموں کی سرپرستی کا کام اِسی اعلیٰ طبقے کے لوگ کرتے تھے۔ دور دور سے مختلف زبانوں اور علوم کے ماہرین بلائے جاتے اور کتابیں ترجمہ کرائی جاتی تھیں۔ عہد قدیم کے ہندوستان میں اشوک کے زمانے میں دارالترجمہ قایم کیا گیا تھا۔ اکبر کے عہد میں آگرے میں، نظام کے دور میں حیدرآباد میں اور انگریزوں کے وقت میں فورٹ ولیم کالج میں مختلف زبانوں سے ترجمے کیے گئے جس کی وجہ سے ادب اور تہذیب و تاریخ کا علم فارسی اور اردو میں منتقل ہوا۔ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو باقاعدہ ادبی اظہار کی زبان بنانے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ابتدائی دور میں اسے کوئی ادبی اظہار کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس زبان میں ترجمے ان معنوں میں شروع ہوئے کہ خیال اور نفسِ مضمون کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ تصورات اور لفظوں کا استعاراتی اور معنیاتی نظام بھی فارسی اور عربی زبانوں سے اردو میں لے لیا گیا اور اس طرح اس کا اپنا ادبی پیرایۂ اظہار صرف ایک صدی کے عرصے میں وجود میں آگیا۔ یہ کام ترجمہ کرنے کی غرض سے شروع نہیں کیا گیا تھا بلکہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی ایک زبان کی یہ ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ثروت مند اور قوی زبان اس کو سہارا دے تاکہ یہ بھی اپنے پیروں پر چلنا سیکھ سکے۔ اس لیے ہر زبان کے ابتدائی ادب میں زیادہ تخلیقات ایسی ہی ملیں گی جو دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان میں شیکسپیئر کو بطور

ڈراما نگار اور شاعر جو شہرت حاصل ہے وہ دنیا کی کسی زبان کے کسی ادیب کو میسر نہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ شیکسپیئر کے تمام ڈرامے اپنے دور کی کلاسیکی زبانوں کے شاہکاروں سے ماخوذ ہیں۔ اردو کے معاملے میں بھی یہ ہوا کہ اس کے ارتقا کے ابتدائی دور میں فارسی اپنے عروج پر تھی، یہی ادبی اظہار کی زبان بھی تھی، اسی لیے اردو کے شاعروں نے سب سے زیادہ استفادہ بھی اسی سے کیا۔

اس طرح ہم دیکھیں گے کہ اردو میں ترجمے کی روایت ابتدائی دور ہی سے پڑ گئی تھی، گو کہ اس کو ترجمے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً اردو شاعری کو ہی لیجیے، ابتدائی دور کی اردو شاعری یعنی اٹھارہویں صدی کی شاعری کے موضوعات، مفاہیم، شاعرانہ تصورات، تراکیب اور استعاراتی نظام تمام کا تمام فارسی شاعری سے مستعار نظر آتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے اشعار ملتے ہیں جو فارسی اشعار کا اردو ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ شعری اصناف بھی منتقل ہو گئی ہیں۔ نثری کتب میں بھی اردو کی کلاسیکی نثر کی بیش تر کتابیں فارسی اور سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ ملا وجہی کی 'سب رس'، فضلی کی 'کربل کتھا' عطا حسین خاں تحسین کی 'نوطرزِ مرصع'، میر امن کی 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' اور حیدر بخش حیدری کی 'آرائش محفل' کے علاوہ بے شمار داستانیں ایسی ہیں جو ترجمہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ ترجمہ کس نوعیت کا ہے، اس کے پیچھے ترجمے کے کچھ اصول اور ضابطے ملحوظ رکھے گئے ہیں یا نہیں اور ترجمہ نگار نے کہاں تک اصل تخلیق کے ساتھ دیانت داری برتی ہے؛ کیا صرف نفس مضمون لیا گیا ہے یا تہذیبی اور ثقافتی فضا کو بھی منتقل کیا گیا ہے؛ اصل متن کس حد تک منتقل ہوا ہے۔ اگر آزاد ترجمہ ہے تو اس کے کیا اصول ہیں، وغیرہ۔

ان تمام سوالات کی روشنی میں ان تالیفات پر سوالیہ نشان تو لگایا جا سکتا ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ آج ترجمے کے جن اصول وضوابط کی ہم بات کرتے ہیں وہ ایک دن میں مرتب نہیں ہو گئے بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت یہ اصول بنے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اردو کو ایک جدید زبان بنانے، اس میں ادب کی روایت کو مستحکم کرنے اور زبان کو وسعت دینے میں ان تالیفات و تراجم نے اہم رول ادا کیا ہے۔ یوروپی، خصوصاً انگریزی اور روسی ادب کے تراجم کے ذریعے اردو پر ایک ترقی یافتہ دنیا کے، اس کی معاشرت اور تمدن کے، اور اس کے فکری نظام اور علوم کے نئے باب کھلے۔ نئے علوم اور نئے تصورات کو جگہ دینے کے لیے اردو میں نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کی جاتی رہیں۔ درسی کتب، قانون، مذہب، فلسفے، سائنس، سیاسیات اور سماجی علوم کی کتب کے ترجموں کے سبب نئی نئی اصطلاحات رائج اور مقبول ہوئیں، اور ان سے اردو کا دامن وسیع ہوا۔

دوسرا اہم میدان جہاں ترجموں کا باقاعدہ آغاز ہوا وہ مذہب تھا۔ مشنری اداروں نے مذہبی تبلیغ کے پیش نظر مذہبی کتب کے ترجمے کا کام اٹھارہویں صدی کے وسط میں ہی شروع کر دیا تھا۔ پادری بنجمن شلز نے 1748ء میں انجیل کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے علاوہ قرآن، احادیث اور اسلام سے متعلق عربی اور فارسی کتب کے تراجم کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں جمع ہو گیا۔ فضلی نے اپنی کتاب کربل کتھا 1732ء میں مرتب کی اور ۱۷۴۸ء میں اس میں ترمیم کی۔ ملا واعظ حسین کاشفی کی مشہورِ زمانہ فارسی کتاب روضۃ الشہدا محرم کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھی لیکن فارسی میں ہونے کے سبب عام لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے تھے، اسی لیے فضلی نے اسے 'کربل کتھا' کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا۔ اٹھارہویں صدی کے خاتمے سے کچھ پہلے دلّی میں قرآن شریف کے دو ترجمے ہوئے۔ یہ ترجمے مشہور بزرگ اور عالم شاہ ولی اللہ دہلوی کے بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے کیے۔ شاہ رفیع الدین نے قرآن کا ترجمہ 1786ء میں اور شاہ عبدالقادر نے 1790ء میں کیا۔

اس دور میں مذہبی کتب کے تراجم کے علاوہ ایک اہم ادبی ترجمہ نوطرزِ مرصع ہے۔ یہ ایک فارسی داستان قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے جسے میر عطا حسین خاں نے کیا تھا۔ 'نوطرزِ مرصع' کا اسلوب مقفیٰ، رنگین اور مشکل ہے۔ فارسی اور عربی زبان کے مشکل الفاظ اس میں شامل ہیں، اور صنائع کا استعمال اس میں اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ عام بول چال کی اردو جاننے والا کوئی شخص اسے نہیں سمجھ سکتا۔ اس دور میں دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ سید احتشام حسین نے 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں تاریخ کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جو ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کتاب میں تیمور کی ہندوستان پر چڑھائی سے لے کر 1780ء تک کے واقعات کا ذکر ہے۔ احتشام حسین کا خیال ہے کہ مصنف نے پہلے کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ کیا اور پھر اپنی طرف سے انگریزوں اور حیدر علی کی جنگِ میسور کی کہانی اس میں جوڑ دی۔ اسی طرح ایک اور کتاب بہادر نامہ لکھی گئی جس میں سری رنگا پٹنم کی تاریخ ٹیپو سلطان کے عہد تک بیان کی گئی ہے۔ یہ 1798ء کی تصنیف ہے اور اندازہ ہے کہ یہ بھی کسی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

7.5.1 فورٹ ولیم کالج

انگریز ملازموں کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے ۴ رمئی ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس میں ہندوستانی زبان کے شعبے کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے تعلیم کے بندوبست کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا ایک شعبہ بھی کھولا اور کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک دارالاشاعت قائم کیا۔ یہیں میر امن نے 'نوطرز مرصع' کا تتبع کرتے ہوئے باغ و بہار کی تالیف کی اور فارسی کی ایک مشہور کتاب 'اخلاق محسنی' کا ترجمہ 'گنج خوبی' کے عنوان سے کیا۔ سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی، آرائش محفل اور گلِ مغفرت لکھی جو درحقیقت مختلف کتابوں کے ترجمے اور خلاصے ہیں۔ 1801ء میں لکھی گئی 'طوطا کہانی' میں محمد قادری کی 'طوطی نامہ' کو آسان بول چال کی مروجہ زبان میں لکھ دیا گیا ہے۔ یہ سنسکرت کی ایک پرانی کتاب پر مبنی ہے۔ 'آرائش محفل' حاتم طائی کے فارسی قصے کا ترجمہ وخلاصہ ہے۔ ملا واعظ کاشفی کی 'کتاب روضۃ الشہداء' کا ترجمہ حیدری نے 'گل مغفرت' کے عنوان سے کیا۔ فارسی کی اس کتاب کا ترجمہ ان سے قبل فضلی نے 'کربل کتھا' کے عنوان سے کر دیا تھا۔ میر شیر علی افسوس نے فورٹ ولیم کالج میں 'گلستان سعدی' کا ترجمہ 'باغ اردو' کے نام سے کیا۔ ان کی دوسری کتاب منشی سبحان رائے کی 'خلاصۃ التواریخ' کا ترجمہ ہے، جو انھوں نے آرائش محفل کے عنوان سے کیا۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا اور اسے نثر بے نظیر کے عنوان سے شائع کیا۔ اخلاق ہندی کے قصے سنسکرت کی کہانیوں پر مبنی ہیں جو اردو میں انھوں نے فارسی سے منتقل کیے۔ انھوں نے تاریخ آسام کا بھی فارسی زبان سے ترجمہ کیا۔ یہیں مظہر علی خاں ولا نے کئی مشہور کتابیں تالیف کیں جو سب کی سب برج اور فارسی زبان سے لی گئی ہیں۔ یہ ہیں — مادھونل، کام کنڈلا، بیتال پچیسی اور تاریخ شیر شاہی۔ مرزا کاظم علی جواں نے کالی داس کی ابھیگیان شکنتلم کا اردو میں ترجمہ برج بھاشا کی مدد سے کیا اور شکنتلا ناٹک عنوان رکھا۔ نہال چند لاہوری نے عزت اللہ بنگالی کے قصۂ گل بکاؤلی کو اردو میں منتقل کیا اور اس کا نام مذہب عشق رکھا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی بار شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ مولوی اکرام علی، بینی نرائن جہاں، مولوی امانت اللہ شیدا، مرزا جان طپش اور مرزا محمد فطرت وغیرہ نے بھی فورٹ ولیم کالج میں اہم تراجم کیے۔

فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی ترجموں کا کام ہو رہا تھا۔ میر کے ایک رشتے دار محمد حسین کلیم نے تصوف کی ایک مستند کتاب فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ انوار سہیلی کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے فقیر محمد خاں گویا نے 1838ء میں کیا۔ اس میں پنچ تنتر اور ہتوپدیش کی کہانیاں ہیں۔ ان کے چند سال بعد ہیم چند کھتری نے فارسی کی ایک کہانی کا ترجمہ قصۂ گل وصنوبر کے نام سے کیا۔ اس زمانے میں ترجمے کا کام تیزی سے کیا جا رہا تھا، لیکن طباعت کی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اس لیے اندازہ ہے کہ بہت سے تراجم ضائع ہو گئے ہوں گے۔

7.5.2 ورنا کلرٹرانسلیشن سوسائٹی

ورنا کلر سوسائٹی کا قیام دہلی کالج میں اردو ذریعۂ تعلیم کے تدریسی مواد یا نصاب کی ضرورت کی وجہ سے عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی 1842ء میں قائم ہوئی اور غدر سے پہلے اس نے گیارہ کتابیں ترجمے اور تصنیف وتالیف کے ذریعے تیار کر لی تھیں۔ اس سوسائٹی نے ریاضی، سائنس، نجوم، منطق اور فلسفے کو اپنے ترجموں کے منصوبوں میں شامل کیا۔ زیادہ تر ترجمے انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت زبانوں سے کرائے گئے۔ ان تراجم کی بدولت اردو کے طالب علموں نے مغربی علوم وفلسفے سے براہ راست واقفیت حاصل کی۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کا یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ ریاضی، نیچرل سائنس، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ کے شعبوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کے طالب علم انگریزی والوں پر سبقت لے جانے لگے تھے۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس، علم کیمیا، نباتات، علم جراحی، علم تمدن، علم معاشرت وغیرہ پر ان طالب علموں کے لیے اردو میں کتابیں فراہم نہیں تھیں۔ ان کی ضرورت کے پیش نظر ایک اشاعتی انجمن قائم کی گئی جس کا کام ملکی زبانوں میں ان علوم کی کتابیں شائع کرنا تھا۔ ان لوگوں میں جنھوں نے ورنا کلرٹرانسلیشن کو فروغ دینے میں بڑی کوششیں کیں، مسٹر فلکس بترو (Boutros) ڈاکٹر اشپرنگر (Alios Sprenger)، منشی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرساد، پیارے لال آشوب، ہردیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاء الدین قابل ذکر ہیں۔ ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی اس انجمن کے روح رواں تھے۔ اس ادارے کی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر آگرہ اور لکھنؤ میں بھی اس قسم کی کتابیں شائع کرنے کے ادارے قائم کیے گیے۔ اس سوسائٹی نے جو کتابیں ترجمہ کروا کے شائع کیں ان میں سے چند یہ ہیں — رامائن، مہابھارت، لیلاوتی، دھرم شاستر، شکنتلا اور رگھونش، تاریخ انگلستان، تاریخ یونان، تاریخ روم، رسالۂ اصول

حساب، مبادیات تفرقی احصاء و تکمیلی احصاء، روشنی کا انعکاس اور اجتماع شعاع، تجرباتی جیومیٹری، ہائڈرواسٹیٹک، حرارت اور برقیات وغیرہ۔

اس ادارے نے ترجمے کے اصول اور قواعد وضوابط بھی مقرر کیے تھے۔ زبان کو سادہ اور کارآمد بنانے کا جو کام فورٹ ولیم کالج میں شروع ہوا تھا وہ دہلی کالج میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ دہلی کالج میں فروغ پانے والی نثر دراصل فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے زیر اثر وجود میں آنے والی نثر کے درمیان کی کڑی ہے۔

7.5.3 سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد 1864ء میں غازی پور میں پڑی۔ بعد میں اس کا دفتر سرسید کے تبادلے کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگیا۔ اس ادارے کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کر کے نئی فکر اور نئے علوم سے قوم کو روشناس کرانا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں نئے علوم کا ترجمہ کرنا ویسے بھی سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ سوسائٹی نے پچاسوں کتابوں کی فہرست تیار کر کے ترجموں کے لیے منظور کی لیکن اس کے تمام منصوبے پورے نہ ہو سکے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، لیکن ڈاکٹر اصغر عباس نے تحقیق کر کے اپنے مضمون 'سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے تراجم' میں یہ لکھا ہے کہ اس سوسائٹی نے صرف پندرہ کتابیں شائع کیں جن میں سے ہمیں گیارہ دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں ہیں — مصر کی قدیم تاریخ، تاریخ چین، یونان کی قدیم تاریخ حصہ اول، دوم اور سوم۔ رسالۂ علم فلاحت جس میں فرنگستان کے طرز پر کاشتکاری کے فن کا بیان ہے، رسالۂ انتظام مدن، تاریخ ہندوستان، رسالۂ علم برقی، اصول سیاست مدن اور تاریخ ایران حصہ اول۔ جو کتابیں سوسائٹی نے چھاپیں لیکن دستیاب نہیں ہیں، یہ ہیں — رسالۂ علم جغرافیہ حصہ اول تا چہارم، رسالہ جر ثقیل اور رسالہ مسائل معادلات۔ ترجموں کی اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی نے تاریخ کے تراجم میں زیادہ دلچسپی لی۔ ان کتابوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے اشارات اور اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی تھی۔ یہ ترجمے سلیس اور سادہ زبان میں ہیں۔

7.5.4 دارالترجمہ عثمانیہ

26 اپریل 1917ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی کارروائی شروع کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ 1919 میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ کے نصاب کے لیے اردو میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ سامنے تھا اس لیے یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی ترجموں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ مختلف سائنسی اور جدید علوم کی کتابوں کے لیے اردو اصطلاحات کا مسئلہ بھی درپیش تھا، اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے دو سال پہلے، یعنی 14 اگست 1917ء کو دارالترجمہ قائم کرنے کا فرمان جاری ہوا اور یکم ستمبر 1917ء کو مولوی عبدالحق کی نظامت میں شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا اور کام کرنا شروع کیا۔ نصاب اور ترجمے کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کئی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ مثلاً وضع اصطلاحات کی کمیٹی، اہل علم وفن کی کمیٹی، انتخابات نصابات کی کمیٹی، نظر ثانی کمیٹی اور مذہبی اور ادبی نقطہ ہائے نظر سے ترجموں کو دیکھنے والی کمیٹیاں وغیرہ۔ اس دارالترجمے کے ناظم مولوی عبدالحق تھے۔ چند ممتاز مترجمین جو اس ادارے سے وابستہ رہے، یہ ہیں — پروفیسر ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، حکیم کبیر الدین، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری، سید ابوالخیر مودودی، عبدالمجید صدیقی، سید عبدالباری ندوی اور مرزا لبیب وغیرہ۔

دارالترجمے میں پہلے ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لیے کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آنے کے بعد بھی ڈگری کورسوں مثلاً قانون، سوشیالوجی، طب یونانی، میڈیسین، انجینیرنگ، ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ دارالترجمہ نے 1917ء سے 1948ء تک مسلسل کام کیا۔ 1950ء میں جب یونیورسٹی کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کو قرار دے دیا گیا تو پھر دارالترجمہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کتابوں کے ترجموں کے علاوہ دارالترجمہ میں اہم ترین کام وضع اصطلاحات کا ہوا۔ یہاں اصطلاحات کو وضع کرنے کے لیے باقاعدہ اصول مقرر کیے گئے۔

کچھ اور بھی ایسے ادارے ہیں جنھوں نے سائنسی، طبی اور علمی کتابوں کے تراجم کے گراں قدر کام انجام دیے۔ کشمیر میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دارالترجمہ اسی قسم کا ایک ادارہ ہے۔ اس ادارے نے زیادہ تر طبی کتابوں کے تراجم کرائے۔ حیدرآباد میں نواب فخر الدین خاں شمس الامراء ثانی نے سائنسی

علوم کے انگریزی رسائل کے ترجموں کا کام دہلی کی ورنا کلر سوسائٹی کے قیام سے تین سال قبل شروع کر دیا تھا۔اسی طرح حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے ہی بہت سے اداروں نے ترجمے کا کام سنبھال لیا تھا اور اس طرح یونیورسٹی میں اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ 40-1839ء میں انھوں نے ہیئت، ریاضیات اور دیگر علوم پر چھے کتابیں شائع کرائیں۔تقریباً انھیں کے زمانے میں اودھ کے نواب محمد علی شاہ کمال حیدر بھی مغربی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرا رہے تھے۔انھوں نے کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کرایا جن کے موضوعات ہیئت، علم الہوا، علم المناظر، حرارت، طبعیات، آلات ریاضی، قوت مقناطیس اور کیمیا وغیرہ سے متعلق تھے۔بیسویں صدی کے آغاز میں انجمن ترقی اردو نے، جس کی بنیاد 1930ء میں پڑی تھی، ترجمے اور اصطلاحات سازی کو بہت اہمیت دی۔

ان تمام اداروں کے علاوہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، ترقی اردو بورڈ دہلی، ساہتیہ اکیڈمی دہلی، اردو اکیڈمی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ نے بھی مغربی علوم اور ادب کے مستند اور معیاری ترجمے شائع کیے۔آج بھی بہت سے ادارے، اکیڈمیاں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مختلف علوم و ادبیات کے ترجمے کرانے میں پیش پیش ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ان اداروں کے نام لکھیے، جنھوں نے ترجمے کو اپنا بنیادی مقصد بنایا؟
2. ان اداروں نے کس قسم کی کتابوں کے ترجموں کو ترجیح دی؟
3. ان اداروں سے شائع ہونے والی کچھ اہم کتابوں اور ان کے مترجموں کے نام لکھیے۔

7.6 ترجمے کے دیگر شعبے

اب تک ہم نے جس قسم کے تراجم کے بارے میں بات کی ہے انھیں دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔پہلے حصے میں وہ تراجم آتے ہیں جو اردو زبان کے ارتقاء کے ابتدائی دور میں سامنے آئے۔ان میں مذہبی کتب، تمثیلیں، داستانیں، تاریخیں اور شاعری کے آزاد تراجم شامل ہیں یا پھر وہ ماخوذ کتب جنھیں کسی تخلیق کے نفس مضمون کو لے کر اردو میں اسی صنف ادب یا پھر کسی دوسری صنف میں منتقل کر دیا گیا۔

دوسری طرح کے ترجمے وہ ہیں جو مختلف اداروں یا افراد نے کسی خاص مقصد کو ذہن میں رکھ کر کرائے یا کیے۔ان کا بنیادی مقصد اردو جاننے والوں تک مختلف علوم کو پہنچانا تھا۔ان دونوں طرح کے تراجم میں ادب کی تمام اصناف کا احاطہ نہ ہو سکا۔خصوصاً افسانوی ادب کے تراجم کا کوئی باقاعدہ خاکہ نہیں ابھرتا اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ادب کے ترجموں کی طرف خاصی کم توجہ دی گئی۔لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے دوران انگریزی اور روسی ادب کے علاوہ کئی دوسری زبانوں کے ادب سے اردو میں کامیاب ترجمے ہوئے ہیں۔البتہ بچوں کے ادب کا شعبہ ایک ایسا شعبہ ہے جو تراجم کے معاملے میں بھی نادار ہی ہے۔آسانی کے خیال سے اب ہم مذہبی تراجم، ادب اور بچوں کے ادب کا الگ الگ جائزہ لیں گے۔

7.6.1 مذہبی لٹریچر کے تراجم

اردو کے ارتقائی دور میں ترجموں کا سب سے وقیع سرمایہ مذہبی کتب کے تراجم پر مشتمل ہے۔یہ سلسلہ صوفیاء کے احوال و کوائف سے متعلق سیکڑوں رسالوں کی اشاعت و تبلیغ سے شروع ہوا۔پادری بنجمن شلز 1748 میں انجیل مقدس کا اردو میں ترجمہ کر چکے تھے۔شمالی ہند میں فضلی کی 'کربل کتھا'، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، جن کو اردو کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔یہ تراجم بالترتیب 1748، 1786 اور 1790 میں ہوئے۔اردو میں قرآن کے سیکڑوں تراجم ہو چکے ہیں۔پروفیسر عبدالحق اپنے مضمون ''مذہبی تصانیف کے اردو تراجم'' میں لکھتے ہیں کہ ماہر علوم قرآنی ڈاکٹر حمید اللہ کی تحقیق کے مطابق قرآن کے اردو میں تقریباً نوے ترجمے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر محمد مسعود نے مترجمین و مفسرین قرآن کی تعداد ایک سو پچپن لکھی ہے۔قرآن کے مترجمین کے چند اہم نام یہ ہیں — شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی

تھانوی، ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالماجد دریابادی، احمد رضا خاں بریلوی اور احمد سعید خاں دہلوی۔ قرآن کی چند اہم تفسیروں کے اردو تراجم بھی ملتے ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ آزادی سے قبل تفسیرِ محمدی کے عنوان سے محمد عمر جونا گڑھی نے اور آزادی کے بعد انظر شاہ کشمیری نے کیا ہے۔ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن بھی بے حد پڑھی جانے والی تفاسیر میں سے ہے۔ اردو کی قدیم ترین منظوم تفسیر شیخ بہاء الدین باجن کی ہے جو مکمل نہیں ہو سکی۔ پروفیسر عبدالحق نے قرآن کے تراجم اور تفسیروں کی ایک لمبی فہرست اپنے مذکورہ مضمون میں شامل کی ہے۔

قرآن کے بعد اسلامی ادب میں سب سے زیادہ ترجمہ حدیثوں کا ملتا ہے۔ بخاری شریف، تجرید بخاری، مشکوٰت شریف کامل، ترمذی شریف کامل، ترمذی شریف، شمائل ترمذی، سنن ابن ماجہ، صحیح مسلم شریف، موطا امام مالک وغیرہ کے ترجمے آسان اور عام فہم اردو میں ملتے ہیں۔ قرآن اور احادیث کے بعد اسلامی آئین میں تاریخ اور سیرت نگاری کو فوقیت حاصل ہے۔ اردو میں سیرتِ نبوی پر گراں مایہ ذخیرہ موجود ہے جس میں عربی اور دوسری زبانوں میں لکھی گئی سیرتوں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ سیرۃ النبی کامل عبدالجلیل صدیقی اور غلام رسول مہر کا ترجمۂ سیرت ابن ہشام ہے۔ تمام معروف صحابہ کی حیات پر مبنی کتب کے تراجم بھی اردو میں ملتے ہیں۔ تصوف اور اخلاقیات سے متعلق کتب کے تراجم بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ عیسائیت، اسلام اور اسلامی فلسفے کے علاوہ اردو میں دنیا کے تمام اہم مذاہب سے متعلق مذہبی اور تاریخی کتب کے تراجم ہو چکے ہیں۔ ہندو، بدھ، جین، سکھ، آریہ سماج، برہمو سماج اور ہندو فلسفے اور اساطیر کے بارے میں اردو میں کثیر ذخیرۂ کتب ملتا ہے۔ ان مذہبوں کے صحائف کے کئی قسم کے تراجم اور تشریحات اردو میں ملتی ہیں۔ بھگوت گیتا کے اردو میں سب سے زیادہ تراجم ملتے ہیں۔ خواجہ دل محمد نے دل کی گیتا کے عنوان سے منظوم ترجمہ کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ رامائن کے ترجموں کی تعداد تقریباً بیس ہے۔ چاروں ویدوں کے خلاصے کا ترجمہ الکھ دھاری عرف منشی کنھیالال نے الکھ پرکاش کے نام سے کیا تھا جو 1861 میں شائع ہوا تھا۔ منشی سورج نرائن مہر نے بارہ اپنشد کا ترجمہ اور شرح 1900 میں شائع کی تھی۔ مہابھارت کے بھی منظوم اور نثری ترجمے شائع ہوئے ہیں۔

ہندستان میں جو مذہبی اور اصلاحی تحریکات مختلف ادوار میں پنپیں، ان کے سب کثیر تعداد میں لٹریچر موجود ہے۔ ان تمام تحریکات سے متعلق ادب کا، اور جین، بدھ اور سکھ مذہب کی کتب کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ گرونانک کے عارفانہ کلام جپ جی صاحب اور گوپال سنگھ کی کتاب گرونانک دیو کا اردو ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے۔ گرو گوبند کے فارسی کلام ظفر نامہ کا بھی اردو ترجمہ موجود ہے۔

اسی طرح عیسائیت سے متعلق کتب کا ذخیرہ بھی بہت وقیع ہے۔ ان کے تراجم کی تاریخ بھی سب سے قدیم ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ان کے ترجموں کی زبان زیادہ رواں دواں اور ادبی زبان کے قریب ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بیشتر مذہبی کتب کے ترجموں کا مقصد و محرک اپنے اپنے نظریے اور مشن کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ یہی سبب ہے کہ اردو میں مذہبی کتب کے تراجم کا بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔

7.6.2 شاعری اور افسانوی ادب کے تراجم

شعری تخلیقات کا ترجمہ حالانکہ بہت ہی مشکل کام سمجھا جاتا ہے، پھر بھی اردو میں شعری تخلیقات کے کم ترجمے نہیں ملتے ہیں۔ بیشتر ترجمے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے ہوئے ہیں۔ عربی زبان کے بیشتر شعری سرمایے کا ترجمہ مدرسوں سے وابستہ لوگوں نے کیا ہے۔ ان میں اہم تراجم دیوان المتنبی، مقاماتِ حریری، سبعِ معلقہ، ازہار العرب وغیرہ کے ہیں۔ فارسی زبان سے دیوانِ حافظ کا ترجمہ کوثر چاندپوری نے کیا ہے اور شرح اشرف علی تھانوی نے لکھی ہے۔ سعدی کی بوستاں اور مثنوی مولانا روم کے بھی عمدہ تراجم ملتے ہیں۔ مثنوی معنوی کا ترجمہ پیراہنِ یوسفی کے نام سے شائع ہوا۔ سنسکرت کے بھی کئی شاعروں کی تخلیقات کے تراجم اردو میں ہوئے ہیں۔ کالی داس کے علاوہ بھرتری ہری کے بھی تراجم ملتے ہیں۔ رگھوناتھ گھئی نے بھرتری ہری کا خوبصورت منظوم ترجمہ لمعاتِ بصیرت کے عنوان سے کیا ہے۔

انگریزی زبان سے بھی شاعری کے بہت سے ترجمے ہوئے ہیں۔ انگریزی کے تمام بڑے شاعروں کی کچھ نہ کچھ تخلیقات کے ترجمے دستیاب ہیں۔ ان میں شیکسپیئر، ملٹن، کیٹس، شیلی، بلیک، ایلیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ کلاسکس میں سے لاطینی، فرانسیسی اور روسی تخلیقات کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

لیکن ترجموں کا سب سے کثیر سرمایہ افسانوی ادب میں ملتا ہے۔ معروف نقاد احتشام حسین اردو میں افسانوی ادب کے تراجم سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ افسانوی ادب کے تراجم اردو میں رسالوں اور اخباروں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہوئے۔ یعنی رسالوں اور اخباروں کو چھاپنے

کے لیے مواد تو چاہیے ہی تھا، اور ادیبوں سے طبع زاد تحریریں تخلیق کرانے کے مقابلے میں ترجمے کرالینا قدرے آسان کام تھا، اسی لیے اردو میں بھی مختصر افسانے شروع میں اخبارات کی زینت بنے۔ لاہور سے نکلنے والے مخزن، کانپور کے زمانہ، آگرہ کے نگار اور دہلی کے صلائے عام رسالے یورپی افسانوں کے ترجمے چھاپتے تھے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ ان کی بدولت اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی طرف تیزی سے مائل ہوئے۔ البتہ اس دور کے ترجموں کی خرابی یہ ہے کہ اشاعت کے وقت ان میں اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ اصل مصنف کون ہے، کس زبان کا ہے، یا مترجم کون ہے، کون سا افسانہ اصل کے مطابق ہے، کون سا محض ماخوذ ہے، وغیرہ۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں گویا ترجموں کی باڑھ سی آئی ہوئی تھی اور ان ترجموں کا مقصد اخبار کی ضرورتوں کو پورا کرنا تھا۔ ابتدائی دور میں عبدالحلیم شرر، سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے مختلف زبانوں سے ترجمے کیے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان سے ترجموں کا آغاز کیا۔ انگریزی کے علاوہ کئی یورپی زبانوں کے ادیب اردو میں تراجم کی وجہ سے پہچانے جانے لگے تھے۔ ہندوستانی زبانوں میں بنگالی وغیرہ سے بھی ترجمے شروع ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس معروف مترجمین کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس فہرست میں خواجہ منظور حسین، حامد علی خاں، جلیل قدوائی، محشر بدایونی، فضل حق قریشی، اختر حسین رائے پوری، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی اور وحیدالدین سلیم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان لوگوں نے انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے انگیزی متن کی مدد سے بہت سی یورپی زبانوں کے تراجم اردو میں کیے۔ خواجہ منظور حسین اور جلیل قدوائی نے روسی افسانہ نگار چیخوف کے، اور اعظم کریوی نے ہندی زبان سے ترجمے کیے۔ مجنوں گورکھپوری نے تو اتنا اثر قبول کیا کہ اپنے افسانے ہی انگریزی کے مشہور ناول نگار تھامس ہارڈی کے افسانوں پر ڈھال لیے۔

اس دور کے تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ چیخوف اور فرانسیسی ادیب موپاساں کو زیادہ پسند کر رہے تھے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی ابتدا میں افسانوں کا ترجمہ کیا اور اپنے تراجم کا مجموعہ روسی ادب کے عنوان سے لاہور سے شائع کرایا۔ اس مجموعے میں ٹالسٹائے، چیخوف، گورکی اور سلوگب کے افسانے شامل تھے۔ روسی ادب میں حقیقت پسندی تھی۔ اس میں زندگی کے مسائل پر گہری نظر اور عوامی نقطہ نظر تھا۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جس طرح کی عوامی بیداری کی لہر تھی اور سیاسی تحریکات پنپ رہی تھیں، ان کے سبب معاشرے کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ روسی ادب اس مزاج سے خاصا میل کھاتا تھا۔ اسی لیے اس دور میں روسی ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کے خوب ترجمے ہوئے۔ روسی زبان کے تقریباً تمام اہم لکھنے والوں کے ترجمے اردو میں ملتے ہیں۔ ان میں لیو ٹالسٹائے، فیودور دستوئیفسکی، سیمونوف، ترگنیف، شخوناف، الیکسی ٹالسٹائے، پشکن، اوستروفسکی اور شولوخوف وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ روسی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں میں اہم نام سبط حسن، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، منظر سلیم، تقی حیدر، ظ۔ انصاری، صابرہ زیدی، امیر اللہ خاں، حبیب الرحمان خاں اور مرزا اشفاق بیگ وغیرہ کے ہیں۔

''دنیا کے شاہکار افسانے'' سیریز کے تحت پروفیسر عبدالقادر سروری کی عمومی ادارت میں کئی مجموعے حیدرآباد سے شائع ہوئے۔ ان میں قدیم افسانے، انگریزی افسانے، فرانسیسی افسانے، چینی افسانے اور جاپانی افسانے کے عنوان سے مختلف مجموعے شائع ہوئے۔ انگریزی کے جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے اردو ترجمے اس سیریز میں ہوئے ان میں اہم نام گولڈاسمتھ، اسکاٹ، چارلس ڈکنس، تھامس ہارڈی، آر۔ ایل۔ اسٹیونسن، آسکر وائلڈ، رڈیارڈ کپلنگ، ایچ۔ جی۔ ویلز، کیتھرین مینس فیلڈ وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کا ترجمہ ابنِ انشا نے کیا۔ واشنگٹن ارونگ کا حامد علی خاں نے اور کپلنگ کا ظفر علی خاں نے کیا۔ پطرس بخاری اور قاضی عبدالغفار نے گالزوردی کے طویل اور مختصر افسانوں کا ترجمہ کیا۔ سامرسیٹ مام اور او۔ ہنری کے بھی اردو ترجمے دستیاب ہیں۔

دیگر اہم زبانیں، جن سے اردو میں ترجمے ہوئے، چینی، عربی، ترکی، فارسی، اور اسپینی ہیں۔ افریقی اور لیٹن امریکی ادب کا بھی خاصا ترجمہ ہوا ہے جو عموماً انگریزی اور اسپینی زبانوں کی مدد سے ہوا۔ لیٹن امریکی ادیب گبریل گارسیا مارکیز کی بہت سی تحریروں کے اردو ترجمے کتابی صورت میں آ چکے ہیں۔ عربی زبان سے مصطفیٰ المنفلوطی اور خلیل جبران کی بہت سی تخلیقات کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ضیاء الحسن نے عربی سے اور حامد حسن قادری اور منیب الرحمان نے فارسی سے ترجمے کیے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں بہت سے عرب ممالک کے اہم ادیبوں اور شاعروں کے ترجمے براہ راست عربی سے یا پھر انگریزی ترجموں کی مدد سے ہوئے ہیں۔ ان میں مصری، لبنانی، عراقی، فلسطینی، شامی، مراقشی، یمنی، لیبیائی اور سوڈانی ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ عربی،

فارسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمہ کرنے والوں میں آج کے دور کے اہم نام فہمیدہ ریاض، انتظار حسین، محمد عمر میمن، چودھری محمد نعیم، محمد سلیم الرحمان، اسد محمد خان، نکہت حسن، نیّر مسعود، مسعود الحق، اجمل کمال، زینت حسام، احتشام شامی، عطا صدیقی، افضال احمد سید، فاروق حسن، راشد مفتی، آصف فرخی، حمید زماں، محسن جعفری اور شمیم حنفی وغیرہ ہیں۔

غیر ملکی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی زبانوں میں ہندی، بنگالی، مراٹھی، پنجابی، کشمیری تامل، تیلگو اور ملیالم اور اڑیہ وغیرہ سے بھی اردو میں ترجمے ہوئے ہیں۔ ملیالم ادیب ویکوم محمد بشیر کی بہت سی کہانیوں کا ترجمہ مسعود الحق نے کیا ہے۔ بنگالی سے رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، شرت چندر اور بنکم چندر وغیرہ کے بھی اچھے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

دنیا کی اہم زبانوں کے ادب کو اردو میں شائع کرنے کا کام کئی ادبی جریدے کر رہے ہیں، ان میں پاکستان سے نکلنے والے 'آج'، 'مکالمہ'، 'دنیا زاد' اور ہندوستان سے 'ذہن جدید' اور 'نیا ورق' کے علاوہ 'اردو ادب' کی خدمات بھی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ماہ نامہ 'آجکل'، 'شب خون' اور 'شاعر' وغیرہ بھی وقتاً فوقتاً ادبی ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں۔

7.6.3 بچوں کے ادب کے تراجم

اردو میں بچوں کے ادب کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے، اور تراجم کی طرف تو اور کم۔ حالانکہ کوشش یہ ہونی چاہیے تھی کہ بچوں کی بہترین ذہنی نشوونما کے لیے انھیں بہترین معیاری کتابیں فراہم کی جائیں۔ اس کے لیے دنیا کے مختلف ممالک کے ادب، لوک کتھاؤں، تاریخی و تہذیبی قصوں، عالمی رہنماؤں کی زندگیوں پر مشتمل ادب اور عام معلوماتی کتابیں ترجمہ کرائی جاتیں، لیکن اردو میں ایسا بہت کم ہوا ہے، جس کے اسباب پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آزادی کے بعد سرکاری سطح پر اس جانب توجہ دی گئی اور چلڈرن بک ٹرسٹ نے ہر عمر کے بچوں کے لیے طرح طرح کی کتابیں تیار کرائیں۔ ان کتب کے ترجمے ہندوستان کی بیشتر اہم زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اردو میں بھی چلڈرن بک ٹرسٹ کی سو (100) سے زیادہ کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، جن کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ رنگین تصویروں سے سجی یہ کتابیں اچھے آرٹ پیپر پر شائع ہوئی ہیں۔ ماضی میں سابقہ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ اور مختلف صوبوں کی اردو اکادمیوں نے بھی بچوں کا ادب اور ترجمے شائع کیے ہیں۔

چلڈرن بک ٹرسٹ کے مترجمین میں اہم نام شفیع الدین نیر، رضیہ سجاد ظہیر، رفیعہ منظور الامین، صالحہ عابد حسین، عرش ملسیانی اور انور کمال حسینی وغیرہ کے ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے بھی بچوں کے لیے بہت سی کتابیں شائع کی ہیں، جن میں تراجم بھی شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کن کن زبانوں کے افسانوی ادب کے تراجم اردو میں زیادہ ہوئے ہیں؟ اہم مترجمین کون کون سے ہیں؟
2. روسی ادب کے تراجم اردو معاشرے میں کیوں پسند کیے گئے؟
3. اردو میں بچوں کے ادب کی کیا صورت حال ہے؟
   بچوں کے ادب کے تراجم کن کن اداروں نے شائع کیے؟
4. اردو میں کون کون سے مذاہب کی کتابیں ترجمہ ہوئیں؟ ان کی چند کتابوں کے نام بھی تحریر کیجیے۔

7.7 خلاصہ

ترجمے کی روایت نے ہر دور میں نئے نئے افکار و نظریات کو ایک قوم سے دوسری قوم تک پہنچایا ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کی تہذیب، تاریخ اور سماجی زندگی کو سمجھنے میں مدد دی ہے، مختلف زبانوں میں لکھی جانے والی علمی کتابوں، تحقیقی کارناموں، سائنسی نظریات اور ہر طرح کے علوم کو ساری دنیا میں پھیلایا ہے۔ جیسے جیسے دنیا آگے بڑھ رہی ہے اور جتنی تیزی سے نئے نئے نظریات وجود میں آ رہے ہیں، اور سبھی ممالک اور اقوام کے ایک دوسرے کے

قریب آنے کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، ترجمے کی اہمیت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ہرطرف ایک ہی بات کا شور ہے کہ دنیا عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اکثر ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ عالم کاری (Globalization) اور نوآزادہ روی (Neo-libralization) کا عمل عالمی پیمانے پر پھیل گیا ہے۔ ابلاغ اور آمدورفت کے ذرائع میں انقلابی تبدیلیوں اور ایجادات کے سبب عالمی رابطے اور ترسیل میں بہت آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس صورت حال نے عام لوگوں کو بھی عالمی سطح پر ایک دوسرے کے قریب کیا ہے اور باہمی رابطے کی ضرورت کو مزید بڑھادیا ہے۔ ایسے میں گو کہ انگریزی ایک عالمی زبان کے طور پر ابھری ہے اور رابطۂ عامہ کی واحد زبان بنتی جارہی ہے، تاہم دنیا کے ایک بڑے طبقے کی رسائی آج بھی انگریزی تک نہیں ہے۔ اکثر لوگ آج بھی غریب ہیں اور ہندوستان جیسے ملکوں میں آج بھی عوام کی اکثریت کے لیے ذریعۂ تعلیم مادری زبانیں اور علاقائی زبانیں ہیں۔ اس مسابقتی دور میں وقت کے ساتھ ہم قدم ہونے کے لیے ان کے پاس واحد ذریعہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی علاقائی زبانوں یا مادری زبانوں میں علم حاصل کریں۔ یہ کام وہ ترجمہ شدہ کتابوں کی مدد سے کرسکتے ہیں، انھیں اسباب سے آج کے دور میں مترجمین کی اہمیت اور ضرورت مسلسل بڑھ رہی ہے۔

اوپر کے صفحات میں ترجمے کی اہمیت وافادیت کو واضح کیا جاچکا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اردو زبان میں بھی ہر دور میں تراجم کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس پر تفصیلی نظر ہم گزشتہ صفحات میں ڈال چکے ہیں۔ اس سلسلے میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ پر اگر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ باقاعدہ ادبی تخلیقات کے منظر عام پر آنے کے ساتھ ساتھ تراجم بھی ملنے لگے ہیں۔ ابتدا میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے ماخوذ ادب کی تخلیق ہوئی۔ اسی میں ترجمہ نگاری کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ مذہبی کتب کے تراجم بھی اردو کی تشکیل کے ابتدائی دور ہی میں سامنے آنے لگے۔ اردو میں ترجمہ نگاری کی باقاعدہ بنیاد انگریزوں کے آنے کے بعد پڑی جب مغرب سے آنے والے علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کئی قسم کے ادارے مختلف ادوار میں وجود میں آئے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، حیدرآباد کا دارالترجمہ عثمانیہ وغیرہ کی خدمات اس سلسلے میں گراں قدر ہیں۔ ان اداروں کی کوششیں عموماً مختلف علوم کے ترجموں تک محدود ہیں۔ ساتھ ساتھ ادبی کتب کے ترجموں کی روایت بھی پروان چڑھتی رہی اور مختلف زبانوں کی شاعری اور نثری ادب کے تراجم اردو میں ہوئے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ نئی ٹیکنالوجی آنے کے سبب اشاعتِ کتب میں بہت آسانیاں فراہم ہوئی ہیں جس نے ادیبوں کو نیا حوصلہ دیا ہے۔ رسالوں اور جریدوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے اور ان میں لکھنے والوں کی تعداد میں بھی۔ ان تمام وجوہ سے لکھنے والوں کی توجہ ترجمے کی طرف بھی بڑھ رہی ہے، اور آج بھی اردو میں مختلف علوم کی اور ادبی کتب کے تراجم کا سلسلہ جاری ہے۔

7.8 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو میں ترجمے کی روایت پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. اردو تراجم کے اہم اداروں کا تعارف کرائیے۔
3. اردو میں افسانوی ادب کے ترجموں پر ایک مضمون لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترجمے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالیے۔ یا
   ترجمے تہذیبوں اور علوم کے فروغ میں کس طرح سے معاون ہوتے ہیں؟
2. ترجمے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ کیا شاعری کا اچھا ترجمہ کرنا ممکن ہے؟
3. ترجمہ کرنے کے لیے مترجم میں کس طرح کی صلاحیتیں ہونی چاہییں؟ ترجمے کی بنیادی شرطیں کیا ہیں؟
4. ترجمے کے مقاصد پر روشنی ڈالیے۔

7.9 فرہنگ

تجسس = جاننے کی خواہش — راغب کرنا = توجہ دلانا

رابطہ = تعلق — میراث = وراثت

ریاضی = علم حساب — علم نجوم = ستاروں کا علم

علم ہیئت = وہ علم جس میں اجرام فلکی، زمین کی گردش اور کشش وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

بشری علوم = سماجی علوم (Humanities) — وضع کرنا = بنانا

استفادہ = فائدہ حاصل کرنا — ترسیل = اطلاع پہنچانا

تفہیم = سمجھنا — رمز و کنایہ = اشارہ

تحریف = تحریر میں اصل الفاظ بدل کر کچھ اور کر دینا۔ ترجمے میں جان بوجھ کر اصل معنی کو بدل دینا۔

حذف کرنا = نکالنا۔ عبارت سے کسی لفظ کو، یا لفظ سے کسی حرف کو نکال دینا

دارالترجمہ = وہ ادارہ جس کا مقصد ترجمے کرانا ہو — تخفیف کرنا = کمی کرنا

مستعار = مانگا ہوا، ادھار لیا ہوا — ماخوذ = اخذ کیا ہوا، لیا ہوا

تالیف = جمع کرنا۔ مختلف کتابوں سے مضامین جمع کر کے نئے پیرایے میں ترتیب دینا

مرتب کرنا = ترتیب دینا۔ مختلف مضامین کو کتاب کی صورت میں جمع کرنا

وقیع = وقعت رکھنے والا — انحصار کرنا = بھروسا کرنا۔ کسی کا دست نگر ہونا

ابلاغ = کوئی بات یا خیال دوسروں تک پہنچانا — افادیت = فائدہ

ہنوز = اب تک — مسابقت = ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ (competition)

7.10 سفارش کردہ کتابیں

1. قمر رئیس — ترجمہ: فن اور روایت، دہلی
2. خلیق انجم — ترجمے کا فن، دہلی
3. انور سدید — اردو کی ادبی تحریکیں، کراچی، پاکستان
4. مولوی عبدالحق — دلی کالج،، دہلی
5. مجیب الاسلام — دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات، دہلی

اکائی 8 : اردو میں ادبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

8.1 تمہید

8.2 اردو میں ترجمے کا آغاز اور ادبی تراجم کی روایت

8.2.1 اردو زبان میں ترجمے کی ابتدا

8.2.2 ادبی ترجمے کی تعریف

8.2.3 اردو میں ادبی ترجمے کا آغاز اور روایت

8.2.3.1 شعری تراجم کی روایت

8.2.3.2 افسانوی تراجم کی روایت

8.3 ادبی تراجم کی اہمیت وافادیت

8.4 ادبی تراجم کے مسائل

8.4.1 افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل

8.4.2 شعری تراجم سے مختص مسائل

8.5 خلاصہ

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.7 فرہنگ

8.8 سفارش کردہ کتابیں

8.1 تمہید

ترجمہ ایک ایسا فن ہے، جس کے وسیلے سے تہذیبیں نشوونما اور ترقی کے مراحل طے کرتی ہیں نیز انسانی شعور وذہن، اس کی زبان وبیان اور وجدانی و جمالیاتی تجربے میں توسیع واضافہ ہوتا ہے۔ ادب انسان کے جذبات وخواہشات اور خیالات کا مظہر ہوتا ہے اور انسان وکائنات کے باہمی رشتوں کی تفہیم کا بہترین ترجمان ہوتا ہے۔ یہ ایک طرف تہذیب وثقافت کا زائدہ اور اس کا علم بردار ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی تعمیر وتشکیل کا ایک بہترین وسیلہ ہوتا ہے۔ اس لیے کسی تہذیب کے بہترین خیالات واحساسات کے اعلیٰ پیرایۂ اظہار سے مستفیض ہونے کے لیے اور وجدانی و جمالیاتی ارتفاع کے لیے ادبی ترجمے کے اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ ادبی ترجمہ ایک خیال یا تصور کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی فضا اور روایت کو دوسری تہذیب وروایت سے ہم آہنگ کرنے کا عمل ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک مشکل ترین عمل ہے۔

اس اکائی میں اردو زبان میں ادبی ترجمے کی روایت کو بیان کرتے ہوئے ادبی ترجمے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ادبی ترجمے کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے افسانوی اور شعری تراجم سے مختص مسائل کو علاحدہ علاحدہ بیان کیا گیا ہے۔

8.2 اردو میں ترجمے کا آغاز اور ادبی تراجم کی روایت

8.2.1 اردو زبان میں ترجمے کی ابتدا

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ترجمہ ایک زبان کی ساخت میں موجود معنی و مضمون کو دوسری زبان کی ساخت میں منتقل کرنے کا عمل ہے۔ ترجمے کی عمومی تعریف یہی ہے، لیکن اگر ہم اپنی روزمرہ کی سماجی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کریں تو ہم پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ترجمے کا عمل ایک زبان میں بھی جاری رہتا ہے یعنی جب ہم اپنے یا دوسروں کے معنی و مطالب کو ان کے اصل الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہم ترجمے کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں مثلاً یہ جملے :

''میں کتوں کے بھونکنے پر دھیان نہیں دیتا''

''اس نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میں بے کار کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا''

''اس نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ میں بے معنی تنقید پر غور نہیں کرتا''

مذکورہ مثالوں میں دراصل معنی کی ترسیل اور انگیز کرنے کا عمل ہے۔ اس عمل کے رشتے ترجمے سے بہت گہرے ہوتے ہیں، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک زبان کے اندر بھی طبقوں، فرقوں، ملتوں اور علاقوں وغیرہ کے لحاظ سے کئی ذیلی زبانیں ہوتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ترجمے کا فن انسان کی سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ نمو پذیر ہوا ہے، اس کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی زندگی کی تاریخ۔ اس لحاظ سے ترجمہ دو لسانی یا ذیلی لسانی گروہوں کے درمیان تعامل اور رابطے کا ایک عمل قرار پاتا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو زبان مشترکہ تہذیب و ثقافت کی پیداوار اور علمبردار ہے۔ ہندوستان میں اس مشترکہ تہذیب کا آغاز محمود غزنوی کی آمد سے ہوتا ہے۔ اس عہد میں فارسی، پشتو، ترکی، عربی اور ہندوستانی کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان کا ہیولا تیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا تعامل اپنی سادہ شکل میں ترجمے کے فروغ کا باعث ہوتا ہے اور ترجمے کی وجہ سے ہی مشترکہ زبان اور نئے اسلوب وجود میں آتے ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک بالغ لسانی گروہ بازار یا دوسری عملی ضرورتوں کے تحت اجنبی زبان کو ایک معصوم بچے کی طرح انگیز نہیں کرتا بلکہ وہ اجنبی زبان کی ساخت کو اپنی لسانی ساخت کے مطابق اور اس کے مزاج کی ہم آہنگی سے قبول کرتا ہے یعنی ایک لسانی گروہ کے لیے کتے کے معنی کتا، ایک مخصوص جاندار یا جانور کے ہیں جب کہ دوسرے لسانی گروہ کے لیے کتے کے معنی پہلے Dog کے ہیں بعد میں مخصوص جانور کے۔ اس لحاظ سے ایک لسانی گروہ کے دوسری زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے عمل میں ترجمے کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ بقول عبدالحق ہماری زبان میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمے کا آغاز ہوا۔ ان مترادفات میں تصرف بھی ہوئے۔ گویا اردو کے عناصر ترکیبی میں ترجمے کا خمیر شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو زبان میں ترجمے کی تاریخ و ابتدا، اردو زبان کی تاریخ و ابتدا سے منسلک ہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق ماقبل اردو (Pre Urdu) کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر خواجہ سعد سلمان (بارھویں صدی) ہیں، جن کا دیوان اب موجود نہیں ہے۔ ان کے بعد خسرو اور دوسرے شعرا ہیں۔ خسرو کے کلام اور ان کے بعد کے عہد کے فارسی اور ہندوی کلام سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس عہد میں فارسی و عربی الفاظ، ضرب الامثال اور محاوروں کا ترجمہ اردو میں شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مذہبی تصورات و خیالات بھی اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس ذیل میں صوفی سنت پیش پیش تھے، جو اپنے اقوال اور شاعری کے ذریعے ترجمے کے کام کو آگے بڑھا رہے تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے مثالوں کے ساتھ اس بات کو واضح کیا ہے کہ کبیر (پ 1398ء) کی زبان اردو کے بہت قریب ہے۔ ان کے کلام میں دس فی صد سے زیادہ الفاظ فارسی کے ہیں۔ کبیر نے فارسی محاوروں اور ضرب الامثال کے ساتھ بعض فارسی اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے : چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

کبیر : کبیر نوبت آپنی دس دن لیہو بجائے

حافظ (فارسی) : ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست

کبیر : کبیر سریر سرائے ہے کیا سووے سکھ چین
سوانس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

فردوسی (فارسی) : چہ بندی تو دل بر سرائے فسوس
کہ ہر آن ہمی آید آواز کوس

کبیر : کویلا ہوئے نہ اوجرو تومن صابن لائے

فارسی ضرب المثل : کہ زنگی بشستن نہ گردد سفید

گجرات کے شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م 1565) اور نظامی بیدری کی دکن کی پہلی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں بھی ترجمے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے!

گام دھانی : جے تم لیلیٰ جو یالوڑو منجہ مجنوں کی نینوں دیکھو

سعدی (فارسی) : لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید

گام دھانی : کان کرو یہ پرم کہانی

محاورہ (فارسی) : گوش کن کا ترجمہ کان کرو ہے

نظامی بیدری : نہ سنیا الولک کہ اس ورتمان۔ سکھی آپنا جیو تو سب جہان

فارسی ضرب المثل : جان خوش (تو) جہان خوش

نظامی بیدری : پنکھیر وواوڑے دیکھ کر اپنا ونس۔ چڑی مل چڑی (اور مل) ہنس ہنس

فارسی شعر : کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز بہ باز

نظامی بیدری : نکل جانو سر ہانڈی منج تنگ نہ۔ جہاں جانو سنسا تو تنگ نہ

فارسی ضرب المثل : خلق خدا تنگ نیست۔ پائے مرا لنگ نیست

امیر خسرو نے (تیرہویں، چودھویں صدی میں) عربی لغت کے نمونے پر درس و تدریس کے لیے "خالق باری" کے عنوان سے ایک لغت تیار کی، جس میں فارسی، عربی اور ترکی کے مستعمل الفاظ کے اردو مترادفات دیے گئے ہیں۔ خسرو کی یہ لغت بھی ایک قسم کا ترجمہ ہے۔ "خالق باری" کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

خالق باری، سرجن ہار — واحد ایک، بڑا کرتار

انہی بنیادوں پر ماہرین کا خیال ہے کہ شمالی ہند میں غزنوی کے عہد سے مغلوں کے زمانے تک سرکاری ضرورتوں کے تحت اردو زبان میں ترجمے کا کام لازمی طور پر ہوتا رہا ہوگا جن کے نمونے آج دستیاب نہیں ہیں۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں مذہب، تصوف، شاعری، داستانیں، ہیئت، فلسفے وغیرہ سے متعلق کتابوں کے ترجمے عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں سے ہوئے۔ مذہبی ضرورتوں کے تحت اردو میں سب سے زیادہ ترجمے عربی زبان سے ہوئے لیکن ادب عالیہ کے ترجمے فارسی، انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں سے ہوئے۔

8.2.2 ادبی ترجمے کی تعریف

ادبی ترجمہ ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں پوری ادبیت اور اثر آفرینی کے ساتھ منتقل کرنے کا عمل ہے۔ جس کے وسیلے سے ایک تہذیب و ثقافت دوسری تہذیب و ثقافت سے اخذ و استفادہ کر کے ذہنی اور وجدانی نشو و نما کے مواقع حاصل کرتی ہے۔ علمی ترجمے اور ادبی ترجمے میں سب سے بڑا

فرق یہی ہوتا ہے کہ علمی ترجمے میں سارا زور تصور و خیال کی ترسیل پر ہوتا ہے اس میں اسلوب بیان پر زیادہ توجہ نہیں ہوتی جب کہ ادبی ترجمے میں سارا زور تہذیبی سانچے اور تہذیبی فضا کی منتقلی پر ہوتا ہے۔ یہاں خیال کے ساتھ اسلوب بھی اہم ہے یعنی ترجمہ شدہ متن میں ادبی اثر آفرینی کا ہونا ضروری ہے۔

8.2.3 اردو میں ادبی ترجمے کا آغاز اور روایت

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اردو زبان اور ادب کی تاریخ کا نقطۂ آغاز ایک ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زبان تک رسائی کا واحد ذریعہ قدیم ادب ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی زبان کے اولین ادبی نمونے شعر کی صورت میں ہوتے ہیں اس لحاظ سے یہ واضح ہے کہ اردو میں ادبی ترجموں کا کام اردو کی ابتدا ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس کے بارے میں پچھلے صفحوں میں آپ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ ابتدائی عمر کے تمام ترجمے جزوی حیثیت کے ہیں یعنی کسی مصنف کی مکمل تصنیف کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔

8.2.3.1 شعری تراجم کی روایت

اردو ادب میں باقاعدہ شعری ترجمے کا آغاز گولکنڈہ کے فرمان روا محمد قلی قطب شاہ کے عہد (1580-1611) اور اس کی شاعری سے ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکنی ادیبوں اور شعرا کا فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا جس کے نتیجے میں اس عہد میں ترجمے پر بھی باقاعدہ توجہ دی گئی۔ جمیل جالبی کے مطابق قلی قطب شاہ نے حافظ کی غزلیں کی غزلیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ قطب شاہ نے حافظ کے علاوہ دیگر فارسی شعرا کے جستہ جستہ اشعار کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ اسی عہد میں شیخ احمد گجراتی نے مولانا جامی اور امیر خسرو کی فارسی مثنویوں ''یوسف زلیخا'' کا ترجمہ اسی عنوان سے مثنوی کی صورت میں کیا۔ جمیل جالبی کے مطابق اس مثنوی کا سنِ تصنیف 1580ء سے 1588ء کے درمیان ہے۔ احمد گجراتی کی مثنوی یوسف زلیخا کا ڈھانچہ اور پلاٹ جامی اور خسرو کی مثنویوں کے مطابق ہے۔ جس میں دونوں مثنویوں کے بہت سے اشعار کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ احمد گجراتی کی دوسری مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' بھی فارسی مثنوی سے ماخوذ ہے۔ اور ترجمے کے ذیل میں آتی ہے۔ 1631ء میں غواصی نے ''ہتوپدیش'' کے بجشی کے فارسی ترجمے ''طوطی نامے'' کا اسی عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ 1635ء میں قطب زاری نے راجو قوال کی فارسی تصنیف تحفۃ النصائح کا منظوم ترجمہ کیا۔ 1640ء میں بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملک خوشنود نے فارسی مثنوی ''یوسف زلیخا'' (جواب ناپید ہے) اور امیر خسرو کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کا ترجمہ ''جنت سنگھار'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس مثنوی کے ابتدائی حصے بیت بہ بیت ترجمہ ہیں بعد میں مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کیا گیا ہے یعنی آزاد ترجمہ۔ کچھ اشعار کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں استعاروں اور تلمیحوں کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

ہشت بہشت۔ امیر خسرو	جنت سنگھار
سخن آں بہ کہ بعد حمد خدائی	کہاں ہوں حمد اول میں خدا کا
بود از نعت خواجہ دو سرائی	کہاں ہوں نعت بعد از مصطفیٰ کا

1640ء میں ہی کمال خاں رستمی نے عادل شاہ کی فرمائش پر ابن حسام کی طویل مثنوی ''خاور نامے'' کا اسی عنوان سے ترجمہ کیا۔ فن ترجمہ کے لحاظ سے ''خاور نامہ'' ''جنت سنگھار'' سے بہتر مثنوی ہے۔

''خاور نامہ'' اردو کی سب سے طویل مثنوی ہے جو 24 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی بڑی حد تک اصل کے مطابق ہے۔ کہیں کہیں مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ایک دو اشعار بڑھا دیے گئے ہیں اور کچھ اشعار چھوڑ دیے گئے ہیں۔ داستان کی ترتیب، قصے کا تسلسل اور اکثر قافیے بھی اصل کے مطابق ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی اردو کے شعری تراجم میں بہت اہم ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

خاورنامہ (فارسی)	خاورنامہ (اردو
نہد برسر کوہ زریں کمر	رکھے کوہ زریں کمر کے اوپر
گہے چتر مشکیں گہے تاج زر	کدھیں تاج مشکیں کدھیں تاج زر

اسی دور میں امینؔ نے ''بہرام وحسن بانو'' کے عنوان سے اپنی ہی فارسی مثنوی کا اردو میں ترجمہ شروع کیا۔ جسے ان کی وفات کے بعد دولت شاہؔ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ''بہرام وحسن بانو'' اردو میں مصنفی ترجمے کی پہلی مثال ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے۔

بہرام وحسن بانو (فارسی) امینؔ	بہرام وحسن بانو (اردو) امینؔ
نشست آں دیو پیش شاہ و مے را	کیا شاہ اور دیو نیں مے کشی
بخور و گوش کرد آواز نے را	ہوئے آپ میں آپ دونوں خوشی

اس مثنوی میں بیت بہ بیت ترجمہ نہیں ہے بلکہ کہیں کہیں ایک بیت کا ترجمہ دو بیتوں میں کیا گیا ہے۔ ان تراجم کے علاوہ دکن کے چند اہم شعری تراجم مندرجہ ذیل ہیں:

پھول بن (1655ء۔ابن نشاطیؔ	ترجمہ۔ فارسی مثنوی بساتین الانس۔ محمد صدر ملا حسن دبیر تاج
گلشن عشق (1675ء)۔نصرتیؔ	ترجمہ۔ ہندی۔ منوہر مدھومالتی۔ شیخ منجھن
بہرام وگل اندام (1670ء)۔طبعیؔ	ترجمہ۔ فارسی مثنوی ہفت پیکر۔ نظامیؔ
وجودیہ (1675ء) شاہ امین الدین اعلیٰ	اس کتاب میں مصنف نے جو کچھ فارسی نثر میں لکھا ہے اسی کو اردو میں نظم کیا ہے۔
انوار سہیلی (1824ء) محمد ابراہیم	ترجمہ۔ فارسی تصنیف ملا حسین واعظ کاشفی

دکن میں تیرھویں صدی عیسوی میں خود مختار حکومتوں کے قیام سے سترھویں صدی عیسوی تک فارسی زبان وادب کے تراجم کا دور دورہ رہا خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے شعری تراجم پر خصوصی توجہ دی، جس کی وجہ سے ہندوستان میں ایک نئی تہذیب ''ہند ایرانی تہذیب'' وجود میں آئی اور اردو زبان نئے اسالیب، محاورہ، تشبیہات واستعارات اور مضامین وخیال سے مالا مال ہوگئی۔ اس میں جاذبیت وکشش پیدا ہوگئی۔ اردو کی اسی خصوصیت نے شمالی ہند کے فارسی گو شعرا کو متاثر کیا اور اٹھارہویں صدی عیسوی تک ترجمے کی مستحکم روایت کی وجہ سے اردو شعر وادب کا وافر کلاسیکل ذخیرہ تیار ہوگیا۔ شمالی ہند میں دکن کے برعکس مثنوی سے زیادہ غزل اور قصیدے پر توجہ دی گئی۔ اس لیے یہاں فارسی زبان سے زیادہ تر شعری ترجمے غزل کے جستہ جستہ اشعار کی صورت میں ہوئے، جن کو طبع زاد تخلیق کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لیے شعرا کو بغیر اصل کے حوالے کے ترجمہ شدہ اشعار کو اپنے کلام کا حصہ بنانے میں کوئی عار نہ تھی۔ شمالی ہند میں یہ صورت حال عہد غالب (انیسویں صدی) تک رہتی ہے۔ کلاسیکی شعریات میں ترجمے کو ایک صنعت قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے اس عہد میں ترجمے اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں تھا۔ غزلیہ اشعار کے ترجمے کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

نظیریؔ	ولیؔ
نہ چناں گرفتہ ای جاں بہ میانِ جانِ شریں	ایسا بسا ہے آکر تیرا خیال جیو میں
کہ تواں نزاو جاں راز ہم امتیاز کردن	مشکل ہے جیوسوں کوں اب امتیاز کرنا

حافظؔ	سوداؔ
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز	راز دیر و حرم افشا نہ کریں ہم ہرگز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست	ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر

امیر خسرو	میر
عام حکم شراب می خواہم	عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب را کباب می خواہم	محتسب کو کباب کرتا ہوں
آنند رام مخلص	یقین
ناخن تمام گشت معطر چوں برگ گل	کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
بند قبائے کیست کہ وامی کنیم ما	برگِ گُل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا
شوکت بخاری	غالب
جنوں مزا جم و نبود دماغ گل گشتم	محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
خیال بوئے گل افزوں کند زکام مرا	کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم

1857ء میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اردو میں مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم کا آغاز ہوا۔ 1864ء میں فلق میرٹھی کا منتخب انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ ''جواہر منظوم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1869ء میں بانکے بہاری لال نے ''منتخب انگریزی نظموں کے منظوم تراجم'' کے عنوان سے دوسرا مجموعہ شائع کیا۔ جس کے بعد محمد حسین آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، سرور جہاں آبادی، ظفر علی خاں، اقبال وغیرہ جیسے شعرا نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔ 1897ء میں نظم طباطبائی نے انگریزی کے مشہور شاعر تھامس گرے کی نظم کا ''گورِ غریباں'' کے عنوان سے (An Elegy Written in a Country Churchyard) کا کامیاب منظوم ترجمہ کیا، جس کی مقبولیت کے بعد انہوں نے کئی دوسری نظموں کے ترجمے کیے۔ اقبال نے ٹینی سن، لانگ فیلو اور ولیم کاوپر کی انگریزی نظموں کے منظوم تراجم ''پیام صبح''۔ ''عشق اور موت''۔ ''رخصت اے بزم جہاں'' کے عنوان سے کیے۔ عبدالحلیم شرر نے، انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کو ایک تحریک کی حیثیت بخشتے ہوئے، خود بھی اچھے ترجمے کیے اور دوسرے شعرا کو بھی اس طرف راغب کیا۔ جس میں حسرت موہانی، عزیز لکھنوی اور محمود شیرانی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ انگریزی سے چند ابتدائی منظوم تراجم مندرجہ ذیل ہیں :

محمد حسین آزاد	:	اندھی پھول والی کا گیت۔ لارڈ لٹن، اُجڑا ہوا گھر، بہار کا آخری پھول، ٹامس مور
حسرت موہانی	:	موسم بہار کا آخری پھول۔ ٹامس مور
ظفر علی خاں	:	ندی کا راگ۔ ٹنی سن، وفا۔ ورڈس ورتھ
عزیز لکھنوی	:	مٹی کا جوان چاند۔ ٹامس مور
حافظ شیرانی	:	موت کا وقت

اردو میں باقاعدہ اینتھولوجی انتخاب کا آغاز ضامن کنتوری کی کتاب ''ارمغانِ فرنگ'' سے ہوا، جو 1901ء میں شائع ہوئی۔ بیسویں صدی میں انگریزی کے ساتھ مغرب کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ترجمے پر بھی زیادہ توجہ دی گئی۔ میراجی نے ''مشرق و مغرب'' کے نغمے ترتیب دے کر جدید مغربی شاعری کی طرف اردو شعرا کو متوجہ کیا۔ بیسویں صدی میں معنی و خیال پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے بیشتر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری کا ترجمہ نثر میں کیا گیا۔ نظم کی اس قلبِ ماہیت کے باوجود شعری تاثر کافی حد تک قائم رہتا ہے۔

8.2.3.2 افسانوی ترجم کی روایت

اردو زبان میں تخلیقی نثر اور افسانوی ترجمے کا آغاز ملا وجہی کی ''سب رس'' سے ہوتا ہے، جو 1635ء میں گولکنڈہ کے فرماں روا قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ''سب رس''، محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی مثنوی ''دستور عشاق'' (1436ء) کے نثری خلاصے ''قصہ حسن و دل''

کا ترجمہ ہے۔ دستور عشاق اپنے عہد کی مشہور تصنیف ہے۔ جس کے منظوم اور منثور ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے اور جس نے اپنے عہد کے ادیبوں اور شاعروں کو بے حد متاثر کیا۔ دستور عشاق کی مقبولیت کے پیش نظر فتاحی نے اس قصے کو مسجع و مقفیٰ نثر میں 1439ء میں دوبارہ ''شبستان خیال'' کے عنوان سے پیش کیا۔

سترھویں صدی اور اٹھارھویں صدی میں داستان امیر حمزہ دکنی' ترجمہ ''طوطی نامہ''۔ ابوالفضل' ترجمہ ''طوطی نامہ''۔ ملا قادری (1729ء) اور ترجمہ ''سنگھاسن بتیسی'' منظر عام پر آئے۔ انیسویں صدی میں دکنی ''انوار سہیلی'' یا دکن انجم۔ مترجم میاں محمد ابراہیم بیجاپوری (1822ء) ''قصہ کام روپ و کام لتا'' مترجم سید حسین علی خاں وغیرہ داستانوں کے تراجم ہوئے۔

شمالی ہند میں اردو کی پہلی نثری تصنیف اور ترجمہ فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' ہے۔ جو ملا واعظ حسین کاشفی کی روضۃ الشہداء کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں پہلا اول ترجمہ ''نوطرزِ مرصع'' ہے' جسے 1775ء میں عطا حسین خاں تحسین نے محمد علی معصوم کے فارسی قصے ''چہار درویش'' سے ترجمہ کیا۔ تحسین نے اس ترجمے کو بامحاورہ بنانے کی پوری کوشش کی ہے' اس کے باوجود ترجمے میں تخلیقی عنصر پیدا نہیں ہو سکا۔ نوطرزِ مرصع' میں زیادہ تر فارسی عربی تراکیب اصل متن سے بعینہٖ لے لی گئی ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے نصف سے اردو میں فارسی' عربی زبانوں کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی ترجمہ ہونے لگا تھا' لیکن یہ ترجمہ مذہبی نوعیت کا تھا 1794ء میں مہر چند کھتری مہر نے مشہور فارسی قصے ''سمن رُخ و آذر شاہ'' کا ترجمہ ''نو آئین ہند'' یا ''قصہ ملک محمد و گیتی افروز'' کے نام سے کیا۔ اس ترجمے کا مقصد انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا اس لیے اس کی زبان آسان اور سادہ ہے' جس میں اردو شعرا کے اشعار بھی دیے گئے ہیں۔

اردو میں منصوبہ بند ترجمے کا آغاز کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ہوا۔ جس کا مقصد ہندوستان میں تعینات انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا۔ اس کالج کے تحت عربی' فارسی' سنسکرت اور دیسی زبانوں سے تقریباً ساٹھ کتابوں کے ترجمے اردو میں ہوئے' جن میں زیادہ تر کتابیں ادبی تھیں۔ کالج کے ان ترجموں نے اردو نثر کو نئے اسلوب اور نئی جہت بخشی۔ چوں کہ کالج کے اکثر ترجموں میں آزاد ترجمے کے اصول برتے گئے اس لیے یہ ترجمے قبل کے تراجم کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم ادبی ترجمہ ''باغ و بہار'' ہے' جسے 1802ء میں میر امن نے فارسی قصے ''چہار درویش'' کے ترجمے کے طور پر پیش کیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملے' روانی' سادگی اور پرکاری اس ترجمے کی اہم خصوصیات ہیں۔ میر امن نے 1802ء میں فارسی کی کتاب اخلاق محسنی ''گنج خوبی'' کے نام سے ترجمہ بھی کیا لیکن یہ ترجمہ باغ و بہار کے مقابلے میں پست ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ ہونے والی چند اہم داستانیں و کتب مندرجہ ذیل ہیں :

توتا کہانی (1801ء)	حیدر بخش حیدری	ترجمہ۔ فارسی طوطی نامہ۔ سید محمد قادری
آرائش محفل (1805ء)	حیدر بخش حیدری	ترجمہ۔ فارسی زبان سے
قصہ لیلیٰ مجنوں (1801ء)	حیدر بخش حیدری	ترجمہ۔ فارسی زبان سے
بیتال پچیسی	مظہر علی ولا و للولال	ترجمہ۔ برج بھاشا سے۔ بیتال پنچ ویشا تکا
قصہ مادھونل و کام کندلا	للولال' مظہر علی ولا	ترجمہ۔ برج بھاشا سے
شکنتلا۔ (کالی داس) 1801ء	کاظم علی جوان	ترجمہ۔ برج بھاشا سے
داستان امیر حمزہ (1801ء)	خلیل خاں اشک	ترجمہ۔ کسی فارسی نسخے سے
اخلاق ہندی	بہادر علی حسینی	ترجمہ۔ فارسی کی ہتوپدیش کا
مذہب عشق	نہال چند لاہوری	ترجمہ۔ فارسی قصہ گل و بکاولی کا
خرد افروز	حفیظ الدین	ترجمہ۔ کلیلہ و دمنہ پر مبنی عیار دانش کا

باغ اردو	شیر علی افسوس	ترجمہ۔فارسی گلستان۔شیخ سعدی
باغ سخن	مرزا مغل	ترجمہ۔فارسی بوستان۔شیخ سعدی

فورٹ ولیم کالج کے باہر ترجمہ ہونے والی داستانوں میں رجب علی بیگ سرور کی داستان ''شگوفۂ محبت'' ہے جسے سرور نے 1856ء میں منشی شیو نرائن کی فرمائش پر کسی عربی نسخے سے ترجمہ کیا تھا۔ بیم چند کھتری نے داستان ''گل صنوبر'' کا 1836ء میں ترجمہ کیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں داستانوں کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس دور میں ''بوستان خیال'' اور ''داستان امیر حمزہ'' کے متعدد تراجم منظر عام پر آئے۔ ان مترجمین میں مرزا محمد حسن عسکری عرف چھوٹے آغا' مرزا محسن علی خاں عرف آغا بجو' پیارے مرزا' منشی تصدق حسین' احمد حسین قمر' محمد حسین جاہ' لالہ انبا پرشاد رسا لکھنوی اور غلام رضا رضا اہم ہیں۔

دہلی کالج (1842ء)' سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی (1862ء)' شمس الامرا دارالترجمہ' حیدر آباد (1843ء) انجمن ترقی اردو ئے ہند (1903ء)' دارالمصنفین' اعظم گڑھ (1913ء)' عثمانیہ دارالترجمہ (1917ء) وغیرہ ترجمے سے متعلق اداروں میں زیادہ توجہ علمی اور سائنسی موضوعات کے ترجموں پر دی گئی۔ اس لیے ان اداروں کے تحت ادبی تراجم بہت کم منظر عام پر آئے۔ اردو میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے علوم کے ترجمے کا آغاز 1843ء میں شمس الامرا کے دارالترجمہ سے ہوتا ہے۔ لیکن مغربی نثری ادب کے ترجموں کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہوتی ہے۔ اس دور میں انگریزی کے مختصر افسانوں' ناولوں' انشائیوں' ڈراموں اور سفرناموں وغیرہ کو سرعت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا' جس کے نتیجے میں ہندوستان کی آزادی سے قبل اردو زبان میں مغربی ادب کا ایک وافر ذخیرہ ہوگیا اور سینکڑوں مترجمین پیدا ہوگئے۔ ان ابتدائی مترجمین میں مولانا محمد حسین آزاد' سر عبدالقادر' آغا حشر کاشمیری' سجاد حیدر یلدرم' نیاز فتحپوری' قاضی عبدالغفار' مرزا ہادی رسوا وغیرہ کے علاوہ اور اہم نام بھی ہیں۔ بیسویں صدی میں 1930ء کے بعد اردو میں انگریزی کے علاوہ فرانسیسی' جرمن اور روسی زبانوں کے ادب پر بھی توجہ دی گئی اور بہت سے ناولوں' افسانوں وغیرہ کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ عنایت اللہ دہلوی' عبدالرحمٰن بجنوری' سجاد ظہیر' مجنوں گورکھپوری' عابد حسین' منٹو' پروفیسر مجیب' قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین وغیرہ مترجمین نے ترجمے کی روایت کو مستحکم کیا۔ مغربی ادبی تراجم کی روایت کو استحکام بخشنے کے لیے 1927ء میں ہندوستانی اکیڈمی اور اردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تحت جرمن ڈرامہ نگار ینگ اور انگریزی ڈرامہ نگار گالزوردی کی تخلیقات کا ترجمہ کیا گیا' جب کہ اردو اکیڈمی نے علمی کتابوں کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے ناولوں اور افسانوں کے تراجم پر بھی زور دیا۔ مغربی ادب کے ان تراجم کے نتیجے میں ہی آج اردو ادب میں داستان کو چھوڑ کر ساری نثری اصناف انگریزی سے مستعار ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ادبی ترجمے کی تعریف بیان کیجیے۔
2. اردو میں شعری و افسانوی ترجمے کا آغاز کب ہوا؟

8.3 ادبی تراجم کی اہمیت و افادیت

ادب انسان و کائنات کے درمیان رشتوں کا محسوساتی اور اکتشافی اظہار اور انسانی جبلتوں و خواہشوں اور ان کے وجدان کا مظہر ہوتا ہے۔ ادب ایک طرف حظ اور سکون کا باعث ہوتا ہے تو دوسری طرف عقل و فکر کو مہمیز کرنے کا آلہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک متمول ثقافت کے معنی ہیں دوسرے علوم و فنون کے ساتھ اعلیٰ ادبی شاہ کاروں کا موجود ہونا۔ ادب انسان کی ترقی اور اس کی حریت و آزادی کی علامت اور ضمانت ہوتا ہے۔ اسی لیے انسان سب سے زیادہ ادبی شاہکاروں سے متاثر ہوتا ہے' نتیجتاً اس میں زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی صلاحیتیں جلا پاتی ہیں یعنی انسان کی بنیادی اور مخفی صلاحیتوں کو اظہار کا وسیلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ تہذیبیں فقط سیاسی و معاشی برتری یا خوش حالی کی بنیاد پر اعلیٰ و ادنیٰ نہیں ہوتیں بلکہ یہ معیار علم و فن اور ادب کے تناظر میں متعین ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ یونان پر روم کے تسلط کے بعد بھی یونانی ادب و تہذیب رومیوں کے لیے متاثر کن اور باعث تقلید تھے بلکہ بعد کے تمام

ترقی یافتہ معاشروں نے یونانیوں سے فیض حاصل کیا۔ عالمی تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو دنیا کی مختلف زبانوں میں ابتدا ہی سے اعلیٰ اور تخلیقی ادب پیدا ہوتا رہا ہے۔ اعلیٰ ادب کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ اس میں انسانی زندگی اور کائنات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ ہو' اس میں زندگی اور اس کے مظاہر کی معنویت اور مقصدیت شامل ہو۔ اس لیے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں اعلیٰ ادب کے ابتدائی نمونے مذہبی اور الہامی کتابوں کی صورت میں ہوتے ہیں کسی تہذیب میں تصورِ انسان اور تصورِ کائنات بڑی حد تک ان الہامی کتب سے ہی قائم ہوتا ہے۔ یونانی ادب کے معمار ہومر کی تخلیقات ایلیڈ اور اوڈیسی جنہیں آج ہم کلاسک کا درجہ دیتے ہیں' افلاطون کے عہد تک ان کی قدر و قیمت مذہبی صحیفے سے کم نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ادبی ترجمے کی معنویت اور اہمیت وافادیت واضح اور نمایاں ہے۔ اس اہمیت وافادیت کی دو جہتیں ہوتی ہیں (1) معنوی یعنی خیال و تصور کی سطح پر (2) لفظی یعنی زبان اور اسلوب کی سطح پر:

1) **معنوی جہت** : اس جہت کے تحت ایک قوم دوسری قوم کے خیالات' نظریات' تخیلی نیرنگیوں اور جمالیاتی و اخلاقی قدروں سے استفادہ کرتی ہے یا باہم دگر دو قومیں سچائیوں اور صداقتوں کی توثیق کر کے یکجہتی و یگانگت کو مستحکم کرتی ہیں اور اپنے ذہن و وجدان میں وسعت پیدا کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے ادبی ترجمہ تہذیبی نشو و نما کا باعث ہوتا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرصے کے بعد ایک تہذیب کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں' جس کے نتیجے میں اس کے افراد علاحدگی اور تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ادبی ترجمہ اس مردہ جسم میں روح پھونکتا ہے جس کے وسیلے سے مختلف گروہوں کے درمیان انسانیت اور انسان دوستی کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی انسانیت اور انسان دوستی کی خصوصیات سے ادب کی آفاقی قدریں متعین ہوتی ہیں۔

2) **لفظی جہت** : اس جہت کے تحت ایک زبان دوسری زبان کے ادب سے وسعت و گہرائی اور فکری بلندی کی خصوصیات حاصل کرتی ہے اور ایک زبان دوسری زبان کی ذیلی ساخت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نئے خیالات اور نئے احساسات کو بیان کرنے کے لیے زبان میں نئے اسلوب پیدا ہوتے ہیں' زبان میں نئے نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں یا پرانے الفاظ کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی ہے یا انہیں ایک نئے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور نئے محاورے اور ضرب الامثال پیدا ہوتے ہیں یا ان سے آشنائی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ایک زبان میں استحکام اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ایک ترقی یافتہ زبان کے معنی یہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات و تصورات کو بیان کرنے کی صلاحیت ہو۔ ادبی ترجمے کے وسیلے سے زبان کو ترقی حاصل ہوتی ہے۔ ادبی ترجموں کی اسی معنویت اور افادیت کے پیش نظر مغربی کلاسیکیت پسند حضرات اعلیٰ ترجموں کو تخلیقی فن پاروں کے ہم پلہ قرار دیتے تھے۔ اردو میں بھی قلی قطب شاہ کے عہد سے لے کر غالب کے دور تک ترجمے کو ایک صنعتِ معنوی قرار دیا جاتا تھا اور بغیر ماخذ کے حوالے کے ترجمہ کو اپنی تخلیق کا حصہ بنا لیا جاتا تھا۔

اردو کے تناظر میں اگر ترجمے کی اہمیت پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو کا ابتدائی ادب سولھویں صدی کے ربع اول تک جامہ ہندی روایت کے زیر اثر تھا۔ اس لیے اس میں وہ بلندی و توانائی نہیں پیدا ہوئی تھی' جو اعلیٰ ادب کے لیے ضروری ہوتی ہے' لیکن اسی زمانے میں جب فارسی سے اردو میں ادبی تراجم کا دور شروع ہوا تو اردو زبان و تہذیب نے ترقی و عروج کے مراحل طے کرنا شروع کر دیے۔ ان ادبی تراجم نے اردو زبان و ادب کی اس طرح کایا پلٹ دی کہ فارسی تہذیب اور پرایہ احساس نے ہندی روایت پر حاوی ہو کر اور اس سے آمیز ہو کر ایک نئی تہذیب ''ہند ایرانی تہذیب'' کو استقامت بخشی۔ بقول جمیل جالبی اگر فارسی روایت ہندوی روایت کو اس طور پر نہیں بدلتی تو اس براعظم کی قدیم تہذیب گل سڑ کر کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ یعنی یہ کہ اردو نے اپنی بقا کا انتظام بھی کیا اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کو بھی نئی زندگی دی۔ ادبی ترجموں کے وسیلے ہی سے اردو زبان کی ساخت' اس کا پیرایۂ اظہار' اسلوب اور اس کی مستعمل قدیم و جدید اصناف پیدا ہوئیں۔ یعنی غزل' قصیدہ' مثنوی' رباعی' قطعہ' نظموں کی ہئتیں' عروض و بلاغت' داستان و حکایت فارسی ادب کے وسیلے سے اردو میں آئیں اور ناول' افسانہ' ڈرامہ' انشائیے' سفرنامے' آزاد نظم' نثری نظم' تنقید وغیرہ اصناف مغربی ادب کے وسیلے سے ظہور پذیر ہوئیں۔ معنوی جہت کے تحت تصورِ عشق' تصورِ کائنات' تلمیحات' علامات' غرض کہ اردو کی پوری شعریات فارسی اور بعد میں مغربی زبانوں کے ادب کی مرہون منت ہے۔ ادبی تراجم کی بدولت ہی اٹھارھویں صدی کے آخر تک اردو زبان و ادب اس قدر متمول اور مستحکم ہو چکا تھا کہ بقول مصحفی ریختہ ہمارے زمانے میں فارسی کے اعلیٰ مرتبے کو پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے بہتر ہو گیا ہے۔ یعنی انیسویں صدی کے آخر تک اردو کا کلاسیکل ادب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا

تھا۔جس کے نتیجے میں اس کا زوال آمادہ ہونا منطقی تھا۔اس لیے انیسویں صدی کے آخر میں مغربی زبان وادب سے رجوع کرنا ناگزیر تھا جس کے باوصف اردو میں انگریزی زبان وادب کے ترجمے کا کام شروع ہوا۔اور اردو زبان وادب نے اپنی نشوونما کے ایک بار پھر سامان فراہم کیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. معنوی جہت سے ادبی ترجمے کی کیا اہمیت ہے؟
2. لفظی جہت سے اردو میں ادبی ترجمے کی اہمیت بیان کیجیے۔

8.4 ادبی ترجمے کے مسائل

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ادبی ترجمہ ایک تہذیب اور اس کے جمالیاتی عناصر کو دوسری تہذیب میں یکساں اثر آفرینی کے ساتھ منتقل کرنے کا عمل ہے۔اس لحاظ سے علمی ترجموں کے مقابلے میں ادبی ترجمہ سب سے زیادہ مشکل عمل ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ شدہ متن میں یکساں آفرینی پیدا کرنا تقریباً ناممکن ہے یعنی ترجمہ شدہ متن بھی اسی پائے کا ادب ہو۔مترجم کی یہ ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ ترجمے کو اصل کے متبادل کے طور پر پیش کرے۔ ظاہر ہے اس کشمکش کی صورت حال سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن میں سے بعض مسائل ناقابل حل ہوتے ہیں۔کسی ادبی ترجمے کے پانچ مدارج ہوتے ہیں۔ (1) ادبی متن کا انتخاب (2) متن کی کلی تفہیم (3) متن سے ہم آہنگی (4) ترسیل وابلاغ (5) ترجمہ شدہ متن کا ادب پارہ ہونا۔ ترجمے کے ان پانچوں مدارج کے جداگانہ مسائل ہوتے ہیں۔آیئے ان مسائل پر غور کرتے ہیں۔

1) ادبی متن کا انتخاب:

اس مرحلے میں مترجم اپنی لیاقت، ذہانت اور ادبی ذوق وشوق کے اعتبار سے ادبی متن کو ترجمے کے لیے منتخب کرتا ہے۔اس انتخاب میں مترجم متن سے پوری وفاداری نبھانے کے لیے پابند ہو جاتا ہے۔اس لیے مترجم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ متن کی اصل زبان، اس کا عہد، اس وقت کی تہذیب وثقافت اور سماجی و جمالیاتی قدروں کے ساتھ سیاسی وسماجی حالات سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ادبی ترجمے کے لیے دو زبانوں کا جاننا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے دو تہذیبوں سے واقفیت ضروری ہے۔اس کے ساتھ ہی متن کی قدر و قیمت، اس کے ترجمے کی ضرورت اور اہمیت و افادیت کا تعین بھی مترجم کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے وہی چیزیں اخذ کرنا چاہتی ہے۔جو اس کی نشوونما میں معاون ہوں۔اس کے لیے ہر ادب پارہ اہم نہیں ہوتا۔اس ذیل میں مترجم کو اپنے عہد کی سیاسی وسماجی صورت حال، نظریات و میلانات، اس عہد کے ادبی ذوق ومزاج اور ذرائع ترسیل وابلاغ کے رویوں کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔قدیم اردو ادب میں زیادہ تر صوفیانہ نظریات واقدار کو فروغ دینے والے شعری وافسانوی فن پاروں کے ترجمے کیے گئے۔بقول شبلیؔ صوفیانہ خیالات واقدار سے استفادے کی بدولت ہی فارسی شعروادب دنیا کے اعلیٰ ادبوں میں شامل ہے۔جب کہ اس عہد میں نظامیؔ اور دوسرے شعرا کے قصائد وہجویات کے نمونے بھی تھے۔ اسی طرح سرسید تحریک کے دوران مغرب سے حقیقت پسندانہ ادب اور دور الیزابیتھ کے ادب کے تراجم ہوئے اور بقیہ بلند پایہ تخلیقات سے صرف نظر کیا گیا، جس کا ترجمہ بعد کے زمانے میں ہوا۔ان تمام مثالوں کا مقصد یہ ہے کہ ادبی ترجمہ دراصل لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے باعث تربیت ہوتا ہے۔جس زمانے میں جیسا ادب تخلیق ہوتا ہے، اسی طرح کے فن پارے بھی ترجمے ہوتے ہیں۔اس لیے انتخاب متن ایک مسئلہ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام معیارات کو برقرار رکھنا مشکل ترین امر ہے۔

2) متن کی کلّی تفہیم

اس مرحلے میں انفرادی متن کا مطالعہ اور اس کی کلی تفہیم وابلاغ کا عمل ہوتا ہے۔اس مرحلے میں مترجم فن پارے کی تہذیب، زبان، بیان، مصنف

کے بارے میں آ گہی' اس کی فکر' جذبے' نقطۂ نظر' لہجے اور اسلوب کی پوری طرح تفہیم کرتا ہے۔ اس مرحلے میں مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض فن پارے کلّی طور پر اور بعض جزوی طور پر ایسے ہوتے ہیں' جن میں ایک سے زیادہ لہجے (Tones) ہوتے ہیں اور ہر لہجے سے متن کے مختلف معنی برآمد ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض فن پاروں میں ایسا وجدانی تجربہ بیان ہوتا ہے' جس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے' لیکن اس کے اظہار سے اس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے یا بعض فن پاروں میں اس قدر ابہام ہوتا ہے' جس کو اصل زبان میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے یا اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں ذرا سی لغزش فن پارے کی پوری جہت کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ متن کی کلی تفہیم کی وجہ سے ہی ایک متن کے دو ترجموں میں بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جب کہ مترجم اپنے طور پر پوری طرح دیانت دار ہوتا ہے۔

3) متن سے ہم آہنگی

اس مرحلے میں مترجم متن کو اپنے ذہن و دل اور وجدان کا حصہ بناتا ہے یعنی تخیلی سطح پر متن کا تجربہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ہم آہنگی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب فن پارہ مترجم کے ذوق و مزاج اور طبیعت کے میلان کے مطابق ہو گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مترجم کا ذوق و مزاج فن پارے پر حاوی ہو جائے' فن پارے کا مزاج ہر حال میں مقدم ہوتا ہے۔ مترجم کو ہر حیثیت سے فن پارے کے مزاج میں ڈھلنا ہوتا ہے۔ مترجم کی فن پارے سے یہ ہم آہنگی ہی تخلیقی ترجمے کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ اسی ہم آہنگی کے وسیلے سے اصل معنی آفرینی اور اثر آفرینی کی ترجمے میں بازیافت ہوتی ہے۔ یہ ہم آہنگی ایک بڑا مسئلہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ تمام قابلیتوں اور مہارتوں کے باوجود مترجم کے لیے دوسری زبان اور تہذیب اکتسابی ہی ہوتی ہے اس لیے فلم کے ناظرین کی طرح تخیلی سطح پر وہ لاکھ خود کو فلم کا ہیرو تصور کرے لیکن وہ رہتا ناظر ہی ہے۔

4) ترسیل و ابلاغ

اس مرحلے میں مترجم' فن پارے کے معنی و مفہوم' اس کے وجدانی و تخیلی تجرات اور اثر آفرینی کو قاری کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔ یہ مرحلہ سب سے مشکل ہوتا ہے۔ خود سمجھنے اور تجربے سے گزرنے سے زیادہ دوسروں کو سمجھنا اور تجربے سے آشنا کرانا مشکل ہوتا ہے۔ ترسیل و ابلاغ کا یہ مسئلہ تخلیق سے زیادہ ترجمے میں پیچیدہ ہوتا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف الفاظ و خیال کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے' جب کہ مترجم مصنف کا پابند ہوتا ہے۔ ایسی دو زبانیں جو اپنی تہذیب اور مزاج کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوتی ہیں' کسی حد تک اس مسئلے کو حل کر لیتی ہیں یعنی وہاں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ کوئی لفظ یا ترکیب ترجمے میں من و عن رکھ لی جائے جیسے فارسی' ہندی' عربی وغیرہ زبانوں سے اردو میں ترجمہ۔ لیکن وہ زبانیں جن کا مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے وہاں ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا ہے جیسے انگریزی' فرانسیسی' روسی اور دیگر مغربی زبانوں سے اردو میں ترجمے۔ خصوصاً یہ مسئلہ شعری ترجمے میں ناقابل حل ہو جاتا ہے۔ انگریزی کی منظوم شاعری کو اردو میں نظم کے اسی اثر کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا صوتی نظام اور عروض و آہنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اسی لیے شیلی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت کے مترادف قرار دیا تھا۔

5) ترجمہ شدہ متن کا ادب پارہ ہونا

یعنی کوئی فن پارہ ترجمہ ہو کر بھی فن پارہ ہے اور اسے اصلی فن پارے کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فن پارے کا ترجمہ ترسیل کے نقطہ نظر سے بھرپور ہوتا ہے لیکن اس کی اپنی ادبی حیثیت کوئی نہیں ہوتی۔ فقط اس ترجمے کو پڑھ کر اصلی فن پارے کی ادبی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ جس کی مثال قرآن کے لفظی تراجم ہیں۔ قرآن ایک مذہبی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کا ایک بلند ترین نمونہ بھی ہے لیکن اس کے تراجم کو بعض اوقات بلند ترین تو کیا ادب کہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اس مرحلے میں مترجم کو فن پارے کے مرکزی خیال' جذبے اور تاثر کے ساتھ اس کے اسلوب و ہیئت کے مطابق ترجمے ہونے والی زبان کے ادبی مذاق کو پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس ذیل میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ادبی مذاقوں سے دیانت داری برتنا انتہائی مشکل ہے جس کے نتیجے میں ترجمے میں ترجمے پن کا عنصر پیدا ہونا ناگزیر

ہوتا ہے۔ یہاں مترجم کی یہ فن کاری ہوتی ہے کہ وہ ترجمے پن کے عنصر کو اس طرح برتے کہ وہ قارئین کے لیے قابل قبول ہو۔

8.4.1 افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل

شاعری کے مقابلے میں افسانوی ادب' زبان کی تہذیبی فضا کو زیادہ وضاحت وصراحت کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے افسانوی ادب کے تراجم کے لیے دو زبانوں کی ثقافتی جزئیات سے واقفیت لازمی امر ہے۔ یہ واقفیت خود ایک مسئلہ ہوتی ہے۔ افسانوی ادب میں بیان ہونے والے مقامات' رسم ورواج' طرز معاشرت' مسائل' عقائد اور اسی قسم کے دوسرے امور جو فن پارے کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں اور جن کی رو سے فن پارے میں معنی پیدا ہوتے ہیں ترجمے کے عمل میں ایک مسئلہ ہوتے ہیں۔ اس مسئلے کو کسی حد تک وضاحتی نوٹ سے حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود متن کے بین السطور معنی یعنی وہ معنی جو الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیے گئے ہیں' ترجمے میں ان کی جھلک بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ الفاظ کی صورت اور آہنگ سے بننے والے پیکر' تجنیس جیسی رسم الخط اور تلفظ پر مبنی صنعتیں' رعایت لفظی' مناسب الفاظ' مرصع اور مسجع نثری نمونے' جامع ترجمے کے عمل میں شکست خوردہ ہو جاتے ہیں' جیسے اردو کی داستانیں اور انشائیے نہ صرف بیانیہ کی وجہ سے جاذب نظر ہیں بلکہ ان کا حسن صنعتوں کے بہترین استعمال میں بھی ہے۔ دیانت دارانہ ترجمے کی صورت میں اگر مترجم کسی طرح ان مسائل پر قابو پانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری زبان کی تہذیب میں ان امور کی قدر و قیمت کیا ہے۔ ممکن ہے دوسری تہذیب میں یہ امور ترسیل کی راہ میں مخل سمجھے جاتے ہوں۔ اس لیے بقول انتظار حسین افسانوی ادب کے ترجمے میں دو نثری روایتیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتی ہیں اس لیے ان روایتوں میں مفاہمت پیدا کرنا مترجم کی فن کاری کی دلیل ہوتا ہے۔

8.4.2 شعری تراجم سے مختص مسائل

نثر کا بنیادی اسلوب ترسیلی اور وضاحتی ہوتا ہے' جب کہ شاعری رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شعر میں وزن' قافیہ وردیف کا بھی التزام ہوتا ہے۔ شعر کی یہی مجموعی ہیئت اس کی اثر آفرینی اور وجدانی تجربے کا باعث ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعری کا ترجمہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ شاعری کے ترجمے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کے بعد بھی شاعری رہے۔ عجیب قسم کا نثری نمونہ نہ بن جائے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں ہی ہونا چاہیے۔ نثری ترجمے سے اس کا شعری لطف زائل ہو جاتا ہے۔ چوں کہ ہر زبان کا عروضی اور صوتی نظام جدا ہوتا ہے اور مختلف اثرات کا حامل ہوتا ہے اس لیے شعر کی اصلی کیفیت کا ترجمہ ناممکن ہے۔ دوسرا مسئلہ ترسیل وابلاغ کا ہے۔ شاعری چونکہ رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے اور زندہ علامتیں اپنے اندر کئی معنوی جہت رکھتی ہیں۔ اس لیے علامتی لفظ کے بدلنے سے نظم کی پوری کائنات درہم برہم ہو جاتی ہے۔ شاعری کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ ایک متن کی مختلف قرأتوں سے مختلف معنی برآمد ہوں۔ شاعری میں معنی آفرینی کی خوبی زبان وبیان اور لفظیات کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ رعایت لفظی' مناسب الفاظ' الفاظ کے صوتی پیکر' ان کی غنائیت سب کچھ مل کر شعری معنی کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ترجمے کے عمل میں ان تمام امور کا ایک ساتھ منتقل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمے میں صرف شاعرانہ خیال یا اس کا مضمون ہی ترجمہ ہو پاتا ہے۔ بقیہ فنی نزاکتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ شعری ترجمے کے ان ہی مسائل کے پیش نظر شیلی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت قرار دیا تھا۔ ایذرا پاونڈ نے ترجمے کے نقطہ نظر سے شاعری کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

1) فونوپوئیا Phonapoeia : ایسی شاعری جس کا ترجمہ کسی حد تک ممکن ہے۔ اردو میں جیسے مثنوی کی بیانیہ شاعری یا ترقی پسندانہ خطابیہ شاعری یا سادہ شاعری
2) میلوپوئیا Melopoeia : ایسی شاعری جس کا ترجمہ ناممکن ہے اردو میں جیسے علامتی نظمیں غزلیہ شاعری
3) لوگوپوئیا Logopoeia : ایسی شاعری جس کا ترجمہ ناممکن ہے لیکن اصل خیال کی جھلک ترجمے میں آسکتی ہے اردو میں جیسے فکری وفلسفیانہ اور خیال بندانہ شاعری

آخر میں انگریزی اور جرمنی نظموں کے کچھ منظوم ومنثور یعنی نثری ترجموں کو ملاحظہ کیجیے :

جرمنی ادب کے مایہ ناز ڈراما نگار اور شاعر گوئٹے کی شاہ کار تخلیق ''فاؤسٹ'' کا نثری ترجمہ عابد حسین نے کیا ہے اور اس کا منظوم ترجمہ منور لکھنوی نے۔ ان دونوں ترجموں کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

	عابد حسین	منور لکھنوی
شاعر!	میرے سامنے اس رنگ برنگ مجمع کا نام	کیوں ذکر مجھ سے آخر اس بھیڑ بھاڑ کا ہے
	نہ ہو جسے دیکھ کر رفعتِ خیال رخصت	منظر یہ دیکھ کر دل الجھن میں پڑ گیا ہے
	ہو جاتی ہے مجھے اٹھتی ہوئی لہروں کا یہ	چڑھتی ہوئی ندی اک یہ بھیڑ واقعی ہے
	سیلاب نہ دکھاؤ جو ہمیں زبردستی	اک اک نفس میں کتنی وحشت بھری ہوئی ہے
	اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے	

ان دونوں اقتباسوں کے تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عابد حسین کا ترجمہ بہت پُر شکوہ ہے اور منور لکھنوی کا ترجمہ سادہ اور بے روح ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اصل متن کا یہ اقتباس نہ تو اتنا سادہ ہے نہ ہی اتنا پر شکوہ۔

انگریزی زبان کے شاعر Frazer کی ایک نظم کے دو اردو منظوم ترجمے ملاحظہ کیجیے۔

Epitaph	لوح مزار : منظور الدین خاں	لوح مزار : حسین الدین احمد
Stop, stranger stop	راہرو ٹھہر ذرا سنتا جا	ذرا اجنبی چلتے چلتے تو رک جا
As you pass by	تو اب جس حال میں ہے	تو جیسا ہے اب ایک میں بھی وہی تھا
So you are now	میں کبھی ایسا ہی تھا	ہوں جیسا میں اب، کل ترا حال ہوگا
Once was I	کل تجھے میری طرح ہونا ہے	تو نقش قدم پر مرے چل خدارا
So I am now, you	ایسا کچھ کر کے یہاں	
Once must be	سے تو چل	
Therefore? proper to follow me	(کہ بہت یاد رہے)	

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اردو ترجمے میں نظم کی ساری کیفیت، زائل ہو گئی، وہ سوز و گداز جو انگریزی نظم میں ہے اردو ترجمے میں نہیں ہے اس کے بعد وہ Therefore? کے بعد سوالیہ نشان سے شاعر نے جو مبہم معنویت پیدا کی ہے اردو نظموں نے اس کی وضاحت کر کے اس کو زائل کر دیا۔

8.5 خلاصہ

اردو زبان میں ترجمے کا آغاز اس کے ابتدا سے ہی ہو گیا تھا۔ اردو کے ابتدائی عہد میں الفاظ، محاوروں، ضرب الامثال، جستہ جستہ اشعار کا ترجمہ فارسی زبان سے ہوا۔ اردو میں باقاعدہ ادبی ترجمے کا آغاز قلی قطب شاہ کے عہد سے ہوتا ہے اس زمانے میں فارسی کی مثنویوں کو اردو میں مثنوی کی ہیئت میں ترجمہ کیا گیا۔ اردو ادب میں ترجمے کی مستحکم روایت کی وجہ سے ہی اردو میں بہت جلد اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق ہونے لگا اور انیسویں صدی تک اردو کے کلاسیکی ادب نے اپنے نقطۂ عروج کو حاصل کر لیا۔ اس لحاظ سے ادبی ترجمے کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ ادبی ترجمہ ایک بہت مشکل فن ہے۔ اس کے لیے دو تہذیبوں سے واقفیت بہت ضروری ہے لیکن ترجمے کے بعض مسائل ایسے ہیں جو مترجم کی تمام صلاحیتوں کے بعد بھی نا قابل حل ہوتے ہیں۔ نثری ترجمے میں تہذیبی جزئیات مسائل کھڑا کرتی ہیں جب کہ شعری ترجمے میں اس کی مجموعی ہیئت، وزن قافیہ وغیرہ۔ اس لیے بعض صورتوں میں شعری ترجمہ ناممکن ہوتا ہے۔

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو میں ادبی ترجمے کی روایت پر اظہارِ خیال کیجیے۔
2. شعری تراجم کی روایت پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. ادبی ترجمے کی اہمیت بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. شاعری کا مکمل ترجمہ کیوں ناممکن ہے؟ بیان کیجیے۔
2. افسانوی ادب سے مختص تراجم کے مسائل کون سے ہیں؟
3. ادبی تراجم کے مسائل بیان کیجیے۔

8.7 فرہنگ

آفاقی	ساری دنیا کا۔عالم گیر	ابلاغ	پہونچانا، بھیجنا
استقامت	استقلال، کسی امر پر مضبوط رہنا	اسلوب	طریقہ، طرزِ تحریر، روش
اکتشاف	کسی نامعلوم بات کا دریافت کرنا	تعامل	آپس میں عمل کرنا
توثیق	تصدیق، مضبوط کرنا	پیکر	چہرہ، شکل، صورت
جمالیات	حسن شناسی، فلسفہ کی وہ شاخ جس میں حسن اور اس کے لوازم سے بحث کی جاتی ہے۔		
بازیافت	کھوئی ہوئی چیز کی دستیابی، بازیابی	ترکیب	مرکب کرنا، بناوٹ، تدبیر
رمز وایما	اشارہ، غمزہ، عشوہ	لسانی گروہ	کسی زبان کو بولنے والا طبقہ
ہئیت	بناوٹ، شکل، حالت، وہ علم جس میں اجرام فلکی وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔		
مظہر	ظاہر ہونے کی جگہ، تماشا گاہ	غنائیت	موسیقیت، نغمے کی کیفیت
علامت	نشان، آثار، اشارہ	معنی آفرینی	معنی پیدا کرنا
مصنفی ترجمہ	جب مصنف خود اپنی کتاب کا ترجمہ کسی دوسرے زبان میں کرتا ہے تو اسے مصنفی ترجمہ کہتے ہیں		
مُظہر	بیان کرنے والا، گواہ		

8.8 سفارش کردہ کتابیں

1. خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری
2. ڈاکٹر قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت
3. اعجاز راہی — اردو زبان میں ترجمے کے مسائل
4. Jordon, Albert : Translation and Interculture understanding
5. Naide, Eugene, A. Theories of Translation

اکائی 9 : نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

ساخت

9.1 تمہید

9.2 نثری ترجمہ :اصول وتقاضے

9.3 منظوم ترجمہ :اصول وتقاضے

9.4 نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

9.5 خلاصہ

9.6 نمونۂ امتحانی سوالات

9.7 فرہنگ

9.8 سفارش کردہ کتابیں

9.1 تمہید

انسانی سماج ہمہ لسانی ہے۔مختلف خطہ ہائے زمین پر رہنے اور بسنے والوں کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ایک ہی ملک میں الگ الگ زبانیں بولی جاتی ہیں۔خود ہمارا ملک ہندوستان اس کی مثال ہے۔اس ہمہ لسانی انسانی سماج میں ایک دوسرے کے جذبات' خیالات' احساسات' افکار واحوال سے واقفیت کے لیے ترجمے کا عمل ناگزیر ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس زمانے سے انسان نے لکھنا' پڑھنا' سیکھا اور اپنے افکار وخیالات نیز جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے تحریر کا سہارا لینے لگا تقریباً اسی زمانے سے ترجمے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔جیسے جیسے نظم ونثر کی صورتیں متعین ہوتی گئیں اور ہمارا تحریری سرمایہ نظم ونثر کے دو اہم خانوں میں تقسیم ہوتا گیا ویسے ہی تحریر کی ان دو صورتوں یا اظہار کے ان دو طریقوں کے اصول وضوابط بھی متعین کیے جانے لگے۔اظہار کے ان دو طریقوں میں جب انسان کا احساسِ جمال' اس کا تخیل' اس کے مشاہدات اور جذبات کی شمولیت ہونے لگی تو اس اسلوبِ اظہار کو ادب کا نام دیا گیا۔تحریر وتقریر کی دو صورتیں نظم ونثر وجود میں آ ہی چکی تھیں۔اب ادبی اور ناراست طریقۂ اظہار کے لیے نظم کو مختص کر لیا گیا جب کہ نثر میں ادب کے علاوہ راست اظہاریے اور تحریر وتقریر کے دوسرے طریقوں کی بھی گنجائش رہی۔یعنی نثر میں لکھی گئی ہر تحریر یا کہی ہوئی بات ادب نہیں ہو سکتی۔ لیکن شعر میں یا نظم میں کہی جانے والی بات کن ہی ادبی تقاضوں کو برتتے ہوئے یا ہیئتی وصنفی لوازم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی کہی جائے گی۔ظاہر بات ہے کہ ادبی اظہار کے ان دو طریقوں یعنی نظم ونثر کے اپنے اصول ہیں تو ان کے ترجمے کے عمل میں بھی مختلف اصولوں اور طریقوں کو برتنا ہوگا۔یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ جب ہم نظم ونثر کے مابین پائے جانے والے فرق کو سمجھیں کیوں کہ ترجمہ کامیاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضوں سے کما حقہٗ واقفیت ہو۔اس اکائی میں ہم نثری اور منظوم ترجمے میں جو فرق پایا جاتا ہے' اس پر گفتگو کریں گے۔

9.2 نثری ترجمہ :اصول وتقاضے

ترجمہ خواہ نثری ہو یا منظوم' اس کی پہلی شرط مترجم کی ذولسانیت ہے۔اسے تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبان سے واقف ہونا چاہیے۔یہ واقفیت ان دونوں زبانوں پر قدرت کی حد تک ہو۔یہ قدرت صرف دو زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ پر ہی نہیں ہو بلکہ ان کی سماجی اور ثقافتی روایت پر بھی ہونا لازمی ہے۔ ہر لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ مرادی معنی بھی ہوتے ہیں اور یہ سماجی وثقافتی سرگرمیوں اور عوامل سے جڑے ہوئے ہیں۔اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مترجم کو

دونوں زبانوں کی لغت' اصطلاحات' محاورے اور مترادفات سے پوری طرح واقف ہونی چاہیے۔ ترجمے کے سلسلے میں یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی نوعیت عمومی ہے یعنی ترجمہ خواہ کسی بھی طرح کا ہو' مترجم میں مندرجہ بالا خصوصیات کا ہونا لازمی ہے

جب ہم نثری تراجم کی گفتگو کرتے ہیں تو اس سے مراد نثری ادب کا ترجمہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ترجمہ علمی کتابوں کے تراجم کے مقابلے میں کئی ایسی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے جو اسے محض لفظی ترجمہ نہ رہنے دیں بلکہ اس کی حیثیت بازتخلیقی ہو۔ کیوں کہ مترجم کو ادبی نثر پارے کے ترجمے کے وقت نہ صرف یہ کہ ایک زبان کے متن کو دوسری زبان کا جامہ پہنانا ہوتا ہے بلکہ اسے اس متن کی تاثراتی فضا' اس کی جمالیاتی سطح' اس کے تہذیبی حوالوں اور اس کے ادبی وفنی محاسن کو بھی ترجمے کے وقت نہ صرف یہ کہ برقرار رکھنا پڑتا ہے بلکہ ترجمے کی زبان کی تہذیب اور ادبی وفنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی ہمیں ایک ادبی فن پارے کو پوری طرح جذب کر کے ترجمے کی زبان میں اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ جذبے' خیال' رویے اور نظریے کی سطح پر کوئی ترمیم واضافہ نہ کیا گیا ہو۔ نثری ادب کے ترجمے میں جن اصول ولوازم کی اہمیت ہے ان پر ذیل میں گفتگو کی جارہی ہے۔

پہلا مرحلہ زبان کا ہے۔ مترجم کو تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبان سے پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ نثری ادب پارے کی زبان علمی کتابوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ادبی تصانیف کی زبان راست اظہاریہ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس میں فکر وجذبے کی آمیزش کے ساتھ جمالیاتی کیف وانبساط کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مختلف تہذیبی حوالے' لفظی ومعنوی تہہ داریاں' فکر وخیال کی نزاکت ونفاست اور جذبہ واحساس کی پیدا کردہ تاثراتی فضا ادبی نثر کا جوہر ہوتے ہیں۔ مترجم کو اس ادبی زبان کی متذکرہ بالا تمام خوبیوں کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے تصنیف اور ترجمہ دونوں کی زبانوں کے استعاراتی وتشبیہاتی نظام' تہذیبی اصطلاحات' ضرب الامثال اور روزمرہ سے گہری واقفیت ہونی چاہیے۔ اگر نثری ادب ایک افسانوی بیانیہ ہے تو مترجم کی ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ افسانوی بیانیہ کا ایک جز مکالمہ بھی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مکالمے کی زبان خود تخلیق کار کی زبان سے مختلف ہوتی ہے کیوں کہ مکالموں کی ادائیگی کرداروں کے ذریعے ہوتی ہے اور یہ مکالمے کردار کے سماجی وتہذیبی پس منظر' اس کے سماجی مقام ومرتبے اور تعلیمی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہی ہوں گے۔ مثلاً گئودان کا ''ہوری'' ۔فردوس بریں کے ''شیخ علی وجودی'' کے لہجے میں گفتگو نہیں کرے گا۔ دونوں کا لہجہ ان کے اپنے سماجی پس منظر اور علمی مقام ومرتبے کے مطابق ہی ہوگا۔ مترجم جب ان ادب پاروں کا ترجمہ کرے گا تو اسے سماجی' علمی وتہذیبی پس منظر کے اس فرق کو نہ صرف یہ کہ سمجھنا ہوگا بلکہ کوشش کرنی ہوگی کہ کرداروں کی گفتگو کے اس فرق کی جھلکیاں ترجمے میں بھی نظر آئیں۔ بیدی کے ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کا کردار تلو کے ایک تانگے والا ہے۔ شراب پی کر اپنی بیوی رانو کو روزانہ زدوکوب کرنا اس کا معمول ہے۔ رانو سے اس کی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

''کتیے کنجریئے!.....میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کررہا ہوں اور تو ہے کہ چھوٹتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوگئی''

دوران گفتگو ''باگ'' اور ''گھوڑے'' کے الفاظ تلو کے کے سماجی پس منظر کے عین مطابق ہیں۔ یہ الفاظ اس کے پیشے سے متعلق ہیں۔ اس لیے وہ ان سے اپنے جذبے وخیال کی ترسیل کا کام لیتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کا ایک اہم کردار حجتہ الاسلام ہے۔ ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کر لینے پر وہ اسے سمجھانے آتا ہے۔ اس موقع پر اس کی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

> ''اسباب کے بارے میں ایک کثیر الوقوع اور خطرناک غلطی یہ ہے کہ نتائج کو اسباب کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے گویا اسباب ہی فائل اور مکنون متصرف ہیں۔ پانی غلہ اگاتا ہے۔ کونین دافع تپ ہے۔ سنکھیا ثم قاتل ہے اور یہی **منطنه ' شرک خفی اعاذ لله منه** ہے اور میرے پندار میں **ومایومن اکثرهم بالله الادهم مشرکون** میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ غرض اسباب کا مسئلہ بڑا نازک اور مزلتہ الاقدام ہے۔''

حجتہ الاسلام علوم مشرقیہ کا عالم ہے۔ عربی' فارسی' فقہ' منطق' قرآن اور حدیث سے اس کی واقفیت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی گفتگو میں' اس کا یہ علمی پس منظر جھلکتا ہے۔ قرآن وحدیث کے حوالے' عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ کی بھرمار اور منطق کی پیچیدگی سے اس کا لب ولہجہ گراں بار ہے۔ اگر مترجم ان ادب پاروں کا ترجمہ کرتا ہے تو اسے مفہوم کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے اس تہذیبی منظرنامے سے پوری طرح واقف ہونا پڑے گا جس سے

متذکرہ بالا کرداروں کا تعلق ہے۔اس کے بعد ہی وہ صحیح ترجمہ کر سکتا ہے۔

موزوں الفاظ کا استعمال ترجمے کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ذیل کی مثالوں سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

1. He was a poor farmer — 1. وہ ایک غریب کسان تھا۔
2. Poor woman was weeping — 2. بیچاری عورت رو رہی تھی۔
3. Your writing is very poor — 3. تمہارا خط بے حد خراب ہے۔

دراصل ایک ہی لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اوپر دی گئی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔مترجم کو چاہیے کہ وہ لفظ کے تمام مفاہیم سے واقف ہو۔ایک ہی لفظ ادبی تحریر میں دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرے علوم کی تحریروں میں اس کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔ ''فلک'' کے معنی آسمان کے ہوتے ہیں لیکن اردو ادب میں بمعنی خدا اس کا استعمال عام ہے۔انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت اسے خدا کے ہی معنوں میں لیں گے لغوی معنی ''آسمان'' کی جگہ مرادی معنی ''خدا'' کا انتخاب کرنا مترجم کے لیے اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ اردو شعر و ادب کے سرمائے پر نظر رکھتا ہوگا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

''کون ہے؟ جبریل۔کیوں آئے ہو؟
سرکار فلک کے لیے کوئی پیغام

Who is there? Angel Gabriel

Any message for the Lord of heaven?

مترجم کو جملے کی ساخت سے کما حقہ واقف ہونا چاہیے۔انگریزی اور اردو میں جملے بنانے کے طریقے مختلف ہیں۔ادبی نثر میں بسا اوقات جملے بنانے کے طریقوں سے انحراف بھی کیا جاتا ہے۔اردو میں اس کی مثال فسانۂ عجائب ہے۔چونکہ سرور کا مقصد مقفیٰ عبارت کے ذریعے اپنی قدرت کلام کو ظاہر کرنا تھا اس لیے انہوں نے قافیہ بند جملے لکھے جو از روئے قواعد درست قرار نہیں دیے جا سکتے۔

ادبی نثر کی ایک خاصیت مصنف (ادیب) کا مخصوص لب و لہجہ ہوتا ہے۔کبھی اس کا انداز بیان سیدھا سادہ ہوتا ہے اور کبھی پیچیدہ، کبھی جذبے کی شدت ہر لفظ سے ٹپکتی ہے اور تکرار الفاظ کا عمل بتاتا ہے کہ مصنف جوش و جذبے سے سرشار ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طرز ادا اور تیور کی بنا پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ جذبے کی حیثیت موج تہہ نشیں کی سی ہے۔اب یہ کام مترجم کا ہے کہ وہ مناسب الفاظ اور موزوں تشبیہات و استعارات کے انتخاب کے ذریعے قاری کو صاحب تصنیف کے افکار کے ساتھ اس کے لب و لہجے سے بھی آشنا کرا دے۔

نثری ادب پارے کے ترجمے کے سلسلے میں مترجم کو ایک اور اہم نکتے پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔اسے نثری ادب پارے کے مرکزی خیال، مجموعی تاثر، الفاظ کی نشست و برخاست کی پیدا کردہ تاثراتی فضا کا عرفان و ادراک ہونا چاہیے۔چوں کہ ادبی نثر میں لفظ صرف خیال یا جذبے کی ترسیل کے لیے ہی نہیں استعمال کیا جاتا بلکہ کسی مخصوص فضا کا اظہار بھی ادیب کا مقصد ہوتا ہے۔

مترجم کی کوشش ہونی چاہیے کہ ترجمے کے عمل میں فضا سازی کا وہ وصف فراموش نہ کرے جو نثری ادب پارے کے مصنف کے تخلیقی عمل کا حصہ رہا ہو۔کامیاب مترجم وہی ہے جو نہ صرف الفاظ کا ترجمہ کرتا ہے بلکہ ادب پارے کی تاثراتی فضا کو بھی ترجمے میں برقرار رکھتا ہے۔ادبی شہ پارہ اگر نثر میں ہے تو مترجم کو تصنیف کی زبان کی نثری اصناف ادب سے بھی واقفیت ہونی چاہیے پھر اس مخصوص صنف ادب (نثری) پر بھی اچھی نظر ہونی چاہیے جس میں وہ شہ پارہ لکھا گیا ہے۔ترجمہ اگر ناول کا ہے تو ناول کے فن سے بھی مترجم واقف ہو اور اس مصنف کے دوسرے ناولوں پر بھی اس کی نظر ہو۔اگر نثری تصنیف کسی دوسرے علم کی کتاب ہے تو اس سے واقفیت ضروری ہے۔ظاہر بات ہے کہ ترجمہ نگار اگر اس مخصوص علم سے واقف نہ ہوا تو اس کے لیے عبارت کا ترجمہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

نثری ترجمے کے یہی وہ اصول اور تقاضے ہیں جن پر مترجم کی گہری نظر ہونی ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر وہ مندرجہ بالا نکات پر غور نہیں کرے گا تو ترجمے کے فن سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ نثری تصنیف خواہ ادبی ہو یا دوسرے علوم سے متعلق دونوں کا ترجمہ چند مخصوص تقاضے رکھتا ہے' جنہیں پورا کرنا مترجم کے لیے ضروری ہے۔ اس مرحلے پر مترجم کا وسیع مطالعہ' اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل ہی کام آ سکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. تحریر و تقریر کی دو صورتیں کیا ہیں؟
2. مترجم کو لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اور کس معنی سے واقف ہونا چاہیے؟

9.3 منظوم ترجمہ : اصول و تقاضے

شعر کا شعر میں ترجمہ منظوم ترجمہ کہلاتا ہے۔ کسی بھی شعری تخلیق کو جب ہم اس کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثیر کے ساتھ دوسری زبان میں شعری عمل کے ذریعے ڈھالتے ہیں تو اسے منظوم ترجمہ کہا جاتا ہے۔ اگر بغور دیکھیں تو یہ بازتخلیقی عمل کی ایک صورت ہے۔ کیوں کہ یہاں صرف الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ سے بدل دینے سے ہی کام مکمل نہیں ہوتا۔ بلکہ شعری تصنیف کی پوری فضا کو اس کے تمام تر تہذیبی حوالوں کے ساتھ ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرنا ہوتا ہے کہ اس زبان (ترجمے کی زبان) کے بھی ادبی و شعری مزاج کے تمام تر تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکے۔

جہاں تک منظوم ترجمے کے اصول و تقاضوں کا تعلق ہے تو دونوں زبانوں یعنی تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان سے واقفیت تو پہلی شرط ہے ہی۔ اس کے ساتھ ہی منظوم شہ پارہ جس زبان کا ہے اس کے تہذیبی پس منظر سے واقفیت بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی منظوم ترجمے کے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے' مترجم کا نہ صرف موزوں طبع ہونا' بلکہ عروض کی بنیادی باتوں سے واقف ہونا بھی ایک ضروری' بلکہ لازمی شرط ہے۔ مترجم سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ شعری ذخیرے اور شعری روایات سے بھی آشنا ہو۔ اسے اگر ان سے پوری واقفیت نہ ہو تو صحیح آہنگ اور صحیح فارمیٹ کا انتخاب کرنا مشکل ہوگا۔ منظوم ترجمے کے لیے صحیح ہیئت کا انتخاب بھی ضروری ہے۔ ایک بات اور بھی کہی جاتی ہے کہ نظم کا منظوم ترجمہ کرنے سے پہلے اگر اس کا نثری ترجمہ کرلیا جائے تو کام آسان ہو جائے گا۔ اور کوئی اہم پہلو نہیں چھوٹے گا۔ نثری ترجمے میں تو کچھ جملے بدلے جا سکتے ہیں کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن منظوم ترجمے میں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم کو منظوم ترجمے میں شعری تصنیف کی روح اور جذبے کو سمو دینا چاہیے۔ جگر مرادآبادی کا ایک شعر ہے:

اے متاعِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

ضابطے کی شاعری اور اچھی شاعری میں فرق ماورائے سخن والی بات ہوتی ہے۔ منظوم ترجمے میں ماورائے سخن کی جہت پر توجہ دینا اور اس کو سمجھنا' یہ جہت ترجمے میں لانا' ضابطے کے ترجمے (Regulation Translation) کی سطح سے اوپر اٹھنے کی عادت ڈالنا' مترجم کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

منظوم ترجمے کے وقت' مترجم کو یہ امر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کیا وہ فن کار کے اصل منشا و مقصد کو اس کی تمام تر شعری فضا کے ساتھ اپنے قاری تک پہنچا سکا ہے۔ کیوں کہ منظوم ترجمے میں محض مفہوم کی ترسیل تک ہی معاملہ محدود نہیں رہتا۔ بلکہ شعری تصنیف کی وہ فضا جو تشبیہات' استعارات' احساس جمال' قوت تخیل اور جذبہ و احساس کے باہمی اتصال و امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ اس تک قاری کی رسائی ہونی ضروری ہے۔ ہر زبان کا اپنا تشبیہاتی و استعاراتی سرمایہ ہوتا ہے۔ اپنے محاورے' تراکیب اور علامتیں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ دوسری زبان میں وہ لفظ بہ لفظ موجود ہوں اس لیے مترجم کو چاہیے کہ ان کے لفظی ترجمے پر زور نہ دے بلکہ ان کے مفہوم اور معنی کی ترجمانی' ترجمے کی زبان میں پائے جانے والے ان کے مترادفات و مماثلات کے ذریعے کرے۔

ہر شعری تخلیق کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جو طرز بیان' ادائے نگارش' انداز تخاطب اور لب و لہجہ کی بنا پر دوسری شعری تخلیق سے مختلف ہوتا ہے۔

مترجم کو منظوم ترجمہ کرتے وقت ان سب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اپنے معتقدات' احساسات اور جذبات کو شاعر بہترین الفاظ میں نظم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مترجم کا فریضہ ہے کہ وہ ترجمے میں بھی اس صورت کو برقرار رکھے۔

منظوم ترجمے کے وقت ہئیت و فارم کا تعین بھی بے حد ضروری ہے۔ اردو شاعری کی اصناف اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتی ہیں۔ اصناف شعر ہر زبان میں الگ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً غزل فارسی میں ہے انگریزی میں نہیں ہے۔ مترجم کو یہ چاہیے کہ شعری متن جس ہئیت میں ہے اس کے قریب ترین جو ہئیت ترجمے کی زبان میں ہو اس کا انتخاب کرے تاکہ اصل فن پارے کی بیشتر شعری خصوصیات ترجمے میں منتقل ہو سکیں۔ منظوم ترجمے میں ایک اور خوبی ہونی چاہیے جس زبان میں منظوم ترجمہ کیا جائے اس زبان کی شاعری کے معیار پر اسے پورا اترنا چاہیے۔ شعری تخلیق کا آہنگ' موسیقیت' تاثراتی فضا اور کیفیت کو ترجمے میں منتقل کرنے میں مترجم تبھی کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ تصنیف و ترجمے دونوں کی زبان کے ادبی' شعری اور فنی تقاضوں سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔

ہم منظوم ترجمے کو کئی حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لفظی ترجمہ' آزاد ترجمہ' ماخوذ ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ۔ محض لفظی منظوم ترجمہ ہر قسم کی تخلیقی خصوصیات سے محروم ہوتا ہے اور مکھی پر مکھی بٹھانے کا کام کیا جاتا ہے۔ آزاد ترجمے میں شعری تخلیق کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثراتی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے ترجمے میں بڑی حد تک ترجمے کی زبان کے شعری لوازم سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ماخوذ ترجمہ بھی اس سے قریب ہوتا ہے اس میں بھی اصل شعری تخلیق سے مرکزی خیال اخذ کیا جاتا ہے۔ لیکن شاعر اپنے افکار و خیالات اور اپنے تجربات بھی اس میں شامل کرتا ہے' لیکن تخلیق کے مرکزی خیال کو باقی رکھ کر۔ منظوم ترجمے کی سب سے ارفع و اعلیٰ شکل تخلیقی ترجمہ ہے۔ اس میں مترجم' شاعر کے جذبات' احساسات اور کیفیات و تاثرات کو اپنے دل و دماغ پر اس طرح طاری کر لیتا ہے کہ وہ اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جائے پھر اپنی زبان میں اسے اسی طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی حیثیت بازتخلیقی ہو جاتی ہے۔

نثری ترجمے کے مقابلے میں منظوم ترجمے کی مشکلات زیادہ ہیں۔ ذیل میں منظوم ترجمے میں پیش آنے والی مشکلات پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

طبعی علوم کے علاوہ' ہر علم کی اصطلاحیں آہنی سانچے کی طرح قطعی نہیں ہوتیں' بلکہ طبیعیات کی بعض اصطلاحوں اور تعریفوں میں قطعیت نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان میں لفظوں کے بہت متعین معنی نہیں ہوتے۔ یہی نہیں زیادہ لفظ ایسے ہیں' جن کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں' اور بعض وقت ایک ہی لفظ کے دو متضاد معنی بھی ہوتے ہیں۔ شروع میں ایک لفظ کا ایک ہی مفہوم رہا ہوگا۔ وہ بنیادی معنی آج بھی لغوی معنی ہیں۔ لیکن ہر لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اصطلاحی معنی بھی ہوتے ہیں' اور ان میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اصطلاحوں میں ظاہر ہے لفظ ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہر علم کی اصطلاح ایسی ہو' جو صرف اسی کے لیے مخصوص ہو تو افراتفری کم ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر دوسری قسم کی افراتفری پیدا ہوتی ہے' جو تعریف وضع کی جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر تعریف' معین معنوں کے باوجود مدور ہوتی ہے۔ منتہی کو کنفیوژن نہیں ہوتا' لیکن مبتدیوں کے لیے یہ پہلو افراتفری پیدا کرتا ہے۔

ان دو مرحلوں کے علاوہ' ایک مرحلہ اور بھی ہے اور وہ ہے Concept کی سطح پر' Micro سطح پر ایٹم کے اجزا پروٹون (Proton) اور الکٹرون (Electron) بنیادی پارٹکلز (Fundamental Particles) بھی ہیں۔ لیکن لہر (Waves) بھی ہیں۔ ایسی صورت حال میں عالموں اور ماہروں کے لیے تو مشکلات ہوتی ہی ہیں' ترجمہ نگار' جو عام طور سے اس مخصوص علم کا ماہر نہیں ہوتا' اس کے لیے بھی عبارت کا ترجمہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ دشواری علوم کے سلسلے میں ہی نہیں۔ ادب اور خاص طور سے شاعری کی سلسلے میں بھی پیش آتی ہے۔ ذو معنیٰ الفاظ ہی کی وجہ سے نہیں' مضارع کے استعمال کی وجہ سے بھی دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شعر کے دو یا دو سے زیادہ معنی ایہام' یا لہجے کی وجہ سے ہوں..... کہ ایک لہجے میں پڑھنے سے شعر کے ایک معنی اور دوسرے لہجے میں پڑھنے سے دوسرے معنی ہوں..... تو ظاہر ہے ترجمہ کی ادائیگی کے راستے میں دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ملاحظہ ہو:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟ (دعوت کے لہجے میں)

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟! (مایوسی کے لہجے میں' کہ کوئی نہیں!)

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اب اس کا منظوم ترجمہ (شرح کے بغیر) کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتا۔ دوسری زبان میں ایسی صورت کسی نظم کی ہو' تو اردو میں بھی اس کا ترجمہ

تشریح کے بغیر نہیں ہوسکتا اور منظوم ترجمے میں تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کی ایک نظم پہاڑ اور گلہری ہے جو ایمرسن سے ماخوذ ہے نظم ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے ” تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مرے“
”ذراسی چیز ہے، اس پر غرور ؟ کیا کہنا ! یہ عقل اور یہ سمجھ ...... یہ شعور ! کیا کہنا !“
”خدا کی شان ہے، نا چیز ۔ چیز بن بیٹھیں جو بے شعور ہوں، یوں باتمیز بن بیٹھیں“
” تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے“

”جو بات مجھ میں ہے، تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں!
بھلا پہاڑ کہاں ؟ جانور غریب کہاں ؟“

کہا یہ سن کے گلہری نے ” منہ سنبھال ذرا یہ کچی باتیں ہیں، دل سے انہیں نکال ذرا“
” جو میں بڑی نہیں تیری طرح ۔ تو کیا پروا نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا “
” ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے کوئی بڑا، کوئی چھوٹا ۔ یہ اس کی حکمت ہے“
” بڑا جہا ن میں تجھ کو بنا دیا اُس نے مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے“
”قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں نری بڑائی ہے ! خوبی ہے اور کیا تجھ میں ؟“
” جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو یہ چھالیہ ہے ! ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو !“

”نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں!“

علامہ اقبال اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کا شمار اس خاص زمرے کے شاعروں میں ہوتا ہے، جو عہد آفریں کہلاتے ہیں۔ بچوں کے لیے بہت کم شاعروں نے لکھا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اقبال نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں، طبعزاد بھی ......اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ نظم بڑی رواروی میں لکھی۔ شروع میں ایک شعر تمہید کا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ مثلاً وہ نظم اس طرح شروع کر سکتے تھے :

پہاڑ اور گلہری میں تھا بہت ہی پیار
پر ایک روز ہوئی دونوں میں بہت تکرار

رواروی میں علامہ نے یہ نظم لکھی ۔ NUT کا ترجمہ چھالیہ کیا ہے۔ حالانکہ یہاں مراد اخروٹ سے ہے۔ لفظی ترجمے کی توقع نہیں کرنی چاہیے کیونکہ علامہ اقبال نے خود اس نظم کو ماخوذ از ایمرسن لکھا ہے۔ اس کے باوجود اس میں چھالیہ نہیں اخروٹ توڑنے کی بات ہوتی تو اچھا ہوتا :

جو تو بڑا ہے تو چھوٹا سا یہ ہُنر دکھلا
مری طرح سے اک اخروٹ توڑ کر دکھلا

بچوں کے لیے علامہ اقبال کی اور نظمیں بھی ہیں جو یا تو آزاد ترجمے ہیں یا انگریزی نظموں پر مبنی ہیں۔ جیسے ایک گائے اور بکری، ہمدردی اور ماں کا خواب۔

ادبی فن پاروں اور منظوم ترجموں میں ایک زبان کا اسلوب دوسری زبان میں برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی نثر میں یہ زیاں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ البتہ نظم میں زبان کی چاشنی، اور ڈکشن ہو بہو منتقل نہیں ہوسکتا۔ اردو والے، جنہوں نے فارسی پڑھی ہے، فارسی زبان کی نزاکتیں سمجھتے ہیں۔ کہیں کہیں جانکار بھی زچ ہو جاتے ہیں۔ خود غالبؔ جن کا خیال تھا کہ فارسی ان کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ بیدلؔ کے ایک مصرع کا ترجمہ نہ کر سکے اور انہوں نے مقطع میں بیدل کا مصرع جوں کا توں رکھ دیا :

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ
''عالم ہمہ افسانۂ ما داردو ما ہیچ''

غالبؔ سے پہلے خدائے سخن میر تقی میرؔ، جنہوں نے اپنی خودنوشت فارسی میں لکھی اور جو فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، انہوں نے بیدلؔ کی اس غزل پر غزل کہی، لیکن فارسی ہی میں اور مطلع میں بیدلؔ کے اس مصرع پر تضمین کی۔ سوداؔ نے ان سے پہلے اردو میں اسی زمین میں غزل کہی اور بیدلؔ کے فارسی مصرع کو مقطع میں رکھا، اردو میں منتقل نہ کر سکے۔ گو کہ فارسی ان کے مزاج میں بھی رچی بسی تھی۔ چندر بھان برہمن کا ایک شعر ہے:

ببیں کرامت بت خانۂ مرا اے شیخ
چوں خراب شود، فسانہ، خدا گردد

شعر اردو میں منتقل نہ ہوسکا۔ البتہ اس کا مفہوم اور تاثر کسی حد تک اردو میں آ سکا۔ کچھ اضافے اور کچھ کمی کے ساتھ :

اک دل ہے کہ اجڑ جائے تو بستا ہی نہیں
ایک بت خانہ ہے اجڑے تو حرم ہوتا ہے

اسے تاثر تو کہا جا سکتا ہے، ترجمہ نہیں۔

مثنوی مولانا روم (مثنوی مولوی معنوی) یعنی جلال الدین رومی کی مثنوی کو ہست قرآں در زبان پہلوی کہا جاتا ہے اور اس سے مذہبی عقیدت بھی وابستہ ہے۔ خواجہ شمس الدین حافظؔ کو لسان الغیب کہا جاتا ہے۔ صدیوں سے ان کے دیوان سے فال نکالنے کا دستور ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں کے منظوم اردو ترجمے نہیں ہوئے۔ یعنی مکمل منظوم ترجمے نہیں ہوئے، حالانکہ شریمد بھگوت گیتا کے مکمل ترجمے بھی ہوئے اور مسلمان شعرا نے بھی کچھ ترجمے کیے۔ مثنوی مولانا روم کا نثر میں ایک اچھا ترجمہ قاضی سجاد حسین نے کیا اور حافظ کے دیوان کا نثر میں مکمل ترجمہ عبدالحکیم خاں نشترؔ جالندھری نے کیا۔ اس کے علاوہ اور ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ منظوم ترجمے کے لیے یہ دونوں کام پہلے مرحلے کے بنیادی کام ہیں۔ لیکن اردو میں منظوم ترجمے کرنا ایسا پروجیکٹ ہے جس سے آج شاید ہی کوئی فردِ واحد عہدہ برآ ہو سکے۔

شان الحق حقی نے ایک پروجیکٹ کی طرح مشرق اور مغرب کی زبانوں کے کچھ شعری شاہکاروں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ''درپن در پن'' ان کے تراجم کا مجموعہ ہے۔ اس میں سوا سو سے زیادہ منظومات ہیں۔ قرآن پاک کی چار سورتوں کا بھی منظوم ترجمہ اس مجموعے میں ہے اور کتاب کی ابتدا انہی سے ہوئی ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ یہ نظم ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ اس کے تین بند یہ ہیں:

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا؟
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

یہ سحر کا حسن ' یہ سیارگاں اور یہ فضا
یہ معطر باغ ' یہ سبزہ ' یہ کلیاں دلربا
یہ بیاباں ' یہ کھلے میدان ' یہ ٹھنڈی ہوا
سوچ تو کیا کیا کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے کی نعمتیں جھٹلائے گا

خُلد میں حوریں تری مشتاق ہیں ' آنکھیں اُٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور ' جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں ' کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا ؟

جوشؔ کی اس نظم میں قرآن کے اسلوب کے جاہ وجلال کی ذراسی بھی رمق نہیں ۔ایک وجہ شاید اس کی یہ بھی ہے کہ جوشؔ نے رمل محذوف کا جو آہنگ اس کے لیے چنا (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) وہ سب سے کاہل آہنگ ہے' اور اس سورۃ کے ترجمے کے لیے مناسب نہیں ۔**فبای آلآء ربکما تکذبن** O (اردو میں آسانی سے پڑھنے کے لیے : **ف ب ای آلاے ربکا ماتکذبان**) کاوزن عروضی ہے : متفاعِلُن ' فاعِلُن ' متفاعِلُن فعل ۔ اگر جوشؔ نے رمل ـ کے بجائے کامل کا آہنگ رکھا ہوتا اور محنت کی ہوتی 'تو شاید قابل ذکر نتیجہ سامنے آتا ۔کامل سالم کے آہنگ میں جوشؔ نظم کرنے پر قادر تھے ۔لیکن بندھے ٹکے آہنگ سے ذرا سا انحراف کر کے ایک مزاحف آہنگ وضع کرنا شاید وہ جائز نہ سمجھتے ۔متفاعلن کے ساتھ مُتفعِلُن کا خلط کرنے کی بھی مثال ان کے کلام میں نہیں ملتی' حالانکہ فارسی میں ایسا کثرت سے نہ سہی لیکن ہوتا رہا ہے ۔سعدیؔ کی نعت بلغ العلا بکمالہٖ میں ایسا ہے ۔کامل سے ہٹ کر بھی ایک آہنگ اس کے لیے مناسب تھا ۔

تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے

چودہ رکنی متدارک مخبون فَعِلُن 'مصرعے میں سات ارکان ۔ تسکینِ اوسط سے ہر فعلن فعْ لُن بھی ہوسکتا ہے ۔اس کی وجہ سے آزادی اور آسانی بھی ہوتی ہے اور آہنگ میں رنگارنگی بھی پیدا ہوتی ہے ۔

شعر کا منظوم ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کا اصل متن کے معنی پوری طرح سمجھنا بھی ضروری ہے اور ترجمے کی زبان میں شعر کہنے پر پوری طرح قادر ہونا بھی ضروری ہے ۔طبعزاد شعر کہنے کا ملکہ اور ہے اور ترجمے کی ذمے داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا اس سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے ۔ طبعزاد شعر میں مضمون کم زیادہ کیا جاسکتا ہے ۔ترجمے میں نہیں ۔منظوم ترجمے کی ذمے داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے لیے مناسب ہے کہ پہلے نثر میں ترجمہ کرلیا جائے' پھر اصل متن اور ترجمہ کو سامنے رکھ کر طے کیا جائے کہ منظوم ترجمہ کے لیے بحر اور آہنگ کیا ہو؟ فارمیٹ کیا ہو؟ مردف اور مقفّٰی...... یا صرف قافیے رکھے جائیں' ردیف نہ رکھیں اور اگر اصل متن میں آزاد نظم' یا نظم معرا کا فارمیٹ ہو' تو ترجمہ بھی اسی طرز اور ہیئت میں ہو ۔

امیر خسروؔ کی ایک غزل ہے' جس کا مطلع ہے :

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تارگشتہ' حاجت ِ زنار نیست

ظ انصاری نے ''خسرو کا ذہنی سفر'' میں ص 139 پر اس مطلع کا نثر میں یہ ترجمہ کیا ہے:

''میں عشق کا مارا کافر۔ مجھے مسلمانی کی حاجت کیوں؟ اور میری ہر رگ تار بن گئی ہے اس لیے مجھے زنار کی بھی ضرورت نہیں۔''

شان الحق حقی نے در پن در پن کے صفحہ 69 پر منظوم ترجمہ یہ کیا ہے:

عشق کا بندہ مسلمانی مجھے درکار کیا
میری ہر رگ تار ' مجھ کو حاجتِ زنار کیا

حاجت عربی لغت ہے اور اس کے معنی ضرورت ہیں۔ اردو میں اس لفظ میں ایک اضافی معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ جس سے اس کی فضا متاثر ہوئی ہے۔ شاید اس وجہ سے مرکب لفظ رفع حاجت بنا' اور وہ کم از کم لکھنؤ میں ضرورت کے معنی میں مستعمل نہیں' باوجود غالبؔ کے مشہور شعر کے:

کون ہے' جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

''کس کس'' کی جگہ غالبؔ نے ''کس'' سے کام چلانے کی کوشش کی ہے۔

فارسی میں امیر خسروؔ کا مطلع بہت خوب ہے' لیکن اردو ترجمے میں دونزاکتوں کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں' لازمی ہے۔ حاجت کے علاوہ مسلمانی کے بھی اضافی معنی ہیں اور اس کے استعمال سے اردو میں ذم کا پہلو' بہت قبیح نکلتا ہے۔ تیس برس پہلے' جب خسرو کا جشن منانے کے ہنگامے تھے' تو ڈائرکٹوریٹ جنرل آل انڈیا ریڈیو میں (جب ٹیلی ویژن بھی ڈائرکٹوریٹ کے تحت تھا) خسروؔ کے بارے میں قومی پروگراموں کی نگرانی ہی نہیں' پروگرام لکھنے کی خدمت بھی میرے سپرد کی گئی تھی۔ اتفاق ہے کہ اسی غزل کا مجھے ترجمہ کرنا پڑا۔ جن قباحتوں کا ذکر کیا گیا ہے' اُن کے پیش نظر قافیہ بدل کر ترجمہ کیا گیا۔ ذیل میں شان الحق حقی اور راقم الحروف کا منظوم ترجمہ دیا جا رہا ہے۔

عشق کا بندہ ' مسلمانی مجھے درکار کیا
میری ہر رگ تار' مجھ کو' مجھ کو حاجت زنار کیا

میرے سرہانے سے اٹھ بھی جا بس اے ناداں طبیب
درد مندِ عشق کا چارہ بجز دیدار کیا

مژدہ اے دل کل تجھے بازارِ عشق میں
قتل کا وعدہ ملا ' پھر حسرتِ دیدار کیا

ناخدا کشتی میں میری گر نہیں ' اچھا نہ ہو
میں خدا رکھتا ہوں ' مجھ کو ناخدا درکار کیا

کہتی ہے دنیا کہ خسروؔ ہو گیا ہے بت پرست
جی بجا ہے' ہو گیا ' دنیا سے مجھ کو عار کیا

قافیے برقرار رکھتے ہوئے ترجمے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں لیکن بہ وجوہ' اگر قافیے بدلنا پڑیں تو بھی شاید ترجمہ ممکن ہے۔

راقم الحروف کا ترجمہ:

عشق کا بندہ ہوں میں' اب دین کیا' اسلام کیا
ہر رگِ جاں تار ہے' زنار سے اب کام کیا

چارہ گر ' نادان چارہ گر ' مجھے للہ چھوڑ

اس دوا دارو سے مجھ کو ہوگا اب آرام کیا

قتل کرنے آئے تو جی بھر کے دیکھیں گے اُسے

اس سے بڑھ کر اور ہوسکتا ہے اب انعام کیا

ناخدا کوئی نہیں کشتی میں ؟.....اچھا ہی ہوا

ناخدا کے آسرے سے بڑھ کے ہے الزام کیا

کچھ سنا خسرو ! تمہیں کہتی ہے دنیا بت پرست

جو بھی کہتی ہے کہے ' دنیا سے مجھ کو کام کیا

اپنی معلومات کی جانچ :

1. منظوم ترجمے کی کتنی اقسام ہیں؟
2. ہست قرآں در زبان پہلوی کس کو کہا جاتا ہے؟
3. جوش ملیح آبادی نے قرآن پاک کی کس سورۃ کا منظوم ترجمہ کیا ہے؟

9.4 نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

نثری اور منظوم ترجمے کے اصولوں اور تقاضوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ سب سے بڑی شرط ذولسانیت کی ہے' جو نثری اور منظوم دونوں ترجموں کے لیے ضروری ہے۔ ترجمے اور تصنیف کی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ پر قدرت اور ان زبانوں کے تہذیبی پس منظر سے آگاہی اور محاورات وضرب الامثال سے واقفیت دونوں طرح کے ترجموں کے لیے ضروری ہے۔ نثری اور منظوم ترجمے میں اگر کوئی بہت بڑا فرق ہے تو وہ یہ ہے کہ منظوم ترجمہ کرنے والے کو موزوں طبع ہونا چاہیے اور دونوں زبانوں کے شعری سرمائے پر نہ صرف یہ کہ اس کی گہری نظر ہو بلکہ وہ دونوں زبانوں کے شعری تلازمات اور تشبیہی و استعاراتی نظام سے بخوبی واقف ہو۔ جملوں کی ساخت اور مکالموں کی زبان نیز لب ولہجہ کا خیال رکھنا نثری ترجمے کا اہم تقاضا ہے۔ نثری تصانیف میں مترجم کو صرف مصنف کی ہی زبان سے سابقہ نہیں پڑے گا بلکہ اس کو ناول ' افسانے' داستان اور ڈرامے کے کرداروں کی زبان کو بھی اس کے تمام تر تہذیبی و سماجی حوالوں کے ساتھ سمجھنا پڑے گا۔ منظوم ترجمے میں اسے ایسی کسی صورت حال کا سامنا نہیں ہوتا۔ منظوم ترجمے میں مصنف کو ہئیت یا فارم کا بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جس شعری تخلیق کا وہ ترجمہ کر رہا ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ جس فارم میں ہو وہ فارم ترجمے کی زبان میں بھی موجود ہو۔ ایسے موقع پر مترجم کو ترجمے کی زبان میں ایسی ہی شعری صنف کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو طرز ادا' موضوع اور فارم کے لحاظ سے شعری تخلیق سے قریب تر ہو۔ نثری ترجمے میں اس طرح کی دقت کم پیش آتی ہے۔ ان چند نکات کے علاوہ نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضے تقریباً یکساں ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مترجم کا موزوں طبع ہونا کس ترجمے کے لیے ضروری ہے؟
2. ہیئت یا فارم کا انتخاب مترجم کو کس ترجمے میں کرنا پڑتا ہے؟

9.5 خلاصہ

ترجمہ خواہ نثری ہو یا منظوم، مترجم کی ذولسانیت پہلی شرط ہے۔ اسے تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ، محاورات، مترادفات، تشبیہات واستعارات نیز اس زبان کے تہذیبی وسماجی پس منظر سے گہری واقفیت ہونی چاہیے۔

نثری ترجمے کے لیے مصنف کو زبان کے ساتھ ہی نثری اصناف ادب سے بھی واقفیت ہو۔ جملوں کی ساخت اور نثری ادب پارے کی مکالماتی زبان کی خصوصیات اور اس کے پس پردہ کارفرما تہذیبی محرکات سے بھی وہ واقف ہو۔ موزوں الفاظ کا استعمال بھی نثری ترجمے یا منظوم ترجمے کی اہم ضرورت ہے۔ منظوم ترجمہ بھی کم وبیش اسی طرح کے تقاضے رکھتا ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ ترجمہ خواہ منظوم ہو یا نثری اس تاثراتی فضا کو قاری تک پہنچانے کی کوشش کرے جو اس نثری یا شعری فن پارے میں موجود ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مترجم کو فن پارے کے مرکزی خیال، مجموعی تاثیر، الفاظ کی نشست و برخاست اور اسلوب اظہار سے مکمل واقفیت ہو۔ وہ ادب پارے کی ان تمام خصوصیات کو خود میں جذب کرلے۔ منظوم ترجمے کے لیے مترجم کا موزوں طبع ہونا اور تصنیف وترجمہ دونوں کے شعری سرمایے نیز اصناف شعر پر گہری نظر ہونا لازمی ہے۔ منظوم ترجموں کے لیے مترجم کو فارم یا ہیئت کے انتخاب کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس شعری تخلیق کا وہ ترجمہ کررہا ہے۔ ترجمے والی زبان میں کون سی شعری صنف ایسی ہے جو ہیئت اور مزاج کے اعتبار سے اس شعری تخلیق کے قریب ہے۔ نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضوں اور اصولوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہاں مترجم کا موزوں طبع ہونا منظوم ترجمے کی اہم شرط ہے۔ اسی طرح دونوں قسم کے ترجموں میں زبان وبیان پر قدرت اور زبان کے تہذیبی ولسانی سرمایے سے مکمل واقفیت ضروری ہے۔

9.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. نثری ترجمے کے اہم اصولوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. منظوم ترجمے کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
3. نثری اور منظوم ترجمے کے لیے مترجم کو کن اہم نکات کو ذہن میں رکھنا چاہیے؟

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. جملوں کی ساخت اور مکالموں کی زبان کو سامنے رکھنا نثری ادب کے مترجم کے لیے کیوں ضروری ہے؟
2. امیر خسرو کی غزل کے منظوم ترجموں کی روشنی میں منظوم ترجمے کی مشکلات کا جائزہ لیجیے۔

9.7 فرہنگ

ناراست	=	جو سیدھا نہ ہو	راست	=	سیدھا
ذولسانیت	=	دو زبانوں سے واقفیت	بازتخلیقی	=	دوبارہ پیدا کرنا
انبساط	=	خوشی، شادمانی	زدوکوب	=	مار پیٹ
مکنون	=	پوشیدہ، چھپا ہوا	ادراک	=	عقل، فہم، رسائی
متصرف	=	قابض، قبضہ کرنے والا، برتنے والا	اتصال	=	میل، قرب، ملاپ، نزدیکی
ادائے نگارش	=	طرز تحریر، لکھنے کا طریقہ	ارفع	=	نہایت بلند، عالی مرتبہ

منتہی = انتہا کو پہونچا ہوا، عالم، تحصیل علم سے فارغ مبتدی = نو آموز، ابتدا کرنے والا

ذم = مذمت، برائی، ہجو

تضمین = ملانا، شامل کرنا، اصطلاح شاعری میں دوسرے کے شعر پر مصرعہ یا بند لگانا

لسان الغیب = غیب کی زبان، حافظ شیرازی کا لقب

زنار = جینو، وہ دھاگا جو ہندو گلے اور بغل کے درمیان ڈالے رہتے ہیں۔

خلط = آمیزش

9.8 سفارش کردہ کتابیں

1. عطش درّانی — اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1994ء
2. اعجاز راہی — روداد سمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، 1994ء
3. خلیق انجم — فنِ ترجمہ نگاری، دہلی، 1995ء
4. نثار احمد قریشی — ترجمہ: روایت اور فن، اسلام آباد، ستمبر 1985ء
5. قمر رئیس — ترجمے کا فن اور روایت، دہلی، جون 1976ء

اکائی 10 : اردو میں علمی وفنی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

10.1 تمہید

10.2 علمی ترجمے کے اصول اور اصطلاح سازی

10.3 اردو میں علمی ترجمے کی ابتدائی روایت

10.4 علمی وفنی ترجمے کے ادارے

10.4.1 فورٹ ولیم کالج میں علمی وفنی تراجم

10.4.2 فورٹ سینٹ جارج کالج میں علمی وفنی تراجم

10.4.3 دارالترجمہ شمس الامرا میں علمی وفنی تراجم

10.4.4 نوابین اودھ کے زیر اہتمام علمی وفنی تراجم

10.4.5 ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی کالج میں علمی وفنی تراجم

10.4.6 سائنٹفک سوسائٹی میں علمی وفنی تراجم

10.4.7 مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمے میں علمی وفنی تراجم

10.4.8 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں علمی وفنی تراجم

10.4.9 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں علمی وفنی تراجم

10.4.10 مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں علمی وفنی تراجم

10.5 خلاصہ

10.6 نمونۂ امتحانی سوالات

10.7 فرہنگ

10.8 سفارش کردہ کتابیں

10.1 تمہید

قوموں کی ترقی میں ترجمے بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہی وہ وسیلہ ہے، جس کے ذریعے دوسری زبانوں میں موجود علوم وفنون تک ایک ایسے شخص کی رسائی بھی ممکن ہو جاتی ہے، جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا۔ اگر کوئی مترجم اس شخص کی مادری زبان میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کر دے، تو پھر وہ بھی نئے علوم اور ان کی باریکیوں سے آگاہ ہو سکتا ہے نتیجتاً قوم کی ترقی میں حسبِ استعداد ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ کسی زبان کی مقبولیت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس میں علوم وفنون کی کتنی کتابیں موجود ہیں۔ آج عالمی سطح پر انگریزی کی عالمی مقبولیت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس میں دنیا بھر کے علوم وفنون سے متعلق کتابیں دستیاب ہیں اور ان میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے عالموں نے بھی اس بات کو محسوس کیا تھا کہ زبان اور قوم کی ترقی کا راز علمی وفنی معلومات پر ہے۔ چوں کہ اردو کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے اس لیے علمی وفنی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اردو کا ابتدائی سرمایہ

شعروشاعری اور فکشن یا داستانوں پر مشتمل تھا۔لیکن جب اردو زبان نے ہندوستان بھر میں مقبولیت حاصل کی اور عام طور پر بولی لکھی اور پڑھی جانے لگی تو یہ ضروری ہوگیا کہ علوم بھی منتقل کیے جائیں' جس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ دوسری زبانوں سے علوم وفنون کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جائیں تا کہ اردو بولنے والے دوسری ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔

10.2 علمی ترجمے کے اصول اور اصطلاح سازی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ کیوں کیا جاتا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کو کوئی خاص زبان نہیں آتی اور وہ چاہتا ہے کہ اُس زبان میں موجود مواد سے استفادہ کرے۔مجبوراً وہ کسی ایسے شخص سے ربط پیدا کرتا ہے' جو اس زبان سے واقف ہے اور پھر اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ مواد کا ترجمہ کردے۔یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ کوئی مضمون یا کتاب پڑھتے ہیں اور اس سے متاثر ہوتے ہیں۔آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس مضمون یا کتاب سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھائیں' جو اس زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے راست نہیں پڑھ سکتے۔چنانچہ آپ سوچتے ہیں کہ اس مضمون یا کتاب کا ترجمہ کردیا جائے۔ادبی تخلیقات کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں زبان کی نزاکتیں بھی ہوسکتی ہیں۔علامتیں' محاورے' روزمرّہ' استعارے اور کنائے بھی ہوسکتے ہیں اور چوں کہ ہر زبان کی اپنی کچھ منفرد خصوصیات ہوتی ہیں' اس لیے اکثر و بیشتر دشواری پیش آتی ہے۔لیکن اگر مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان سے بخوبی واقف ہو تو وہ دشواریوں پر قابو پا سکتا ہے۔پھر بھی اصل زبان کا حسن ترجمے کی زبان میں قدرے ماند پڑ سکتا ہے۔اگر اصل مواد علمی نوعیت کا ہے تو یہاں صرف مفہوم سے غرض ہوتی ہے تا کہ پڑھنے والا اصل متن ہی کی طرح ترجمہ شدہ متن سے استفادہ کر سکے۔اسی لیے علمی ترجمے کا سب سے عام اور اہم اصول یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت اصل مفہوم کا ترجمہ مقصود ہونا چاہیے۔ادبی تخلیقات میں یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ استعمال کیے گئے لفظ کے مفہوم کی کئی سطحیں ہوسکتی ہیں۔لیکن علمی مضامین میں ادبیات کی طرح اظہار کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔پھر بھی اگر کسی ایسے علم یا فن کا ترجمہ کیا جارہا ہو' جو اس زبان کے لیے نیا ہو تو سب سے بڑا مسئلہ اصطلاح سازی کا ہوتا ہے' کیوں کہ ہر علم وفن کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں۔چوں کہ علمی تراجم کا مقصد اصل مضمون کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ پڑھنے والا اس کو پوری طرح سمجھ سکے اس لیے اصل زبان میں استعمال کی گئی اصطلاحات کو ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرنا ضروری ہے کہ مطلوبہ علم یا فن کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔اس لیے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ علمی تراجم کا دارومدار بہتر اور معنی خیز اصطلاحات پر ہوتا ہے۔ہر علم اور ہر پیشے کی کچھ مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔یہاں تک کہ کھیلوں میں بھی مخصوص اصطلاحوں سے کام لیا جاتا ہے جن کا لغوی مفہوم چاہے جو کچھ ہو' متعلقہ علم یا پیشے میں وہ جداگانہ مفہوم کی حامل ہوتی ہیں۔عموماً یہ اصطلاحیں ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں' جو مرادی مفہوم تک ذہن کو منتقل کرسکیں۔علمی ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے سامنے جب اصطلاحیں آتی ہیں تو سب سے پہلے وہ ترجمے کی زبان میں موجود اسی مفہوم کی اصطلاح تلاش کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ترجمے کی زبان میں وہ اصطلاح موجود ہو۔یہیں مترجم کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ متبادل اصطلاح ڈھالے یا وضع کرے۔چوں کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے اس لیے آسانی یہ ہے کہ مترجم کسی دوسری شناسا زبان سے اصطلاح لے سکتا ہے یا نئی اصطلاح ڈھال سکتا ہے۔

اردو میں بیشتر علوم بنیادی طور پر دوسری زبانوں ہی سے آئے ہیں اور ابتدا میں زیادہ تر علمی سرمایے فارسی اور عربی سے اردو میں منتقل کیے گئے۔خاص طور پر شرعی مسائل اور فقہ وغیرہ کے لیے جو اصطلاحیں استعمال ہوئیں وہ زیادہ تر عربی میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ہندوستان میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک بھی فارسی اور عربی زبانیں عام طور پر استعمال ہوتی تھیں۔دفتری معاملات میں فارسی غالب تھی اور مذہبی مسائل کے لیے عربی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ہر پڑھا لکھا شخص فارسی اور عربی اصطلاحات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔اسی لیے مترجمین کو عربی اور فارسی سے اصطلاحیں لینا یا ان زبانوں کی مدد سے اصطلاحیں ڈھالنا زیادہ آسان لگتا تھا۔لیکن آج کے دور میں فارسی اور عربی کا چلن کم ہوگیا ہے۔اس لیے عربی یا فارسی کی دقیق اصطلاحیں مشکل لگنے لگی ہیں۔ایک بات یہ بھی ہے کہ علوم وفنون کی ترقی کی رفتار بے حد تیز ہوگئی ہے اور تقریباً سبھی کتابیں انگریزی میں دستیاب ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ اب انگریزی الفاظ ہمارے عام ذخیرۂ الفاظ کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔آج ایک دیہاتی کے لیے بھی ٹریکٹر' اسٹیشن' بس جیسے الفاظ نامانوس نہیں ہیں۔کسی بھی زبان کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ مسلسل استعمال میں آتا رہے تو وہ زبان کا حصہ بن جاتا ہے۔انگریزی کی ڈکشنریوں

میں کئی الفاظ اردو، ہندی اور دوسری کئی زبانوں سے شامل کر لیے گئے ہیں، کیوں کہ ماہرین نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ عام بول چال کے علاوہ تحریری زبان میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ ہندوستان میں بھی کئی انگریزی الفاظ عام طور پر بولے جانے لگے ہیں۔ اس لیے بیشتر نئی اصطلاحات کے لیے انگریزی الفاظ کو جوں کا توں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ریڈیو، ٹی۔وی، ٹیلی فون، ایکسرے، ایمبولینس، کمپیوٹر جیسے الفاظ اب سبھی جانتے ہیں۔ ابتدائی دور میں ان کے لیے نئے الفاظ بنانے کی کوشش کی گئی لیکن عوام نے قبول نہیں کیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ٹسٹ ٹیوب کے لیے امتحانی نلی کا لفظ عام تھا اور آسانی سے آج بھی سمجھا جاتا ہے لیکن جدید میڈیسن کی تحقیقات نے ایک اور نیا لفظ ٹسٹ ٹیوب بے بی دیا اور یہ لفظ اردو والوں نے جوں کا توں قبول کر لیا۔ اس کو امتحانی نلی کا بچہ یا طفلِ امتحانی نلی کہنا ظاہر ہے کہ ایک مضحکہ خیزسی بات ہے۔

اصطلاحات بناتے ہوئے ماہرین نے اس بات کا خیال رکھا کہ اگر اردو میں پہلے سے اسی مفہوم کا کوئی لفظ استعمال ہو رہا ہو تو پھر انگریزی یا عربی یا فارسی کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسی لفظ کو استعمال کرنا چاہئے جو اردو میں صحیح متبادل کے طور پر رائج ہے۔ جیسے انگریزی لفظ کوچ (Coach) کے لیے بگھی اور رتھ کے الفاظ پہلے سے موجود تھے۔ اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے کوچ کی جگہ بگھی یا رتھ ہی استعمال کیا گیا۔ سیمنٹ نئے دور کا لفظ ہے اور گچ یعنی تعمیری مسالے سے بالکل مختلف ہے۔ انگریزی میں گچ کے لیے مارٹر (Mortar) کا لفظ لکھا جاتا ہے لیکن ہم نے مارٹر کے لیے گچ ہی استعمال کیا جب کہ سیمنٹ کو سیمنٹ ہی رہنے دیا۔ اگر اصطلاح عربی، فارسی یا انگریزی سے ماخوذ ہے تو پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس لفظ کو اردو میں کیسے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسکول انگریزی لفظ ہے اور اس کا صحیح تلفظ سکول ہے لیکن چوں کہ اردو الفاظ کا پہلا حرف متحرک ہوتا ہے اس لیے اس میں الف کا اضافہ کر لیا گیا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ اردو میں آنے کے بعد لفظ کبھی کبھی تبدیل بھی ہو جاتا ہے اور مسلمہ اصول یہ ہے کہ جو لفظ اردو میں عوام استعمال کر رہے ہیں وہی درست مانا جانا چاہیے۔ اس لیے عربی یا فارسی الفاظ استعمال کرتے ہوئے پیچیدہ ترکیب پر مبنی اصطلاح کے بجائے ایسی سادہ اور عام فہم اصطلاح بنائی جانی چاہیے جو اردو نحوی ترکیب پر مشتمل ہو۔

علم اور پیشے کے اعتبار سے ایک ہی لفظ کو کئی مفاہیم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی لفظ Field خود انگریزی میں بھی کئی مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ کہیں اس کا مطلب کھیت ہے تو کہیں میدان۔ یہی لفظ دوسرے لفظوں کے ساتھ مل کر آتا ہے تو کچھ اور مفہوم دیتا ہے جیسے Field work میں اس لفظ کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ کرکٹ فیلڈ کے لیے ہم کرکٹ کا میدان تو کہہ سکتے ہیں لیکن انگریزی میں Field-day کے لیے کامیابی کے لیے وسیع موقع، مصروفیت کا دن مطلب لیا جاتا ہے۔ اس لیے اردو میں ترجمہ کرتے وقت مترجمین کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ لفظ میں مضمر علم کے سیاق و سباق کو دیکھ کر مناسب متبادل لفظ کا انتخاب کریں۔ آج کل سائنسی اور علمی میدان میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو میں ترجمے کا کام بھی بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ علمی ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاح سازی بھی ہوتی ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اکثر و بیشتر ایک ہی اصطلاح کے لیے مختلف مترجمین نے مختلف اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ بعد میں کون سی اصطلاح مقبول ہوگی۔ اس لیے مترجم کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ متعلقہ علمی موضوع پر ترجمہ کی گئی کچھ کتابوں کا مطالعہ بھی کرے اور ان سے اصطلاحات حاصل کرے۔ لیکن اسے یہ آزادی بھی ملنی چاہیے کہ اگر وہ پہلے کی پیش کردہ کسی اصطلاح سے متفق نہیں ہے تو نئی اصطلاح وضع کر لے، جو صحیح اصطلاحی مفہوم کو پیش کرنے میں کامیاب ہو اور آسانی سے سمجھ میں آئے۔ مترجم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ترجمہ کیے جانے والے علمی موضوع کے علاوہ دوسرے متعلقہ علوم، ان کے تراجم اور وضع کی گئی نئی اصطلاحات سے بھی واقف ہو۔ اس طرح مترجم کو زیادہ بہتر اور جامع اصطلاحات ڈھالنے میں مدد مل سکتی ہے۔

علمی ترجمہ کرتے ہوئے اصطلاحات سے قطع نظر عموماً لفظی ترجمہ ہی کیا جاتا ہے، کیوں کہ علمی تحریریں ادبی تخلیقات کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہوتی ہیں۔ ادبی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت صرف و نحو یا قواعد کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہر زبان کے قواعد کے اصول مختلف ہوتے ہیں۔ مترجم کو اس پہلو کا بھی خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کسی سائنسداں کا نام Mary Smith ہے اور اس کی کسی تحقیق کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ تو اگر اصل متن میں ضمیر She کا استعمال نہ ہوا ہو اور مترجم کو ضمیر کے استعمال کی ضرورت پیش آئے تو اسے احتیاط سے کام لیتے ہوئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ مرد ہے یا عورت۔ اور اسی اعتبار سے ضمیر یا فعل کے متعلقات استعمال کیے جانے چاہئیں، کیوں کہ انگریزی میں جنس کا تعین

فعل سے نہیں ہوتا جب کہ اردو میں فعل جنس کے تابع ہوتا ہے۔طویل اور مرکب جملوں کا ترجمہ کرتے ہوئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے ضرورت کے مطابق دو یا تین جملوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ کیوں کہ مترجم کا اصل مقصد تو مفہوم کی ترسیل ہے۔اگر ترجمہ زیادہ طویل مرکب جملے کی شکل میں ہو تو قاری کو سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے۔بعض مرتبہ خاص علمی موضوعات میں بھی روزمرہ اور محاورہ استعمال ہوسکتا ہے۔ایسی صورت میں مترجم کو چاہئے کہ وہ اصل مفہوم پر توجہ دے نہ کہ محاورے یا روزمرہ کی تلاش پر۔ویسے اگر متبادل محاورہ ترجمے کی زبان میں موجود ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کو دونوں زبانوں پر عبور ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں۔دراصل ترجمہ اور خصوصاً علمی ترجمہ کرتے ہوئے خود مترجم کو سب سے پہلے اصل متن اور اس کے مشمولات کو پوری طرح سمجھنا اور اس طرح ترجمہ کرنا ضروری ہے کہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ سکے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ادبی تخلیق اور علمی مضمون میں کیا فرق ہے ؟
2. مترجم کے لیے اصطلاح سازی کب اور کیوں ضروری ہوتی ہے ؟
3. ابتدا میں کن زبانوں سے علمی سرمایہ اردو میں منتقل کیا گیا؟

10.3 اردو میں علمی تراجم کی ابتدائی روایت

اگر کوئی علم مادری زبان میں ہو تو اسے سمجھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان سے بھی واقف ہو۔اور اگر علم کسی اجنبی زبان میں ہو تو اس کی تفہیم ممکن نہیں ہوتی۔پھر بھی ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ان میں سے بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ انھوں نے دوسری زبان سے جو کچھ حاصل کیا وہ دوسروں تک بھی پہنچ جائے اور لوگ استفادہ کرسکیں۔اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کر دیا جائے تا کہ علم کی مزید اشاعت ہو۔ اس بات کو لوگ زمانۂ قدیم سے جانتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے ترجمے کا رواج رہا ہے۔

عربوں نے اس معاملے میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔چنانچہ خلافتِ عباسیہ کے دور میں حکومت کی سرپرستی میں باضابطہ طور پر ترجمے کیے جانے لگے۔ بغداد میں کئی عدیم المثال کتب خانے تھے جہاں دنیا بھر سے کتابیں اکٹھا کی گئی تھیں اور ان کو عربی میں منتقل کرنے کا عمل بڑی تیز رفتاری سے کیا جانے لگا تھا۔یونانی، سنسکرت اور دوسری کئی زبانوں سے یہاں مختلف علوم کا عربی میں ترجمہ ہوا اور اس طرح عرب قوم بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔ترجمہ قوموں کی زندگی میں جست کا کام کرتا ہے۔عربوں نے علم ہی کی فراوانی کی بدولت ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ ساری دنیا میں ان کے ڈنکے بجنے لگے۔بغداد پر منگولوں کے حملے کے بعد سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی اور بیش قیمت علمی سرمایے ضائع ہو گیا۔اس تباہی سے جو کتابیں محفوظ رہ گئیں ان سے اہل یورپ نے فائدہ اٹھایا اور جہاں تک ممکن ہوسکا، عربی کتابوں کا یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور وہ ترقی کی راہ پر چل پڑے۔یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔یورپ اور امریکہ میں آج جو بے پناہ ترقی ہوئی ہے اس کا منبع ترجمہ ہی ہے جس کے ذریعے انھوں نے دوسری زبانوں سے علم حاصل کر کے اس پر مزید تحقیق کی اور آج ان کا شمار صفِ اول کی اقوام میں ہوتا ہے۔

اردو میں ترجمے کی روایت اسی وقت سے ہے، جب یہ زبان گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔اردو میں سب سے پہلا ترجمہ حضرت میراں جی خدانما کا ہے۔تمہیداتِ ہمدانی عربی کی ایک بہت مشہور کتاب ہے جسے ابوالفضائل شیخ عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی نے تحریر کیا تھا۔اس کتاب میں شرع، فقہی اور تصوف کے مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا تھا۔حضرت خواجہ بندہ نواز نے اس کتاب کی شرح فارسی میں لکھی۔1655ء میں میراں جی خدانما نے اس کا دکنی اردو میں ترجمہ کیا تا کہ وہ لوگ جو فارسی اور عربی سے واقف نہیں ہیں، وہ بھی اس کے مطالب کو آسانی سے سمجھ سکیں۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ترجمے پر وجہی کی سب رس کو اولیت حاصل ہے، جو 1635ء میں لکھی گئی۔کہا جاتا ہے کہ سب رس تاج الحقائق کا ترجمہ ہے۔جب کہ یہ بات پوری طرح درست نہیں ہے۔ہوسکتا ہے کہ سب رس کا بنیادی خیال وجہی نے تاج الحقائق سے لیا ہو لیکن اس کی اعلیٰ انشا پردازی کی وجہ سے اسے

ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔

علمی ترجمے کے ضمن میں دوسرا اہم کام میراں جی یعقوب نے کیا۔ انھوں نے رکن عماد الدین کی فارسی تصنیف شمائل الاتقیا کا 1673ء میں شمائل الاتقیا ہی کے نام سے دکنی اردو میں ترجمہ کیا۔ تقریباً تیرہ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مختلف بزرگوں، صوفیوں اور اولیاء اللہ کے احوال ہیں۔

دکن ہی میں 1704ء میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی کتاب معرفت السلوک کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں بھی تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. بغداد پر منگولوں کے حملے کے بعد سب سے بڑا نقصان کیا ہوا؟
2. تمہیدات ہمدانی کے مصنف کا نام لکھیے۔
3. شمائل اتقیا کا موضوع کیا ہے؟

10.4 علمی وفنی ترجمے کے ادارے

شخصی کوششوں سے بلاشبہ بہت اہم کتابوں کے ترجمے انجام پائے اور بے شمار کتابوں کو عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل کیا گیا۔ علمی وفنی ترجمے کی رفتار میں اس وقت تیزی آئی جب ترجمے کے باضابطہ ادارے قائم کیے گئے۔ ذیل میں ایسے چند اداروں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

10.4.1 فورٹ ولیم کالج میں علمی وفنی تراجم

1800ء میں یہ کالج کلکتہ میں اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ انگلستان سے آنے والے انگریز افسروں کو تربیت دی جاسکے۔ اس کالج کے ایک پروفیسر گل گرسٹ نے ترجمے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ان میں ادبی نوعیت کی کتابیں زیادہ ہیں۔ شکنتلا، سنگھاسن بتیسی، چہار درویش، وغیرہ کا ترجمہ گل گرسٹ ہی کی ایما پر انجام دیا گیا۔ یہاں قرآن کا بھی ترجمہ کیا گیا تھا اور اس کے 56 صفحات کی طباعت بھی ہوچکی تھی لیکن اچانک حکومت کی ہدایت پر باقی صفحات کی طباعت روک دی گئی۔ اس طرح یہ کام ادھورا رہ گیا۔ علمی نوعیت کی کتابوں کے کم ہی ترجمے ہوئے۔ البتہ فن تاریخ پر تین کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے جو فورٹ ولیم کالج کے تنخواہ دار منشیوں نے کیے۔ اردو میں ان تراجم کا مقصد یہ تھا کہ نووارد انگریز افسر زبان کے ساتھ تاریخ بھی جان لیں۔ غلام اکبر نے فارسی سے تواریخ السلاطین کا ترجمہ اسی نام سے کیا۔ محمد عمر نے فارسی ہی سے تواریخ عالم گیری کا ترجمہ کیا اور تصدق حسین نے تواریخ تیموری کو اردو میں منتقل کیا۔ ان کے علاوہ میر شیر علی افسوس نے تاریخ آسام کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

10.4.2 فورٹ سینٹ جارج کالج میں علمی وفنی تراجم

1717ء میں انگلستان سے آنے والے انگریز منشیوں یا رائٹرس کی تربیت کے لیے ایک اسکول قائم کیا گیا تھا۔ اسی اسکول کو 1812ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کا نام دیا گیا۔ یہاں کے اساتذہ نے ترجمے بھی کیے۔ تاج الدین بہجت نے سید عبدالقادر پاشاہ الحسینی کے ایک رسالے کا ''مرصاد المشتاقین'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد مہدی واصف نے شیخ عبدالحق دہلوی کی کتاب ''آداب الصالحین'' اور ''تکمیل الایمان'' کے اقتباسات کا ترجمہ ''تکمیل الایمان ہندی'' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ امام غزالی کی دو کتابوں کیمیائے سعادت کا ''ترجمہ کیمیائے سعادت'' کے نام سے اور احیاء العلوم کے ایک باب کا ترجمہ ''رسالہ اخلاق النبی کریم'' کے نام سے کیا۔ انھوں نے امام بخاری کی ایک کتاب التعبیر کا ترجمہ رسالہ تعبیر خواب کے نام سے کیا تھا لیکن وہ شائع نہ ہوسکا۔ مہدی واصف نے جلال الدین شافعی اور جلال الدین سیوطی کی تحریر کردہ تفسیر جلالین کا بھی ترجمہ اسی نام سے کیا۔ یہاں انگریز اساتذہ نے بھی ترجمے کے کام انجام دیئے۔ یہ سارے ترجمے مذہبی نوعیت کی کتابوں کے ہیں۔ علمی نوعیت کی دو کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔ ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور نے گلیک کی کتاب کا ترجمہ ''کتاب علم نجوم'' کے نام سے اور کنکویسٹ کی کتاب کا ترجمہ ''اصول فن قبالت'' کے نام سے کیا۔

10.4.3 دارالترجمہ شمس الامرا میں علمی وفنی تراجم

نواب فخر الدین خاں شمس الامرا پائیگاہ کے امیر تھے۔ انھیں ذاتی طور پر علم کی اشاعت سے دل چسپی تھی۔ یورپ کی سائنسی اور صنعتی ترقی سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ حیدرآباد کے باشندے جدید علوم سے بھی واقف ہوں۔ چنانچہ انھوں نے فرانس، برطانیہ اور دیگر یوروپی ممالک سے جدید علوم کی کتابیں منگوائیں اور ماہر مترجمین سے اُردو میں ان کے ترجمے کروائے۔ اس ضمن میں نئی سائنسی اصطلاحات بھی وضع کی گئیں۔ انھوں نے حیدرآباد میں مدرسہ فخریہ قائم کیا، جہاں جدید علوم وفنون اور سائنسی موضوعات پر مشتمل نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ ان ہی کی کوششوں سے 1844ء میں ہندوستان کا پہلا مدرسہ طبابت ریزیڈنسی میں قائم کیا گیا۔ مدرسہ فخریہ کے تعلیم یافتہ طلبا نے یہاں داخلہ لیا اور چونکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں جدید علوم بشمول طبی نصاب سے واقف تھے اس لیے وہ بہتر طالب علم ثابت ہوئے۔ شمس الامرا نے فلکی مشاہدے کے لیے رصد گاہ بھی قائم کی۔ ترجمے کے کام کو آگے بڑھانے کی غرض سے انھوں نے محلہ جہاں نما کی ایک حویلی میں دارالترجمہ شمس الامرا قائم کیا جہاں ہندو، مسلم، انگریز اور فرانسیسی علما کو ترجمے کے کام پر متعین کیا گیا۔ ان میں غلام محی الدین حیدرآبادی، مسٹر جونس، جوزف، رتن لال، میر شجاعت علی کرم اور دوسرے شامل ہیں۔ شمس الامرا، کے بعد بھی ان کے خاندان سے وابستہ افراد نے ان کے کام کو آگے بڑھایا اور یہ سلسلہ 1833ء سے 1877ء تک جاری رہا۔ اور اس عرصے میں یہاں 37 کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ یہاں سے ترجمہ ہونے والی کتابوں میں مقطع الارض 1836ء، علم ہندسہ، رسالہ علم واعمال کروی، ستہ شمسیہ کے عنوان سے چھ جلدیں، علم جرثقیل، علم ہئیت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر، علم برق (1840) انوار بدریہ، افضل الآداب، طبی لغت 1853ء، شمس الہندسہ شامل ہیں لیکن ان میں سے چند کتابیں محروم اشاعت رہیں۔ یہ کتابیں کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں۔

10.4.4 نوابینِ اودھ کے زیر اہتمام علمی وفنی تراجم

اودھ کے نواب نصیر الدین حیدر نے انگریزی سے اردو میں سائنسی کتابوں کا ترجمہ کروانے کے لیے ایک انگریز کو مقرر کیا۔ جس کی اعانت سے سید کمال الدین حیدر اور دوسروں نے اردو میں ترجمے کا کام انجام دیا۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ اور پھر امجد علی شاہ نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ 1833ء سے 1853ء تک بیس سال کے عرصے میں دیگر کتابوں کے علاوہ یہ کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ مفتاح الافلاک (1833ء)، رسالہ ہئیت (1847ء) مقاصد علوم (1841ء)، رسالہ مقناطیس، رسالہ ہیضے کا علاج (1853ء)۔

10.4.5 ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی کالج میں علمی وفنی تراجم

یہ کالج 1825ء میں قائم ہوا۔ یہاں ریاضی، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اخلاق کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کالج کے ذمے داروں نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور طلبا کے لیے نصابی کتب مہیا کرنے کی غرض سے اسکول بک سوسائٹی کے نام سے 1840ء میں ایک سوسائٹی قائم کی گئی۔ 1843ء میں اس سوسائٹی کا نام تبدیل کر کے ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کر دیا گیا اس کا مقصد دیسی زبانوں میں سائنسی اور جدید علوم کے تراجم کرانا تھا۔ اس سوسائٹی نے تراجم کے اصول مقرر کیے اور اصطلاحات وضع کیں۔ اس سوسائٹی کے ترجموں اور تالیف کی تعداد 128 ہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے طلبا کے لیے مہیا کی گئیں۔

الجبرا، اصول علم ہئیت، رسالہ کیمسٹری، جغرافیہ طبعی، علم وعمل طب، مساحت، طبیعیات، رسالہ مقناطیس، حرکیات وسکونیات، علم مناظر، حرارت، رسالہ علم برق، گالون ازم، رسالہ علم حساب، رسالہ علم مساحت مستعمل وعلم مثلث (1844ء) رسالہ علم طلب (1847ء) رسالہ اعمال جراحی (1848ء) اصول وقواعد مایعات (1850ء)، مزید الاموال یا سلاح الاحوال (1854ء)۔ اصول علم مثلث وترش ہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر (1844ء) رسالہ اصول کلوں کے باب میں (1863ء)۔ یہاں کے مترجمین میں مسٹر بوتروس، ڈاکٹر اسپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکا اللہ، ماسٹر رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرساد، پیارے لال، ہردیو سنگھ، ڈاکٹر ضیا الدین اور دوسرے کئی لوگ شامل ہیں۔

10.4.6 سائنٹفک سوسائٹی میں علمی وفنی تراجم

یہ سوسائٹی سرسید احمد خان نے 1863ء میں قائم کی۔اس کا پہلا اجلاس غازی پور میں 1864ء میں منعقد ہوا۔ سوسائٹی کا مقصد انگریزی یا یورپ کی دوسری زبانوں میں لکھی گئی علوم وفنون کی کتابوں کو اُردو میں منتقل کرنا تھا۔1866ء میں علی گڑھ میں اس کی اپنی عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی۔1887ء کو سائنٹفک سوسائٹی کو مدرسۃ العلوم میں ضم کر دیا گیا۔ 7/نومبر 1887ء کو یہ سوسائٹی بند ہوگئی۔سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً پندرہ کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کرائیں۔ان میں تاریخ مصر، تاریخ چین، قدیم یونان کی تاریخ، رسالہ فلاحت، فن کاشت کاری، رسالہ علم انتظام مدن، تاریخ ہندوستان، رسالہ علم برقی، اصل سیاست مدن، تاریخ ایران، رسالہ علم جغرافیہ، رسالہ جرثقیل وغیرہ شامل ہیں۔ان کتابوں میں سے کسی پر بھی مترجم کا نام نہیں لکھا گیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ ''ترجمہ کیا اور مشتہر کیا سائنٹفک سوسائٹی نے''۔اس لیے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان کے مترجمین کون تھے۔کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر کتابوں کے ترجمے خود سرسید نے کیے اور تقریباً ساری کتابوں پر اشاعت سے قبل نظرِ ثانی بھی کی۔

10.4.7 مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دارالترجمے میں علمی وفنی تراجم

جموں کشمیر کے مہاراجہ نے 1850ء کے آس پاس ایک دارالترجمہ قائم کیا' جہاں مختلف علوم کو ڈوگری' ہندی' پنجابی اور اردو میں منتقل کرنے کا کام انجام دیا گیا جن میں طب' جدید میڈیسن' کاغذ سازی' انجینیرنگ' فوجی فنون' آلات حرب اور مذہبیات پر مشتمل کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔علم طب سے متعلق ترجمہ کی گئی کتابوں میں امراض اطفال' تشریح الابدان' علم امراض پر ترجمہ شرح اسباب' اسبابِ امراض' اسبابِ امراض والعلاجات' علاج الامراض' ہدایات پیدائش بچہ' امراض الاصبیان اور ہدایت الاطبا جیسی کتابیں شائع کی گئیں۔

10.4.8 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں علمی وفنی تراجم

جامعہ عثمانیہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ریاست حیدرآباد کے طلبا کو ان کی اپنی مادری زبان یعنی اردو میں جدید علوم وفنون کی تعلیم دی جاسکے۔لیکن سب سے بڑے مسئلہ طلبا کے لیے کتابوں کی فراہمی تھی۔چنانچہ جامعہ میں ایک شعبہ تالیف وتصنیف قائم کیا گیا' جو بعد میں دارالترجمہ عثمانیہ کہلایا۔اس سے قبل فخر الملک کے قائم کردہ دارالترجمہ کی کتابیں نصاب میں رائج تھیں لیکن ایک یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی ضرورت کی تکمیل لازمی تھی۔دارالترجمہ نے اس کام کو انجام دے کر اردو میں علمی وفنی علوم کی تعلیم کو ممکن بنا دیا۔یہاں ایسے لوگ ملازم رکھے گئے' جو کسی خاص مضمون کے ماہر بھی تھے اور انگریزی کے علاوہ اردو' عربی اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔ابتدا میں قاضی محمد حسین' قاضی تلمذ حسین' محمد الیاس برنی' سید ہاشمی فرید آبادی' چودھری برکت علی' نظم طباطبائی' عبداللہ عمادی' سید علی رضا' عبدالحلیم شرر اور بلدیو سنگھ مترجم ہوئے۔بعد میں مزید مترجمین کے ذریعے ترجمے کروائے گئے۔کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے متعلقہ علوم کے ماہرین کی ایک کمیٹی تھی' جو کتابوں کا انتخاب کرتی تھی اور پھر یہ کتابیں ماہر مترجمین کے حوالے کی جاتی تھیں۔ترجمہ کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے ناظرِ ادب اور ناظرِ مذہب ہوتے تھے جو ادبی اور مذہبی نقطۂ نظر سے ترجمے کا تجزیہ کرتے اور اپنی سفارشات بھیجا کرتے تھے۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم بابائے اردو مولوی عبدالحق مقرر کیے گئے۔

دارالترجمہ میں میڈیسن' انجینئرنگ' طبیعیات' کیمیا' فلسفے' تاریخ' معاشیات' ریاضی' غرض ہر علمی موضوع پر انگریزی کی بہترین کتابوں کا انتخاب کر کے ان کے ترجمے کیے گئے۔

تاریخ پر یہاں 95 کتابیں ترجمہ کی گئیں' جن میں سے 83 کتابیں شائع ہوئیں۔ان تراجم میں ہندوستان کی قدیم تاریخ' وسطی تاریخ' جدید تاریخ' تاریخ انگلستان' تاریخ یونان' تاریخ روم' تاریخ یورپ وغیرہ شامل ہیں۔ان تراجم کے لیے مندرجہ بالا مترجمین کے علاوہ پروفیسر ہارون خان شیروانی' پروفیسر جمیل الرحمٰن' ڈاکٹر سید سجاد' ڈاکٹر ابن حسن' ڈاکٹر سید عابد حسین اور کئی دیگر ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔

معاشیات کی کتابوں کے ترجمے' پروفیسر حبیب الرحمٰن' مولوی رشید احمد' پروفیسر الیاس برنی' احمد محی الدین انصاری' مولوی محمد نصیر الدین' محمد احمد سبزواری اور دوسروں نے کیے۔معاشیات پر یہاں ترجمہ کی ہوئی 19 کتابیں شائع ہوئیں۔

فلسفے کی کتابوں کے ترجمے خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولوی احسان احمد، مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر سید وحید الدین، عبداللہ عمادی، مرزا ہادی رسوا، ابوالخیر مودودی اور دوسرے علما نے کیے۔ فلسفے کے موضوع پر دارالترجمہ سے 27 کتابیں شائع ہوئیں۔

نفسیات کے موضوع پر مولوی احسان احمد کے علاوہ معتضد ولی الرحمٰن، عبدالباری ندوی اور مرزا رسوا نے 15 کتابوں کے ترجمے کیے۔ اخلاقیات پر 12 کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ اس موضوع پر ترجمہ کرنے والوں میں مولوی عبدالباری، حکیم عبدالباقی، معتضد ولی الرحمٰن، مولوی احسان احمد اور دیگر مترجمین شامل ہیں۔ انجینئرنگ کے تراجم پروفیسر ضیاالدین انصاری کے علاوہ مولوی محمد احمد مرزا، قاضی محمد حسین، للت موہن مکرجی، بالا پرشاد، لوکندر بہادر، مرزا مہدی علی، محمد عظمت اللہ اور دوسرے کئی مترجمین نے کیے۔

قانون کی کتابیں مولوی مسعود علی، رائے ویدناتھ، سید علی رضا، ڈاکٹر میر سیادت علی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، پروفیسر حسین علی وغیرہ نے اردو میں منتقل کیں۔

دارالترجمے کا قیام 1917ء میں ہوا اور دو سال کے اندر ہی کتابوں کے شائع ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 1948ء میں ریاست حیدرآباد ہند یونین میں ضم کر دی گئی، جس کے بعد ترجمے کے کام کی رفتار کم ہو گئی اور 1949ء میں دارالترجمہ کے دفتر میں آگ لگ گئی اور کئی قیمتی مسودات شعلوں کی نذر ہو گئے۔ 1950ء میں یہ شعبہ ختم ہو گیا، کیوں کہ جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اردو سے انگریزی کر دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مجیب الاسلام کی تحقیق کے مطابق:

> ''دارالترجمہ عثمانیہ میں 1917ء سے 1947ء تک یعنی تیس سال میں 457 کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں۔ ان میں سے 426 کتابیں ترجمہ اور 31 کتابیں تالیف کی گئیں۔ تمام تراجم میں 360 کتابیں انگریزی سے ترجمہ کی گئیں۔ ان میں سے 306 تراجم شائع ہوئے۔ 5 جرمن تصانیف کے ترجمے کیے گئے۔ یہ پانچوں شائع ہوئے۔ 3 فرانسیسی زبان سے ترجمے کیے گئے۔ یہ تینوں شائع ہوئے۔ 51 عربی زبان سے کیے گئے۔ جن میں 45 شائع ہوئے۔ 17 فارسی تصانیف کے ترجمے ہوئے ان میں سے 9 شائع ہوئے اور 31 تالیفات میں سے 27 شائع ہوئیں۔ مجموعی طور پر 395 تراجم و تالیفات شائع ہو کر کورس میں شامل کیے گئے۔''
>
> (دارالترجمہ کی علمی و ادبی خدمات۔ صفحہ 144)

چوں کہ دارالترجمہ عثمانیہ جل کر تباہ ہو چکا تھا اور یہاں شائع کی گئی کتابوں کا پورا سٹ کسی ایک لائبریری میں موجود نہ تھا، لیکن بہ دقتِ تمام ڈاکٹر مجیب الاسلام نے ترجمہ کی گئی کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جو ان کی کتاب ''دارالترجمہ کی علمی و ادبی خدمات'' میں شامل ہے۔ اگرچہ یہ فہرست بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی لیکن بیشتر کتابوں کے مترجمین کے علاوہ اصل کتاب اور اس کے مصنف کا ذکر بھی اس فہرست میں ہے۔

10.4.9 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں علمی و فنی تراجم

مارچ 1996ء میں حکومت ہند نے اردو زبان کی ترقی کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نامی ادارہ قائم کیا۔ جسے پہلے ''ترقی اردو بیورو'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ قیام سے لے کر اب تک اس ادارے نے خاصی تعداد میں علمی و فنی کتابوں کے اردو ترجمے کروا کے شائع کیے ہیں۔ ان میں تاریخ، تعلیم و تدریس، حیات و خدمات، زبان و لسانیات، سائنس، ٹکنالوجی، جغرافیہ، کیمیا، طبیعیات، گھریلو سائنس، ریاضی، زراعت، سماجیات، سیاسیات، طب و معالجات، کمپیوٹر سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، لائبریری سائنس، معاشیات، کامرس، نفسیات پر سینکڑوں کتابیں شامل ہیں۔

10.4.10 مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں علمی و فنی تراجم

جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعۂ تعلیم کے خاتمے کے بعد ملک بھر میں ایسی کوئی یونیورسٹی نہ تھی جہاں اردو زبان کے ذریعے مروجہ علوم و فنون کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہو۔ برسوں تک جدوجہد کرنے کے بعد 1998ء میں حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے ذریعے طلبا کو جدید علوم کی تعلیم دی جائے۔ یہاں بھی نصابی کتب کا مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ یہاں ایک ٹرانسلیشن ڈویژن قائم کیا گیا، جواب

شعبہ ترجمہ ہو گیا ہے۔ تقریباً ہر کورس کے لیے انگریزی سے ترجمہ کر کے طلبا کو کتابیں مہیا کی جانے لگیں۔ اس یونیورسٹی سے 250 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تقریباً نصف کتابیں ترجمہ ہیں۔ اس مقصد کے لیے اردو یونیورسٹی نے دوسری یونیورسٹیوں جیسے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے معاہدہ کیا ہے اور وہاں کی نصابی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔

مندرجہ بالا اداروں کے علاوہ اور بھی کئی ادارے جیسے NCERT، نیشنل بک ٹرسٹ، انجمن ترقی اردو، دہلی اکیڈمی اور ملک بھر کی دوسری اکیڈمیاں ترجمے کے کام کو آگے بڑھا رہی ہیں اور قارئین کے لیے اردو میں علمی و فنی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرا کے شائع کر رہی ہیں۔ دنیا بھر میں علمی و فنی ترقیاں بامِ عروج پر ہیں اور ہر روز سینکڑوں نئی کتابیں انگریزی اور دوسری زبانوں میں لکھی جا رہی ہیں۔ نئی کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ بہتر سے بہتر کتابیں اردو میں منتقل ہوں۔ اور یہ کام شد و مد سے جاری ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فورٹ ولیم کالج کب قائم کیا گیا؟
2. فورٹ سینٹ جارج کالج میں کون سی علمی و فنی کتابیں ترجمہ کی گئیں؟
3. دارالترجمہ شمس الامرا کے چند مترجمین کے نام لکھیے۔
4. ترجمے اور نصابی کتاب کی فراہمی کے لیے دلی کالج کے تحت کب اور کون سا ادارہ قائم کیا گیا؟
5. سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا مقصد کیا تھا؟

10.5 خلاصہ

کسی زبان کی مقبولیت کا راز اس بات میں ہوتا ہے کہ اس میں علوم و فنون کی کتنی کتابیں ہیں۔ اردو میں علمی و فنی کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے ضروری تھا کہ دوسری زبانوں سے علوم و فنون سے متعلق کتابوں کو ترجمہ کیا جائے تاکہ اردو بولنے والے ترقی کی راہوں میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ جدید سائنسی ترقیات نے علوم و فنون کے ذخیرے میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ہر علم کے ساتھ اس کی اپنی اصطلاحیں بھی ہوتی ہیں۔ اردو ترجمہ کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اگر کسی اصطلاح کے لیے عام طور پر سمجھا جانے والا کوئی لفظ موجود نہ ہو تو نیز اصل زبان کا لفظ عام طور پر بولا اور سمجھا جاتا ہو تو نئی اصطلاح وضع کرنے کے بجائے انگریزی لفظ کو ہی استعمال کر لیا جائے۔

علمی ترجمہ عموماً لفظی ہوتا ہے، کیوں کہ علمی تحریریں ادبی تخلیقات کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہوتی ہیں اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ نثر میں مرصع زبان کے بجائے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی جائے تاکہ علم حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو اصل مفہوم تک رسائی میں دشواری نہ ہو۔ اردو میں ترجمے کا عمل زبان کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ ابتدا میں مذہبی موضوعات کے ترجمے کیے گئے بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ فنی اور علمی کتابوں کے بھی ترجمے کیے جانے چاہئیں۔ چنانچہ مختلف اداروں نے ترجمے کے کام کو آگے بڑھایا۔ جن میں فورٹ ولیم کالج، فورٹ سینٹ جارج کالج، دلی کالج وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ، نوابین اودھ اور حیدرآباد میں شمس الامرا کی سرپرستی میں علمی و فنی تراجم کیے گئے۔ سرسید احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے کئی علمی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں طلبا کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے 426 کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔

موجودہ دور میں انجمن ترقی اردو، این سی ای آر ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی اکیڈمی جیسے اداروں نے بھی اس ضمن میں کام کیا ہے۔ حکومت ہند کے ادارے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سینکڑوں علمی و فنی کتابیں اردو میں منتقل کیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ نے بھی طلبا کی کئی نصابی کتب کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

اس تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں علمی و فنی موضوعات پر کتابوں کی دستیابی اگر پوری طرح نہیں تو کم از کم کچھ حد تک تو ضرور ہے۔

10.6 : نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. دارالترجمہ شمس الامرا کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. علمی ترجمے کے بنیادی اصولوں کی نشاندہی کیجیے۔
2. سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. علمی وفنی تراجم کے ضمن میں دتی کالج کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

10.7 فرہنگ

حسب استعداد	=	حسب مقدور، صلاحیت کے مطابق	شانہ بہ شانہ چلنا	=	ساتھ ساتھ چلنا
مطلوبہ	=	درکار	مخلوط زبان	=	ملی جلی زبان
دقیق	=	گاڑھی، مشکل	متبادل	=	قائم مقام، اسی طرح کی دوسری چیز
مشمولات	=	وہ چیزیں جو شامل ہیں	مرصع	=	خوش بیانی سے آراستہ موتی یا جواہرات سے جڑا ہوا

10.8 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر قمر رئیس (مرتبہ) — ترجمے کا فن اور روایت
2. ڈاکٹر خلیق انجم (مرتبہ) — فن ترجمہ نگاری
3. ڈاکٹر مجید بیدار — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات
4. ڈاکٹر مجیب الاسلام — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات
5. ثریا حسین — سرسید احمد خاں اور ان کا عہد

اکائی 11 : اردو میں دفتری و قانونی تراجم کی روایت و اہمیت اور مسائل

ساخت

11.1 تمہید

11.2 ہندوستان میں دفتری اور قانونی تراجم کی روایت کا آغاز

11.3 دکن کی سرکاری زبان

11.4 ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی سرکاری زبان

11.4.1 مغل عہد کی قانونی اور دفتری اصطلاحات

11.5 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سرکاری زبان

11.5.1 ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں دفتری اور قانونی زبان اور اصطلاحات

11.6 اردو میں دفتری اور قانونی اصطلاحیں

11.6.1 آزادی کے بعد ہند و پاک میں قانونی اور دفتری زبان کی صورتِ حال

11.6.2 پاکستان میں قانونی اور دفتری اصطلاحات کے ادارے

11.6.3 دفتری مراسلت پر کچھ کتابیں

11.7 خلاصہ

11.8 نمونۂ امتحانی سوالات

11.9 فرہنگ

11.10 سفارش کردہ کتابیں

11.1 تمہید

انسان کی سماجی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی انتظامی اور قانونی زبان وجود میں آئی۔ سماجی زندگی کا آغاز اس طرح ہوا تھا کہ کوئی ایک شخص اپنی طاقت اور فہم و ادراک کے بل پر ایک مخصوص گروہ کا سردار بن جاتا۔ گروہ کو منظم رکھنے کے سلسلے میں وہ کچھ قوانین وضع کرتا اور ساتھ رہنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا، جن کی مدد سے گروہ کے تمام افراد ایک ساتھ رہ کر آرام اور سکون سے زندگی گزار سکتے۔ سردار گروہ کو منظم رکھنے کے سلسلے میں کچھ قوانین وضع کرتا۔ اس طرح سماجی نظام کے ساتھ انتظامی اور قانونی زبان بھی وجود میں آئی۔

قانون کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ''یہ انسانوں کے لیے قاعدۂ عمل ہے، جسے سماج کے مقتدر اعلیٰ نے بنایا ہے''۔ اس قاعدۂ عمل کی تعمیل اس طرح کرائی جاتی رہی ہے کہ گروہ کے تمام افراد کو بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ قاعدے پر عمل کریں گے تو آرام سے زندگی گزاریں گے اور اگر عمل نہیں کریں گے تو انھیں سزا دی جائے گی۔ یہ قاعدے قانون صرف اُن لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو قاعدۂ عمل کی پابندی نہیں کرتے۔

11.2 ہندوستان میں دفتری اور قانونی تراجم کی روایت کا آغاز

مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو وہ جو قانونی اور انتظامی اصطلاحیں ساتھ لائے تھے وہ فارسی، عربی اور ترکی زبانوں سے لی گئی تھیں۔ خود ہندوستان میں مقامی زبانوں میں انتظامیہ کی اصطلاحیں موجود تھیں۔ مسلمانوں نے ان اصطلاحوں کا بھی فراخ دلی سے استعمال کیا۔ آٹھویں صدی سے سولہویں صدی تک مسلمانوں کی حکومت میں انتظامی ڈھانچے اور قانون کی صورتیں الگ الگ رہی ہیں۔ ہندوستان میں غوری، ترک، خلجی، پٹھان، لودھی اور مغل حکومتوں کی انتظامی اور قانونی اصطلاحیں ہندوستان کے انتظامیہ میں استعمال ہوتی رہیں۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں ان میں انگریزی اصطلاحیں بھی بڑی تعداد میں شامل ہوگئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے قانونی اور انتظامی مقاصد کے لیے کن زبانوں کا استعمال کیا؟
2. مسلمان ہندوستان میں اپنے ساتھ کون کون سی زبانیں لائے؟
3. مسلم حکمرانوں کی انتظامی اور قانونی زبان کس صورت میں محفوظ ہے؟

11.3 دکن کی سرکاری زبان

جب سلطان محمد بن تغلق 1325ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے دکن میں کپل، دھارواڑ، رائچور، بلاری اور انند پور کے علاقوں کو فتح کرلیا۔ اُس نے شمالی ہندوستان اور دکن کے درمیان سیاسی رابطہ قائم کرنے کے لیے دکن میں دولت آباد کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ تغلق کے حکم سے ساری آبادی دولت آباد منتقل ہوگئی۔ جو لوگ دہلی سے دولت آباد منتقل ہوئے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو بھی ان کے ساتھ منتقل ہوئی' جو آہستہ آہستہ آس پاس کے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ محمد بن تغلق کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ 1347ء میں علاء الدین حسن بہمنی شاہ نے جنوبی ہندوستان میں پہلی مسلم حکومت قائم کی۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ بہمنی حکومت کی سرکاری زبان اردو تھی لیکن اکثریت اُن مؤرخین کی ہے' جن کا خیال ہے کہ بہمنی حکومت کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ بہمنی سلطنت کے بعد ابراہیم عادل شاہ کا دور شروع ہوا۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ عادل شاہی حکومت کی سرکاری زبان اردو تھی لیکن اس سلطنت کے بادشاہ یوسف عادل شاہ نے پھر فارسی کو سرکاری زبان بنا دیا۔ اس خاندان کا ایک اور بادشاہ ابراہیم عادل شاہ جب تخت نشین ہوا تو اُس نے پھر اردو کو سرکاری زبان بنا دیا۔ سرکاری زبان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُن حکومتوں کی دفتری اور قانونی زبان اردو تھی۔ عادل شاہی سلطنت کی ہم عصر سلطنت قطب شاہی حکومت تھی۔ اس خاندان کے محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے لیکن قلی قطب شاہ کی دفتری اور قانونی زبان فارسی تھی۔ غرض یہ ہے کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بعض مؤرخین نے دکنی سلطنتوں کی سرکاری زبان یعنی دفتری اور قانونی زبان تامل، کنڑ، مرہٹی کو بھی بتایا ہے۔

اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے اپنی کتاب 'حیدر آباد میں اردو کی ترقی' میں مدلّل طریقے سے ثابت کیا ہے کہ ان تمام سلطنتوں کی قانونی اور دفتری یعنی سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''بہمنیوں کا زمانہ ہو کہ عادل شاہی یا قطب شاہی عہد اردو کبھی دفتروں کی زبان نہیں رہی۔'' ایسی صورت میں ترجمہ ترسیل کا واحد ذریعہ رہا ہوگا۔ اس زمانے میں فارسی نے مقامی زبانوں سے بہت سی دفتری اور قانونی اصطلاحیں مستعار لی تھیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. شمالی ہندوستان کے کس بادشاہ نے پہلی بار دکن کے بڑے علاقے پر قبضہ کیا؟
2. کس بادشاہ نے دکن میں دولت آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا؟
3. تغلق کی بادشاہت ختم ہونے پر دکن میں کون سی حکومت قائم ہوئی؟

11.4 ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی سرکاری زبان

برصغیر ہندو پاک کی تاریخ تقریباً چار پانچ ہزار سال کی طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق ہندوستان کی قدیم ترین تہذیب وادی سندھ کی تہذیب ہے، جو چار پانچ ہزار برس قبل وجود میں آئی، اس تہذیب نے موہن جوداڑو اور ہڑپا نام کے دو ایسے شہروں کی تعمیر کی جو انسانی تاریخ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تہذیب میں حکومت کا باقاعدہ نظام اور اس نظام کے لیے انتظامیہ اور قانون کی زبان اور اصطلاحیں نہ ہوں، مگر اس زمانے تک لکھنے کا فن ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہمیں اس عہد کی زبان اور اصطلاحوں کا علم نہیں ہو سکا۔ موہن جوداڑو تہذیب کے چار پانچ ہزار سال بعد مسلمان ہندوستان میں آئے۔ اس دوران بے شمار حکومتیں بنیں اور بگڑیں۔ کوئی حکومت انتظامی اور قانونی زبان کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ مگر اس مدّت کا کوئی تحریری ریکارڈ ہم تک نہیں پہنچا۔ مسلمان حکمرانوں کے ابتدائی عہد سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک کی انتظامی اور قانونی زبان کا مختلف صورتوں میں ریکارڈ موجود ہے۔ ہندوستان میں پہلے مسلم حکمران شہاب الدین غوری سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد تک تمام بادشاہوں کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ اس لیے انتظامی اور قانونی کاموں کے لیے مسلم حکمرانوں کی اپنے ساتھ لائی ہوئی عربی، فارسی، ترکی اور مقامی زبانوں کی انتظامی اور قانونی اصطلاحیں استعمال ہوتی رہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان اصطلاحوں میں ترمیم، حذف اور اضافے ہوتے رہے۔

ماہرین اصطلاح سازی کا کہنا ہے کہ مغل عہد کی بہت سی ایسی تاریخیں موجود ہیں، جن میں دفتری اور قانونی اصطلاحات خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس عہد میں انتظامی امور اور ان سے متعلق اصطلاحات باقاعدہ کتابی صورت میں مرتب کی گئی تھیں۔ مغل عہد کے بعد جب اردو نے فارسی کی جگہ لی تو قانونی اور دفتری اصطلاحات کا یہ بیش بہا ذخیرہ اردو کی اصطلاحات سازی میں بہت کام آیا۔

مغل عہد کی اصطلاحوں کی کتابیں اردو اور ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں انتظامیہ اور قانون کی اصطلاحیں وضع کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ ان کتابوں سے مستعار لی گئی اصطلاحیں آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔

11.4.1 مغل عہد کی قانونی اور دفتری اصطلاحات

کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں کے زمانے میں دفتروں کی زبان کے طور پر مال گزاری کا ریکارڈ مقامی زبانوں میں رکھا جاتا تھا۔ مغلوں کے عہد کی قانونی اور دفتری زبان پر ایک بہت اچھی لغت 1754ء میں 'مراۃ الاصطلاح' کے نام سے مرتب ہوئی تھی۔ اس لغت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں جاگیر کی کتنی قسمیں تھیں۔ اس کے علاوہ درخواستوں، عرضداشتوں اور نظم و نسق سے متعلق اصطلاحات کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ مغل عہد میں جو دفتری اور قانونی اصطلاحات رائج تھیں، اُن میں وزیر، دیوان، کاشتکار، زمیندار، مال گزار، تعلق دار، اہل کار، منصب دار، قانون گو اور چودھری جیسی بے شمار اصطلاحوں کا استعمال آج بھی ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1- ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی حکومت کی قانونی اور دفتری زبان کون سی تھی؟

2- مسلم حکمرانوں کے عہد میں کس کس زبان سے قانونی اور دفتری اصطلاحیں لی گئیں؟

3- مغل حکومت کے زمانے میں جو قانونی اور دفتری اصطلاحیں استعمال ہوتی تھیں وہ کہاں محفوظ ہیں؟

4- شاہ جہاں کے زمانے میں مال گزاری کا ریکارڈ کن زبانوں میں رکھا جاتا تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں استعمال ہونے والی ایسی چار اصطلاحیں بتائیے، جو آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔

5- 'مراۃ الاصطلاح' کس زمانے میں مرتب ہوئی تھی؟

11.5 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سرکاری زبان

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد تک پورے برصغیر کی سرکاری وعدالتی اور تہذیبی وثقافتی زبان فارسی تھی۔ فارسی پورے ہندوستان میں رابطے کی زبان تھی۔ انگریز ہندوستانیوں کو سماجی اور اقتصادی طور پر کمزور کرنا چاہتے تھے۔ نیز ہندوستانیوں کی انفرادیت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے 1837ء میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ فارسی کو دفتری اور قومی زبان کا جو درجہ دیا گیا ہے، وہ غلط ہے، کیوں کہ عوام فارسی سے نا آشنا ہیں۔ اس لیے برطانوی حکومت محسوس کرتی ہے کہ اردو کو یہ مرتبہ دیا جانا چاہیے۔ دراصل برطانوی حکومت چاہتی تھی کہ فارسی کو ہٹا کر انگریزی کو انتظامیہ کی زبان بنایا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی منظر عام پر آئی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں سنسکرت، فارسی اور دیسی زبانوں میں تعلیم دینے سے طلبہ کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم انگریزی میں دی جائے۔ فارسی کو دفتری اور قانونی زبان کے طور پر جاری رکھنے کے خلاف برطانوی حکومت کی دلیل یہ تھی کہ فارسی عوام کی نہیں خواص کی زبان ہے۔ لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر جس انگریزی کو تھوپا جارہا تھا وہ عوام اور خواص دونوں میں سے کسی کی بھی زبان نہیں تھی۔ مگر ہونا وہی تھا جو حکمران وقت چاہتے تھے۔ یعنی اسکولوں اور کالجوں میں فارسی کے بدلے انگریزی پڑھائی جانے لگی۔ برطانوی حکومت کی اس تعلیمی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی نئی تعلیم یافتہ نسل انگریزی پڑھ کر خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہی رہی لیکن فکر ونظر اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے انگریز بن گئی۔

برطانوی حکومت کی یہ تعلیمی پالیسی بہت سوچی سمجھی سازش تھی جس کے ذریعے ہندوستانی تہذیب اور نظریات وعقائد کو ختم کرنے کی دانستہ کوشش کی جارہی تھی۔ اس پالیسی نے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی قدروں کو یکسر بدل دیا۔ جس کا اثر آج بھی ہندوستان کی سماجی زندگی پر نظر آتا ہے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالتوں اور دفتروں کی زبان انگریزی ہوگئی، جس کی وجہ سے انگریزی نے انتظامیہ میں فارسی کو نکال کر خود یہ مقام حاصل کرلیا۔ عدالتوں اور بعض دفتروں میں اوپر کی سطح پر انگریزی اور نچلی سطح پر اردو میں کام شروع کیا گیا۔

عدالتوں میں اوپری سطح کے فیصلے انگریزی میں اور نچلی عدالتوں کے فیصلے اردو میں دیے جانے لگے۔ عدالت کی نچلی سطح پر درخواستیں اردو میں دی جاسکتی تھیں۔ زمینوں کے ریکارڈ اردو میں رکھے جانے لگے۔ ہندوستان کے بہت سے صوبوں کی عدالتوں میں گواہی اردو میں دی جانے لگی اور گواہی کا ریکارڈ اردو میں رکھا جانے لگا۔ ان حالات میں دفتروں اور قانون کی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ ضروری تھا۔ اس لیے بڑے پیمانے پر دفتری اور قانونی کتابوں کے اردو میں ترجمے شائع کیے جانے لگے۔

11.5.1 ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں دفتری اور قانونی زبان اور اصطلاحات

ہندوستانی حکومت سے متعلق ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت سے دستاویزات شائع کرنے پڑتے تھے۔ ان دستاویزوں میں ایسی بے شمار قانونی اور دفتری اصطلاحیں شامل ہوتیں، جو آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے انتظامیہ میں استعمال ہوتی ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے جب خطوط لکھتے تو ان میں بڑی تعداد میں ایسی اصطلاحیں ہوتیں، جنھیں اکثر انگریز افسر نہیں سمجھ پاتے تھے۔ مثلاً آبدار، آبپاشی، فتویٰ، فقہ، احلال، ابضاع، پنڈی، خصومت، خوردہ فروش، کاشتکار، لگان، قطع بندی، جمع بندی، تحصیل، کھاتا، کھیت، منڈیر، رعیت، دزد، پرگنہ وغیرہ۔ یہ تمام اصطلاحیں عدلیہ اور مال گزاری سے متعلق تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں اردو، ہندی، عربی، فارسی، سنسکرت، مراہٹی، گجراتی، بنگالی، اڑیہ، تیلگو، کنڑ، تامل اور ملیالم زبانوں کی اصطلاحیں عدلیہ اور دفتری کاروبار میں استعمال ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزوں میں ان الفاظ کا شامل ہونا لازمی تھا۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ اکثر انگریز افسران اصطلاحوں کا مطلب نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ہندوستانی زبانوں کی دفتری اور قانونی اصطلاحوں کو مرتب کرکے شائع کیا گیا۔ ان ہندوستانی زبانوں کی اصطلاحوں کا مطلب انگریزی میں بیان کیا گیا۔ یہ کام اٹھارہویں صدی کے آغاز میں شروع ہوا تھا۔ ایسی اصطلاحوں کی پہلی لغت گلیڈون نے مرتب کرکے شائع کی تھی۔ یہ لغت اب ناپید ہے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم کوشش ایک انگریز افسر H.H. Wilson نے کی تھی جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرز کی ترغیب پر Glossary of

Judicial And Revenue کے نام سے سوا سات سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم فرہنگ تیار کی۔ جو 1855ء میں شائع ہوئی۔ دفتری اور انتظامیہ اصطلاحوں کو مرتب کر کے شائع کرنے کی یہ دوسری اہم کوشش تھی۔ **ولکنز** اور فیلن وغیرہ نے بھی دفتری اور قانونی اصطلاحات کو مرتب کر کے شائع کیا۔ درگا پرشاد نے ایک انگریزی اردو لغت Guide to Legal Translation مرتب کی۔ یہ لغت 1869ء میں شائع ہوئی۔ اُن کی ایک اور قانونی اصطلاحات کی انگریزی ڈکشنری A Concise Dictionary, 1905ء میں شائع ہوئی تھی۔ درگا پرشاد الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کے طور پر ملازم تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1- کس سن میں اعلان کیا گیا کہ برطانوی حکومت کا سرکاری کام فارسی کے بجائے اردو میں ہوگا؟

2- لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی میں کیا کہا گیا تھا؟

3- قانون کی انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی ؟

4- شاہ جہاں کے زمانے میں مال گزاری کا ریکارڈ کن زبانوں میں رکھا جاتا تھا؟

5- قانونی اور دفتری اصطلاحات کی پہلی لغت کس نے مرتب کی؟

6- درگا پرشاد کی دفتری اور قانونی اصطلاحوں کی کسی ایک ڈکشنری کا نام لکھیے۔

11.6 اردو میں دفتری اور قانونی اصطلاحیں

اردو میں قانونی اصطلاحات کا وافر ذخیرہ مہیا ہو چکا ہے اور اس میں بیشتر زیرِ استعمال رہا ہے۔ اس میں زیادہ تر مترادفات مقامی ذرائع اور نظام ہائے عدالت سے لیے گئے ہیں یا پھر اسلامی فقہ و شریعت سے لیے گئے۔ انگریزی عدالتوں کے قائم ہوتے ہی انگریزی اور رومن اصطلاحات، مقولوں اور کتابوں کے اردو میں ترجمے ہونے لگے۔ اس لیے اردو میں قانونی ذخیرۂ اصطلاحات بقول ڈاکٹر سید عبداللہ انگریزی سے کسی طرح کم نہیں بلکہ ملکی تقاضوں کے لحاظ سے انگریزی اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی البتہ نئے وکیل ان اصطلاحوں میں سے بیشتر کو نہیں جانتے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے پہلی بار انکم ٹیکس ایکٹ کا 'قانون انکم ٹیکس' کے نام سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بابو شیو پرشاد کے اشتراک سے یہ ترجمہ کیا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے 1860ء میں 'مجموعۂ قوانین تعزیراتِ ہند' کے نام سے انڈین پینل کوڈ کے اٹھارہویں باب کا ترجمہ کیا۔ اُنھوں نے 1861ء میں تعزیرات کے ضمیمے کا 'ضابطۂ فوجداری' کے نام سے ترجمہ کیا جو گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کی وضع کردہ اکثر قانونی اصطلاحیں آج تک مروج ہیں۔ مثلاً Criminal Breach of Trust کا ترجمہ خیانتِ مجرمانہ، Defamation کا ازالہ حیثیت عرفی، Solitary Confinement کا ترجمہ قیدِ تنہائی وغیرہ۔

اُنیسویں صدی کے آخر میں جو اصطلاحات اردو اخبارات، تراجم، قوانین، سرکاری احکامات اور سرکاری دفتروں میں استعمال ہوتی تھیں، منشی زوار حسین نے ان اصطلاحوں پر مشتمل ایک انگریزی اردو لغت مرتب کی، جو 1887ء میں مطبع مرتضوی، لکھنؤ سے 'فرہنگِ فرنگ' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس لغت میں تقریباً دو ہزار اردو اصطلاحات شامل ہیں۔

1985ء میں مجیب الرحمٰن مفتی کی مرتبہ لغت دفتری ترغیبات، محاورات اور فقرات کی لغت شائع ہوئی تھی۔ اس میں حکومت کے مختلف محکموں اور دفتروں کے مراسلات سے جملے اور ترکیبیں یکجا کیے گئے ہیں۔ مجیب الرحمٰن صاحب نے اصطلاحوں کے ایک سے زیادہ اردو مترادفات دیے ہیں اور انھیں مختلف جملوں میں استعمال کر کے دکھایا ہے۔ 413 صفحات کی اس لغت میں تقریباً دس ہزار اصطلاحات دی گئی ہیں۔

جس طرح فارسی سے بے شمار الفاظ اردو میں داخل کر لیے گئے ہیں۔ اُسی طرح انگریزی سے بھی بڑی تعداد میں الفاظ جوں کے توں اردو میں داخل کر لیے گئے ہیں اور اردو والوں نے اس کا ترجمہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مثلاً جج، پولیس، اسکول، کالج، بورڈ وغیرہ۔ بعض لوگوں نے انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان میں سے کچھ الفاظ تو ترجمے کے چلن میں آ گئے لیکن بہت سے الفاظ نہیں آ سکے۔ اردو کے ذریعے تعلیم پانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فارسی کی بہت سی سائنسی اور دوسرے علوم کی اصطلاحوں کو ہم جوں کا توں اردو میں لے لیں۔ چناں چہ انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں لے لیے گئے۔ مثلاً بلاؤز، لاٹری، ریڈیو، ریفریجریٹر، کمپیوٹر جوں کے توں لے لیے گئے ہیں۔

دفتری اور قانونی اصطلاحات کے سلسلے میں اردو میں بہت کام ہوا ہے۔ بڑی تعداد میں ان اصطلاحات کو جمع کیا گیا یا نئی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ قدیم زمانے سے اردو میں دفتری اصطلاحات بہت بڑی تعداد میں تھیں لیکن یہ مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ انھیں یکجا کر کے مرتب کیا گیا۔ ڈاکٹر عطش درّانی نے لکھا ہے کہ دفتری و قانونی اصطلاحات کی لغات خاصی بڑی تعداد میں اردو میں شائع ہوئی ہیں اور خاص طور سے قانون کے موضوع پر زیادہ لغتیں تیار ہوئیں۔

قانون میں دو طرح کی لغتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ لغتیں جو اردو سے اردو میں ہیں اور دوسری اردو سے انگریزی کی صورت میں ہیں۔ ان میں سب سے قدیم لغت گلیڈون کی ہے، جو 1797ء میں مرتب ہو کر شائع ہوئی۔ اس کے بعد روسو (1802ء)، فیلن (1879ء) وغیرہ کی لغتیں ہیں، جو اردو سے انگریزی کے زمرے میں آتی ہیں۔ اردو سے اردو لغتوں میں ''اردو قانونی ڈکشنری''، مختصر قانونی لغات اور لغاتِ قانونی از شمس الدین خاں شامل ہیں۔ انگریزی سے اردو اصطلاحاتِ قانونی کے لغات میں سب سے پہلے ڈاکٹر فیلن نے کام کیا۔ اس لغت میں الفاظ و محاورات کے ساتھ ضرب الامثال اور فقرات بھی دیے گئے ہیں۔ گھشتر اموہن بونیر جی کا ٹرانسلیٹر زفرینڈ (1905ء) ہے، جو اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ یہ اس کی مقبولیت ہے کہ 1950ء تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا لغت۔ آر ڈی۔ بھاٹیا کا ہے جو 1904ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے بعد جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کا قانونی لغت (1963ء) ہے جس کا چوتھا ایڈیشن (1983ء) میں شائع ہوا۔ ایک اور لغت لاہور سے ایم فارانی کالا ٹائم پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ چوتھا لغت مقتدرہ قومی زبان اور جامعہ کراچی کے تعاون سے 1982ء میں شائع ہوا۔ پانچواں لغت جو دراصل حیدر آبادی دور میں مرتب ہونا شروع ہوا، کشافِ قانونی اصطلاحات کے نام سے مقتدرہ نے 1987ء، 1998ء میں تین جلدوں میں شائع کیا۔ اسی طرح مقتدرہ نے اسلامی اصطلاحات پر ایک جامع لغت شائع کیا ہے۔

11.6.1 آزادی کے بعد ہندو پاک میں قانونی اور دفتری زبان کی صورتِ حال

1947ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہندوستان اور پاکستان کے ذمے داروں کو یہ احساس ہوا کہ ان کے ملکوں کی دفتری زبان ان کی قومی زبان ہونی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے دونوں ملکوں میں ایسا ادارہ قائم کیا گیا، جن کا کام دفتری کام کے لیے دفتری یادداشت کے نمونے تیار کرنا تھا۔ نیز دفتری کاروبار کے لیے اصطلاحات وضع کرنی تھیں۔ ہندوستان میں ہندی اور پاکستان میں اردو اس مقصد کے لیے منتخب کی گئیں۔ دفتری کام کے مختلف شعبوں میں استعمال ہونے والی اصطلاحوں کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔ پھر 1949ء میں پاکستان میں 'مجلسِ زبانِ دفتری' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کا مقصد تھا کہ پاکستان میں حکومتِ پنجاب کے تمام محکموں میں انگریزی کی جگہ اردو کو دی جائے۔ اس ادارے نے اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کے سلسلے میں بہت بڑا کام کیا بلکہ تمام اصطلاحوں کو یکجا کیا گیا اور نئی اصطلاحیں وضع کر کے ایک بہت جامع اور مستند لغت تیار کی گئی۔

یہ بات مستحسن تھی کہ دفتری زبان اور دفتری اصطلاحات کو بہت سہل اور آسان بنایا گیا۔ اس کے بعد اسلام آباد میں 'مقتدرہ قومی زبان' کے نام سے ایک بہت بڑا ادارہ قائم کیا گیا جس نے بڑی تعداد میں دفتری نظام کے لیے اردو میں کتابیں تیار کیں۔

11.6.2 پاکستان میں قانونی اور دفتری اصطلاحات کے ادارے

پاکستان میں اردو کو جب قومی زبان کا درجہ دیا گیا تو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ سرکاری محکموں میں انگریزی کے بجائے اردو میں کام کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر دفتروں میں استعمال ہونے والی زبان کا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔ اس کی ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ چوں کہ پہلے دفتری زبان انگریزی تھی۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی تھی کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ پنجاب (پاکستان) کے تمام محکموں اور عدالتوں میں انگریزی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرنے کے لیے دسمبر 1949ء میں پاکستان میں آفیشل لینگویج کمیٹی موسوم بہ مجلس زبان دفتری قائم کی گئی ہے، جس نے بڑے پیمانے پر، دفتری اور قانونی اصطلاحوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ کچھ سال بعد اسلام آباد میں اس مقصد کے لیے 'مقتدرہ قومی زبان' کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم کیا گیا' جس نے قانونی اور دفتری زبان کی اصطلاحوں پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔

11.6.3 دفتری مراسلت پر کچھ کتابیں

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے 1984ء میں 'دفتری مراسلت' (انگریزی۔اردو) کے نام سے ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی ہیں اور مجیب مفتی نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔

اس کتاب میں سرکاری خطوط انگریزی اور اردو زبانوں میں دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مراسلوں کی مختلف قسمیں بتائی گئی ہیں۔ مثلاً سرکاری مراسلت، نیم سرکاری مراسلت، یادداشت، دفتری یادداشت، اعلان، قرارداد، اعلانیہ اور دفتری حکم نامہ وغیرہ۔

اس کتاب سے نہ صرف پڑھنے والا دفتری نظام کی اردو زبان اچھی طرح سمجھ لیتا ہے بلکہ وہ دفتری نظام کے مختلف شعبوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر چند اور کتابوں کے نام ہیں:

'سرکاری خط و کتابت'، 'یادداشتیں'، 'سرکاری مراسلت'، 'رہنمائے دفتری اردو'، 'جدید عرائض نویسی'، 'قانونِ دستاویزات قابلِ بیع و شریٰ'، 'سرکاری خط و کتابت'، 'گشتی مراسلات اور تظہیریں'، 'اردو کی قدیم دفتری دستاویزات'

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو میں شائع ہونے والی دو قانونی لغتوں کے نام لکھیے؟
2. انکم ٹیکس کا اردو میں کس نے ترجمہ کیا تھا؟
3. 'مجموعۂ قوانینِ تعزیراتِ ہند' کے نام سے 'انڈین پینل کوڈ' کے اٹھارھویں باب کا ترجمہ کس نے کیا؟
4. آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں دفتری کام کاج کے لیے کون سی زبانیں منتخب ہوئیں؟
5. 'مجلسِ زبانِ دفتری' نام کا ادارہ کہاں اور کب قائم ہوا؟
6. 'مقتدرہ قومی زبان' پاکستان کے کس شہر میں قائم کیا گیا؟
7. 'مقتدرہ قومی زبان' کے نام کا ادارہ کہاں واقع ہے؟
8. اردو کو قومی زبان بنانے کے بعد دفتری زبان کے سلسلے میں پاکستان نے کیا قدم اُٹھایا؟
9. پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے افیشل لینگویج کمیٹی کب قائم کی گئی؟
10. دفتری مراسلت پر کم سے کم تین کتابوں کے نام بتائیے۔
11. دفتری مراسلتوں کی کم از کم چار قسمیں بتائیے۔

11.7 خلاصہ

اس اکائی میں بتایا گیا ہے کہ قانون کسے کہتے ہیں۔ قانونی اور دفتری زبان اور اصطلاحوں کا آغاز کس زمانے میں اور کس ضرورت کے تحت ہوا۔ اس اکائی میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جب مسلمان حکمراں آئے تو اپنے ساتھ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں لائے۔ جب ہندوستان میں اُن کی حکومتیں قائم ہوئیں تو اُنھوں نے دفتری اور قانونی زبان کے طور پر فارسی ہی کو استعمال کیا۔ دکن میں بہمنی حکومت قائم ہوئی تو بعض مورخین کے قول کے مطابق حکومت کی دفتری اور سرکاری زبان اردو تھی لیکن اکثریت اُن مورخین کی ہے جن کا کہنا ہے کہ سرکاری زبان اردو نہیں تھی۔ دکنی حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی، اردو، مرہٹی، تمل اور تیلگو کو بتایا جاتا ہے۔ شمالی ہند کی مسلم حکومتوں کی قانونی اور دفتری زبان ہمیشہ فارسی رہی۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں پہلے فارسی اور پھر انگریزی اور اردو سرکاری زبانیں رہیں۔

11.8 نمونۂ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. دکنی حکومتوں کی سرکاری زبان کون کون سی تھی؟
2. مغلوں کے عہد کی سرکاری زبان کون سی تھی؟ دفتری اور قانونی زبان کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا تدبیریں کی گئیں؟
3. ہندوستان میں برطانوی حکومت میں دفتری اور قانونی زبانوں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. قانونی اور دفتری زبان کا آغاز کس زمانے میں اور کس ضرورت کے تحت ہوا؟
2. مغل عہد کی دفتری اور قانونی اصطلاحات پر روشنی ڈالیے۔
3. ہندوستان کی آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں قانونی اور دفتری زبان کے تراجم کے لیے کیا اقدام کیے گئے؟

11.9 فرہنگ

فہم وادراک = دریافت۔ سمجھ۔ عقل
قانون وضع کرنا = قانون بنانا
مراسلت = خط وکتابت
جانشین = جو کسی کی جگہ پر بیٹھے۔ قائم مقام
مؤرخ = تاریخ لکھنے والا۔ مؤرخین جمع مؤرخ کی
مدلّل = دلیل پر مبنی
نظم ونسق = بندوبست۔ انتظام۔ دستور
تسلّط = حکومت پر قبضہ کرنا۔ قابو میں لانا
ضخیم = بڑے حجم والا۔ موٹا۔ بہت بڑا
مترادف = دو ہم معنی لفظ
عرائض نویس = (عریضہ کی جمع عرائض) درخواستیں یا عرضیات لکھنے والا

منظم = وہ چیزیں جو انتظام کے ساتھ ہوں
مقتدر = طاقتور، زور آور، معزز
حکمراں = حکم چلانے والا
منتقل ہونا = ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا
ہم عصر = ایک ہی زمانے کے۔ ایک ہی عہد کے
مستعار لینا = عارضی طور پر مانگنا۔ قرض لینا
مستشرق = وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو۔
استفادہ کرنا = فائدہ حاصل کرنا
ضرب المثل = کہاوت۔ وہ جملہ جو مثال کے طور پر مشہور ہو۔
مترادفات = جمع مترادف

11.10 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال — حیدرآباد میں اردو کی ترقی، حیدرآباد، 1990ء
2. ڈاکٹر عطش دُرّانی — اردو و اصطلاحات سازی، اسلام آباد، 1994ء
3. مختصر اصطلاحاتِ دفتری، — کراچی، 1981ء
4. دفتری اصطلاحات، تجارت، بنکاری — کراچی یونی ورسٹی، یہ کتاب چھ جلدوں میں مرتب کی گئی ہے اور سائیکلو اسٹائیل ہے۔
5. مصطلحاتِ دکن — نواب عزیز جنگ ولا، حیدرآباد، دکن، 1904ء
6. ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن — لاہور، 1983ء
7. احمد حسین خاں — اصطلاحات قانونی (اردو انگریزی)، لاہور 1858ء
8. دفتری اردو انٹرمیڈیٹ — اسلام آباد، 1980ء
9. خادم حسین — دفتری، طریقۂ کار، لاہور، 1982ء
10. ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی — سرکاری خط و کتابت، جلد اوّل 1987ء
11. ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی — دفتری مراسلت (انگریزی اردو)، اسلام آباد، 1984ء
12. نیاز عرفان — سرکاری خط و کتابت (جلد چہارم) اسلام آباد، 1991ء
13. ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری — اردو اصطلاحات سازی (کتابیات) 1984ء

اکائی 12 : اردو صحافت میں ترجمے کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

12.1 تمہید

12.2 صحافت کیا ہے؟

12.3 اردو صحافت میں ترجمے کی روایت

12.4 اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت وافادیت

12.5 صحافتی تراجم کی خصوصیات

12.6 اردو صحافت میں ترجمے کے مسائل

12.7 خلاصہ

12.8 نمونۂ امتحانی سوالات

12.9 فرہنگ

12.10 سفارش کردہ کتابیں

12.1 تمہید

الکٹرانک میڈیا سے پہلے صحافت کا لفظ صرف اخبارنویسی کے لیے تھا۔ جرنلسٹ اور جرنلزم کے لیے اخبارنویس اور اخبارنویسی کی اصطلاحیں آج بھی رائج ہیں۔ خبر عربی مادہ ہے اور اخبار خبر کی جمع ہے۔ خبر کے معنی ہیں آگاہی، جانکاری۔ اس کے اصطلاحی اور توسیعی معنی اور بھی کئی ہیں۔ جیسے کسی کی بات، حدیث، اور خبردار کا ایک طرح سے مخفف بھی ہے۔

صُحف عربی مادہ ہے، فارسی میں یہی لفظ حَ کے سکون سے ہے۔ اور اس کی جمع صحیفہ ہے، جس کے معنی کتاب کے ہیں۔ صُحف سے صحافت مشتق ہے، اور اصطلاح کے طور پر اسے اخبارنویسی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اخبارنویسی کے ہوتے ہوئے صحافت کی اصطلاح کیوں وضع کرنی پڑی، یہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ عہدِ قدیم میں گُپت چر ہوا کرتے تھے۔ چانکیہ نے ارتھ شاستر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ راجدھانی میں اور راجدھانی سے دور علاقوں میں خاص طور سے سرحدی علاقوں میں محکمہ خفیہ کے ایجنٹ ہوتے تھے، جو راجہ کو حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ زیادہ تر اطلاعات زبانی بھیجی جاتی تھیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں، خاص طور سے دلی میں سلطنت کے قیام کے بعد گپت چروں کا کام کرنے والوں کو پرچہ نویس کہا جانے لگا۔ انہی کا نام اخبارنویس بھی تھا اور ایک تیسرا نام بھی تھا۔ یعنی وقائع نگار۔ درسی کتابوں کے علاوہ سیر المتاخرین اور اور آئین اکبری میں بھی اس محکمے اور اس کی افادیت کا ذکر ہے۔ اس سبق کے لیے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اختصار کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو اس لیے کی گئی کہ اخبارنویسی/صحافت پر اردو میں جو کتابیں ہیں، ان میں پرچہ نویسی، اخبارنویسی اور وقائع نویسی کو اردو صحافت کی ابتدا قرار دیا گیا ہے۔ محکمہ خُفیہ /خفیہ کا کام کچھ اور تھا اور صحافت کا ادارہ کچھ اور ہے۔ اور شاید اسی لیے صحافت کی اصطلاح وجود میں آئی۔

اس اکائی میں صحافت کی تعریف اور اس کی نوعیت سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو صحافت میں ترجمے کی روایت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ صحافت کو جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے لہٰذا اس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اچھے صحافتی ترجمے میں کیا کیا خوبیاں پائی جانی

چاہئیں ان خصوصیات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ ہر کام کے دوران کچھ نہ کچھ مسائل حائل ہوتے ہیں اسی طرح ترجمے کے دوران بھی مسئلے درپیش ہوتے ہیں ان پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد پوری اکائی کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ امتحان میں کس طرح کے سوالات آسکتے ہیں اس کے لیے سوالات کے کچھ نمونے دیے گئے ہیں۔ آخیر میں آپ کی آسانی کے لیے فرہنگ اور کچھ کتابوں کے نام دیے گئے، جن سے آپ استفادہ کرسکتے ہیں۔

12.2 صحافت کیا ہے؟

ہر تعریف (Definition) کی کم وبیش کچھ نہ کچھ تحدیدات (Limitations) ہوتی ہیں۔ اس کا اطلاق صحافت پر بھی ہوتا ہے۔ جو واقعہ ہوا ہو، اسے معروضی طور سے، اپنے اخلاقی، سماجی، سیاسی اور مذہبی نظریے کی آمیزش کے بغیر، اپنے طبقاتی مفاد یا اخبار کے مالک کے مفاد کا لحاظ رکھے بغیر، اخبار پڑھنے والوں کی اطلاع کے لیے لکھ کر ایڈیٹوریل شعبے کو بھیج دینا صحافت ہے۔

کوئی تعریف مکمل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ یہ بھی ادھوری یا جزوی تعریف ہے۔ اخبار میں ایڈیٹوریل بھی ہوتا ہے۔ شذرے بھی ہوتے ہیں، مختلف کالم بھی ہوتے ہیں، مضامین بھی ہوتے ہیں اور یہ سب شفاف اور بے رنگ نہیں ہوتے۔ خبریں بھی بے رنگ یعنی معروضی نہیں ہوتیں۔ خبروں کے مختلف پہلو بھی ہوتے ہیں۔ کسی اخبار میں ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے، کسی میں دوسرا۔

ہر خبر کا ہر پہلو پیش بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود اخبار چھپتے ہیں، اور ان میں شہ سرخی والی خبریں بھی چھپتی ہیں، چہار کالم سے لے کر یک کالم سرخیوں والی خبریں بھی چھپتی ہیں۔

خبر کیا ہے؟ اس کی کوئی جامع تعریف جب وضع نہ ہوسکی، تو زچ ہو کر اس پر توڑ کرنا پڑا کہ اگر کتا آدمی کو کاٹ لے، تو یہ خبر نہیں ہے، ہاں آدمی کتے کو کاٹ کھائے، تو یہ خبر ہے۔ مزاح سے قطع نظر..... آج خبریں وہی ہیں، جن میں انسان کاٹا جاتا ہے۔ صرف فرقہ وارانہ دنگوں ہی میں نہیں، ٹیکسوں کے نہ دکھائی دینے والے دانت، گرانی، افراط زر (Inflation)، تعلیمی اداروں میں داخلہ نہ ملنا، بے روزگاری، رشوت، خودسرکاری کارندے..... فہرست ان گنت کی سرحد تک پھیلی ہوئی ہے۔

مترجم سے اس کا کیا تعلق؟ سوال بظاہر نہایت معقول ہے۔ میرے بھائی، میری بہن..... ترجمے اور ترجمے میں فرق ہے۔ لہٰذا مترجم کو چاہیے کہ وہ اس فرق کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ مذہبی صحیفے کا ترجمہ اس طرح نہیں ہوگا، جس طرح عمر خیام کی رباعی کا ترجمہ۔ اور پارلیمنٹ کے پاس کیے ہوئے کسی قانون کا ترجمہ اس طرح نہیں ہوگا، جس طرح کسی سیاسی لیڈر کے بیان کا ترجمہ اخبار کے لیے، کیوں کہ عزت مآب اکثر اپنے بیانوں کی غلط رپورٹنگ کی بنیاد پر (درست یا نادرست) تردید بھی کرتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. صحافت میں کن چیزوں کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے؟
2. اخبار نویسی کے مختلف پہلو کیا ہیں؟
3. کیا موضوعات کے فرق کے پیش نظر ترجمے کی کئی قسمیں ہیں؟

12.3 اردو صحافت میں ترجمے کی روایت

اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز "جام جہاں نما" نامی اخبار سے اس وقت ہوا جب برطانوی سامراج اپنے عروج پر تھا۔ یہ اخبار اردو کا پہلا اور ہفتہ وار اخبار تھا جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی سامراجی ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر جاری کیا تھا۔ یہ کبھی اردو میں نکلتا تھا تو کبھی فارسی میں اور بعض اوقات دونوں زبانوں میں نکلتا تھا۔ مگر پنجاب کی سکھ ریاست پر انگریزوں کے حملے کی تیاری کا راز کھولنے کی وجہ سے انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوا۔ وہاں سے چل کر رفتہ رفتہ اردو صحافت نے نہ صرف ترقی کے مراحل طے کیے بلکہ بحیثیت مجموعی قومی زندگی کے بہت سے شعبوں میں بیداری کی لہر بھی پیدا کی۔ آزادی وحریت اور قومی خود اعتمادی کے ساتھ رواداری کی وہ نرمی اور لچک داری بھی پیدا کی جو ہندوستان جیسے بڑے ملک کی سالمیت اور قومی ہم آہنگی اور اجتماعی

ترقی کے اہم اقدامات کے لیے اشد ضروری ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی سے 15 اگست 1947ء کو آزادی ملنے تک سیاسی رہبروں کی طرح اردو صحافت کے ابتدائی معماروں کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ برطانوی سامراج ہندوستان کی سرزمین سے جلد از جلد اپنا بوریا بستر لپیٹ کر روانہ ہو اور ہندوستان کے عوام اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو اخباروں میں مضمونوں' کالموں' اداریوں' شذروں اور جنگ آزادی کے رہنماؤں کے بیانات کی اشاعت کو جو اہمیت اور اولیت دی جاتی تھی وہ اہمیت روزمرہ کی زندگی میں معرض وجود آنے والے واقعات کی خبروں کو حاصل نہیں تھی۔ بیشتر خبریں اخباروں کے نامہ نگار یا ان کے قارئین مہیا کرتے تھے اکثر خبریں مراسلے کی شکل اختیار کر لیتی تھیں لہذا ترجمے کی ضرورت مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ چوں کہ اس وقت پورا معاشرہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک طرف انگریز حکمراں تھے تو دوسری طرف ہندوستانی عوام' انگریزی اخباروں میں جو کچھ شائع ہوتا تھا اس کے اپنے تقاضے اور مقاصد ہوتے تھے یعنی انگریزی حکومت کی برتری کا احساس پیدا کرنا اور ہندوستان میں اس کے قیام کا جواز فراہم کرنا' لہٰذا ترجمے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی کیونکہ انگریزی جاننے اور پڑھنے والا طبقہ یا تو انگریزی حکومت سے متاثر تھا یا انگریزوں کے انتظامیہ میں ملازمت کرتا تھا اور ان ہی کی سوچ رکھتا تھا۔ نیز انگریزوں کا یہاں ہونا ہندوستان کے لیے سودمند اور ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے مذکورہ طبقے کو اردو اخباروں کو پڑھنے کی نہ تو عادت تھی اور نہ ہی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزی خبروں' کالموں اور مضمونوں کا ترجمہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اردو اخبار پڑھنے والوں کا مذاق یہ تھا کہ وہ صرف برطانوی سامراجی حکومت کی مخالفت میں لکھے گئے کالموں' اداریوں وغیرہ کو پڑھنا پسند کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ جب اردو روزنامے سہ روزہ' ہفتہ وار اور ماہنامہ اخبار و رسائل آبادی کے ایک حصے کو متاثر کرنے لگے تو اس وقت بھی اردو صحافت مالی اعتبار سے اتنی صحت مند نہیں تھی کہ اردو روزنامے اپنے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر لگائے اور ان کے ذریعے دستیاب ہونے والی خبروں اور کالموں کے تراجم کرتے یا کراتے۔ بیشتر ہفتہ وار' سہ روزہ اور ماہنامہ اخبار و رسائل اہم شخصیات کی ملکیت ہوتے تھے اور یہ اشخاص اپنا مخصوص ذہن' مخصوص مقاصد اور مخصوص عزائم رکھتے تھے۔ ہر اخبار اور رسالے کے لیے ایک بڑا مسئلہ ترجمہ کرنے والوں کو ان کے کام کا معقول معاوضہ دینا تھا۔ اس لیے تراجم کی ضرورت و اہمیت کو نظر انداز کرنا ایک مجبوری ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عادت بھی بن گئی تھی۔ اس لیے اردو صحافت میں مجبوریوں' عادتوں اور ضرورتوں کے عدم احساس کے پیش نظر ترجمے کی کوئی باقاعدہ روایت قائم نہیں ہو پائی۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو روزناموں کا طریقۂ کار بدلتا گیا لہٰذا انگریزی اخباروں میں جو خبریں چھپتی تھیں انہیں میں سے ہر اخبار اپنی پالیسی یا اس کا کارروائی عملہ اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق چند خبریں منتخب کر لیا کرتا تھا اور اس بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اخبار کے قارئین کس مزاج کے حامل ہیں اور کس قسم کی خبریں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی جیسی تیسی تلخیص اور آزاد ترجموں سے کام چلا لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تازہ ترین خبروں کا دوسرا ذریعہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی اردو نیوز تھی جسے ہر اخبار کا ادارتی عملہ تیزی سے نوٹ کرتا اور پھر ان کے مفہوم کو اپنی عبارت میں لکھ لیتا۔ ان حالات میں ترجمے کی ضرورت اتنی شدید نہیں تھی کہ کوئی اخبار اس کے بغیر اپنا کام نہ چلا سکے۔ مزید برآں ضخامت کے اعتبار سے بھی اردو اخباروں میں اتنی خبروں کو پیش کرنا ممکن نہ تھا جتنی خبریں انگریزی اخباروں میں چھپتی تھیں اس لیے اردو اخباروں کا ادارتی عملہ انگریزی خبروں کا ترجمہ کرنے کے بجائے ان کی تلخیص پیش کرنے لگا اس لیے اردو صحافت سے جڑے ہوئے لوگوں میں تلخیص پیش کرنے عادت تو پڑی لیکن ترجمے کا فن نہیں آیا اور نہ ہی انہوں نے اس فن کو حاصل کرنے کی کوئی خاص کوشش کی۔ اسی لیے صحافت میں ترجمے کی بہت صحت مند روایت قائم نہیں ہو پائی اور شاید یہی وجہ ہے کہ صحافت کے میدان میں بہت معیاری مترجم نہیں پائے جاتے۔ عالم گیر دنیا (Globalised World) کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ترجمے کے معیاری روایت کا فقدان کمزور اردو صحافت کے پس پشت اہم وجوہ میں ایک اہم وجہ ہے۔

اس زمانے میں ادارتی عملے کی تنخواہوں کا کوئی اسکیل نہیں تھا اور نہ ہی اردو اخباروں کی اتنی آمدنی تھی کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضرورتوں کی کفالت کرنے والی تنخواہ دی جائے تاہم ادارتی عملے سے جڑا ہوا ہر شخص اخبار نویسی کو اپنی زندگی کا ایک مقصد سمجھتا تھا اور اپنے خلوص اور جذبہ قربانی کی بنا پر اس مقصد میں خود کو اس حد تک گم کر دیتا تھا کہ تجارتی ذہن رکھنے والے بیشتر اخباروں کے مالک ان کے اس مزاج کا غلط استعمال کرتے تھے۔ اپنی باعزت

بقا کے لیے بیشتر اخبار نویسوں کو ایک سے زیادہ اخباروں میں کام کرنا پڑتا تھا اور ان سب کی مجموعی آمدنی سے وہ اپنا اور بچوں کی پرورش کرتے تھے۔ یہ ایک مکمل مجبوری کا ماحول تھا۔ اس لیے جس طرح صحافت کا فن اردو اخباروں میں تعلیم و تربیت کا محتاج رہا۔ بعینہٖ ترجمے کا فن بھی اپنی ترقی کے راستے پر نہیں چل سکا اسی لیے اردو صحافت میں ترجمے کی کوئی صحت مند روایت قائم نہیں ہو سکی شاید اسی لیے اردو اخباروں کے دفتروں میں بقول مہدی نظمی :

"The struggle کا ترجمہ میری جدوجہد تو کیا گیا جو لفظی ترجمہ تھا لیکن تلاشِ حق نہیں کیا گیا جو فنکارانہ ترجمہ تھا"

(اردو صحافت اور ترجمے کا فن۔ مشمولہ اردو صحافت' اردو اکادمی' دہلی)

آج صورت حال قدرے مختلف ہے۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ اردو کے صحافیوں کے لیے کوئی تربیتی ادارہ نہیں ہے لیکن عالم گیر دنیا کی حقیقت کے پیش نظر تمام ورنا کولر زبانوں کی صحافت کو ترجمے پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ اور اسی انحصار کو بحسن و خوبی نبھانے ہی میں علاقائی زبانوں کی صحافت کی کامیابی پوشیدہ ہے۔ اس ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ہی ترجمے کے فن اور مترجمین کو قدر اہمیت دی جا رہی ہے۔ یو۔ این۔ آئی (United News of Inida) کی اردو سروس میں کام کر رہے بیشتر لوگ بنیادی طور سے مترجم ہیں اور یہ مترجمین یو۔ این۔ آئی کی انگریزی سروس سے خبروں کا ترجمہ' کمپوزنگ اور اڈیٹنگ کر کر اک ٹیلی پرنٹر سروس کے ذریعے ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہو رہے اردو اخباروں کو فراہم کرتے ہیں۔ اس سروس سے فائدہ اٹھانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' دہلی' اردو اخباروں کو پچاس فیصد سبسڈی بھی دیتی ہے۔ اس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ خبروں کی سطح پر تمام زبانوں کے اخباروں میں یکسانیت آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے پہلے اخبار کا کیا نام ہے اور کس نے نکالنا شروع کیا؟
2. اردو صحافت کے ابتدائی معماروں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد کیا تھا؟
3. شروع شروع میں صحافت میں ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی تھی؟
4. کس سروس کے ذریعے ملک کے مختلف شہروں سے نکلنے والے اخباروں کو ایک جیسی خبریں فراہم ہوتی ہیں؟

12.4 اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت وافادیت

ہر کسی انسانی گروہ کو معاشرے کی شکل اختیار کرنے کے لیے ترسیل و ابلاغ اشد ضروری ہے۔ اس لیے کہ معاشرے کے مسائل کے مہذب حل کے لیے ترسیل و ابلاغ کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشرے کی متعدد اور متنوع ضروریات کی تکمیل کے لیے لین دین کرنا پڑتا ہے۔ معاشرے کے لوگ اظہار و ترسیل اور لین دین کے لیے زبان کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر معاشرہ کسی نہ کسی علاقے تک محدود ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی زبان' تہذیب وغیرہ بھی علاقائی حدوں میں محصور ہوتی ہیں۔ صحافت ایک ایسا اجتماعی ذریعۂ اظہار ہے جس کے توسط سے معاشرے کی تمام اہم باتیں' ترقیاں اور اہم شخصیات کے کارہائے نمایاں روز کے روز منظر عام پر لاتے ہیں اور معاشرے کے لوگ ان سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح سے پورا معاشرہ اس ذریعے سے ایک دوسرے سے پوری طرح سے آگاہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں وہ معاشرہ تعفن کا شکار ہو جاتا ہے اور جب اس گھٹن سے آزاد ہونے اور وسعت و ترقی کے لیے ذرائع ڈھونڈتا ہے تو دوسرے معاشروں کی حدوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے لیے ترجمے کا سہارا لینا اس لیے اشد ضروری ہو جاتا ہے کہ دیگر معاشروں کی بہت سی چیزیں مختلف ہو سکتی ہیں انہیں میں سے زبان بھی ہو سکتی ہے اور کوئی معاشرہ جتنا محدود ہوگا اس کی زبان بھی اتنی ہی محدود ہوگی نتیجتاً اس کو ترجمے کی اتنی ہی ضرورت پیش آئے گی۔

مذکورہ بالا بحث کے پیش نظر اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت وافادیت واضح ہو جاتی ہے۔ اردو صحافت میں ترجمے کی ضرورت اس لیے محسوس کی جاتی ہے کہ اردو ایک ورنا کولر زبان ہے یا الگ بات ہے کہ اس کا دائرہ دنیا کے مختلف ملکوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس زبان میں براہ راست بہت ساری چیزیں دستیاب نہیں ہیں۔ لہٰذا ترجمہ واحد ذریعہ ہے۔ جس سے تمام چیزیں منتقل ہو سکتی ہیں۔ اس عالم گیر دنیا میں زبانوں کو بھی عالم گیر ہونا پڑے گا نہیں تو انسان کی

بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا زبانوں کو دنیا کی دیگر تہذیبوں سے باہم دیگر ہونا نہایت ضروری ہے۔ ترجمے سے اردو صحافت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ اس کے ذریعے اردو میں متنوع قسم کے مواد دستیاب رہے ہیں۔ سب ایڈیٹر حضرات یہ کرتے ہیں کہ انگریزی کے مختلف اخبارات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور موزوں و مناسب مواد ترجمے کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح سے نہ صرف اپنے قارئین کو ان کی پسند کے مطابق مواد فراہم کرتے ہیں بلکہ کسی خاص قسم کے موضوع و مواد کے مطالعے کے لیے ذوق و شوق بھی پیدا کرتے ہیں۔

اردو صحافت میں ترجمے کے ذریعے زبان میں بھی وسعت آئی ہے۔ چونکہ ترجمے کے ذریعے صحافت میں متنوع قسم کے موضوع و مواد در آتے ہیں اس لیے بہت سے موضوع و مواد سے متعلق لفظیات اور اصطلاحات کے بھی ترجمے کرنے پڑتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ چونکہ صحافت کی زبان آسان، پیش کش دلکش اور انداز بیان سلیس ہوتا ہے اس لیے صحافتی تراجم میں لفظیات و اصطلاحات کی منتقلی بھی آسان ہوتی ہے نیز ان لفظیات و اصطلاحات کو آسان جملوں میں پیش کیا جاتا ہے اس لیے ان کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے لہٰذا ان کا چلن عام ہو جاتا ہے کیوں کہ اخبار ہر طبقے کو سامان رکھ کر نکالے جاتے ہیں اور عوام الناس کی زبان میں مواد پیش کیا جاتا ہے۔

متنوع قسم کے موضوع و مواد مختلف قسم کے انداز بیان اور اسالیب کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس لیے جب مختلف قسم کے موضوع و مواد کا اردو صحافت میں ترجمہ ہوتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اندازِ بیان اور مختلف اسالیب سے بھی اردو صحافت متمول ہوتی ہے۔

صحافت میں مواد کی پیش کش کی تکنیک بھی اہمیت کی حامل ہے۔ جب آپ صحافت کے لیے ترجمے کرنے بیٹھتے ہیں تو دنیا کے دیگر اخباروں وغیرہ کی پیش کش کی تکنیک سے شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں اور انہیں بھی منتقل کرتے ہیں اس طرح سے اپنی زبان اور اپنی زبان کی صحافت بھی تکنیکی اعتبار سے متمول ہوتی ہے۔

صحافت میں ترجمے کے ذریعے اشتہارات کی بھی منتقلی ہوتی ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی متعدد اسکیموں اور پالیسیوں کی منتقلی سے اردو قارئین آگاہ اور مستفید ہوتے ہیں۔ اس طرح سے آپ کی زبان اور صحافت متعدد طریقے سے متمول ہوتی ہیں اشتہارات کے ترجمے کے ذریعے ہی مختلف تجارتی ادارے صحافتی اداروں کو معاشی طور سے مدد کرتے ہیں اس طرح سے اردو صحافت میں وسعت آتی ہے۔ کھلی فضا ملتی ہے اور ترقی کے مزید امکانات ممکن ہو پاتے ہیں۔

اردو صحافت میں ترجمے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مترجم نے بحسن و خوبی ترجمہ کیا ہے تو اس سے آپ کی صحافت میں تجزیاتی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ چونکہ مختلف ترقی یافتہ زبانوں اور موضوعات میں ترقی یافتہ تجزیاتی طریقے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس لیے اچھے ترجمے میں یہ تجزیاتی طریقے اور خصوصیات بھی منتقل ہوتی ہیں، نتیجتاً نہ صرف صحافی اور نو آموز صحافی حضرات میں جدید تر تجزیاتی قوت و صلاحیت پیدا ہوتی ہے بلکہ قارئین میں متوازن رائے قائم کرنے کی بھی خاصیت پیدا ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ اردو صحافت میں از خود تجزیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے۔

ترجمے سے صحافتی دنیا کو ایک اور بڑا فائدہ یہ پہنچتا ہے کہ ترجمے کے باوصف امتدادِ زمانہ براہ راست تحریری اور تخلیقی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ صحافی مترجمین کی ذولسانیت اس معیار کی ہو جاتی ہے کہ اسی میں سوچنے لگتے ہیں اور ان میں مختلف موضوعات پر از خود لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے اردو صحافت کی دنیا میں نہ صرف وسعت بلکہ گہرائی و گیرائی آ جاتی ہے اور شروع شروع میں یہی عمل دنیا کی سبھی زبانوں اور مضامین کے ساتھ ہوا ہے۔ اس طرح سے ترجمے کے باوصف صحافت کی دنیا بحیثیت مجموعی متمول ہوتی ہے لیکن صحافی مترجمین میں ترجمے کے ذریعے ترجمے کی دنیا سے آگے نکلنے کی خواہش ہونی چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کے باوصف اردو زبان میں کس طرح کی تبدیلیاں آتی ہیں؟
2. کیا صحافتی تراجم کے ذریعے موضوع و مواد میں وسعت آتی ہے؟
3. کیا امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں صحافتی تراجم سے صحافت کے میدان میں تجزیاتی و تخلیقی سطح پر کوئی تبدیلی آتی ہے؟

12.5 صحافتی تراجم کی خصوصیات

ترجمے کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم علمی وفنی ترجمے کی ہوتی ہے۔ دوسری قسم ادبی ترجمے کی ہوتی ہے اور تیسری قسم صحافتی ترجمے کی ہوتی ہے۔ علمی وفنی ترجمہ عموماً لفظی ترجمے کی تکنیک کے زمرے میں آتا ہے اور ادبی ترجمہ بامحاورہ ترجمے کے زمرے میں آتا ہے جب کہ صحافتی ترجمہ آزاد ترجمے کے زمرے میں آتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں قسموں کے ترجمے کے دوران ترجمے کی تینوں تکنیکوں کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لفظی ترجمے کی تکنیک علمی وفنی ترجمے کے دوران غالب ہوگی کیوں کہ اس قسم کے ترجمے کے دوران لفظوں اور اصطلاحوں کے ترجمے کی ضرورت کچھ زیادہ ہی پیش آتی ہے۔ اسی طرح سے ادبی تخلیقات کے ترجمے کے دوران محاوروں، تشبیہوں، استعاروں وغیرہ کے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ادبی تخلیقات کی اثر انگیزی میں ان کا بنیادی رول ہوتا ہے۔ لہٰذا ادبی ترجمہ بامحاورہ ہونا چاہیے اسی لیے عموماً بامحاورہ ترجمے کی تکنیک ہی کارفرما ہوتی ہے لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں کہ دیگر تکنیکیں بالکل کام میں نہیں آتیں۔ اسی طرح سے آزاد ترجمے کی تکنیک کا اطلاق عموماً صحافتی ترجموں پر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ دیگر تکنیکوں کا استعمال صحافتی ترجموں کے دوران نہیں ہوتا۔ کیوں کہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسی کتاب ہوگی جس میں صرف لفظوں اور اصطلاحوں ہی کا استعمال ہوا ہوگا اور محاوروں کا استعمال نہ ہوا ہو، دوسری اہم بات یہ ہے کہ چونکہ زبانوں کا تعلق تہذیبوں، معاشروں اور مخصوص علاقوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی ضروری نہیں کہ اصل زبان کی سبھی چیزیں ترجمے کی زبان میں پائی جائیں۔ لہٰذا ترجمہ کرتے وقت آزادی یعنی مجبوری ہو جاتی ہے۔

صحافتی ترجمہ کرتے وقت یہ مجبوری مزید ناگزیر ہو جاتی ہے کیوں کہ صحافت کے میدان میں وقت کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ بہت کم وقت میں بہت زیادہ کام تیزی سے کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے زبان و بیان کی سطح پر آزادی لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ صحافی مترجم کو مفہوم تک اپنے آپ کو محدود کرنا پڑتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ عموماً اخبار کی اہمیت اسی دن تک رہتی ہے۔ اس لیے بھی صحافتی ترجمے کی اہمیت دیرپا نہیں ہوتی۔ لیکن صحافی مترجم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ صحافتی ترجموں کے دوران بھی آزاد ترجمے کی تکنیک کے علاوہ دیگر تکنیکوں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے صحافی مترجم دونوں زبانوں پر عبور رکھنے کے علاوہ دیگر تکنیکوں سے بھی بخوبی نہ صرف واقف ہو بلکہ وقت ضرورت پڑنے پر استعمال میں بھی لاتا رہے۔

صحافت میں عام طور سے ترجمے کا کام سب ایڈیٹر ہی کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ مواد کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر لفظوں کا مفہوم سامنے رکھ کر ترجمہ کرتا ہے اور ترجمہ کرنے کے بعد دوبارہ زبان اور مفہوم کی صحت کا اہتمام کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سب سے اچھا ترجمہ وہی ہوتا ہے جس میں لفظ اور مفہوم دونوں منتقل ہو جائیں۔ اسی لیے صحافی مترجم کو دونوں پر پورا عبور ہونا چاہیے تاکہ آزادی لیتے وقت وہ اتنی بھی آزادی نہ لے لے کہ سیاست کار یا دیگر حضرات یہ کہیں کہ ان کی بات ہی نہیں سمجھی گئی یا بقول ان کے یہ تو میں نے کہا ہی نہیں۔

چونکہ خبروں کو دور دراز کے علاقوں اور تمام طبقوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ لہٰذا خبروں کا ترجمہ آسان اور سادہ زبان میں ہونا چاہیے۔ نیز چونکہ عموماً خبر سننے اور اخبار پڑھنے والا کم علم ہوتا ہے اور اس کی زبان غیر معیاری اور لفظیات بھی بہت محدود ہوتی ہے اس لیے صحافی مترجم کو کم سے کم لفظیات اور آسان زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے۔ سلیس، عام فہم اور مختصر جملوں کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

خبروں میں بھی آغاز اور متن کا باقاعدہ ارتقا اور عروج و اختتام کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اخبار میں سرخیوں کی زبان، لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب کی بھی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اچھے خاصے لوگ اخباروں کی سرخیاں ہی دیکھ کر متن یا مواد کی نوعیت کا تعین کر لیتے ہیں۔ اس لیے سرخی کافی احتیاط سے لگانی چاہیے تاکہ قارئین نہ صرف متوجہ ہوں اور پوری خبر پڑھنے کی طرف راغب ہوں اور اگر پوری خبر نہ بھی پڑھیں تب بھی سرخی اور آغاز سے پوری خبر کا اندازہ ہو جائے۔ اسی خبر کی اہم اہم باتیں آغاز میں ہی دے دی جاتی ہیں۔ صحافتی ترجمے کے دوران کفایت لفظی سے جہاں تک ممکن ہو کام لینا چاہیے اور مترادفات وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ خیالات اور الفاظ وغیرہ کی تکرار بھی نہیں ہونی چاہیے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں قارئین کا نہ صرف وقت ضائع ہوگا بلکہ خبر کی اثر انگیزی بھی ضائع ہوگی۔

آخیر میں ترسیل کے میڈیم، یعنی زبان اور اظہار کے اسلوب کے بارے میں ایک بنیادی بات کہنی ہے۔ صحافت وہ اخبار کی ہو یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ہو، جملہ چھوٹا اور سادہ ہونا چاہیے۔ وہ زبان لکھیں جو بولتے ہیں اور جس طرح بولتے ہیں۔ پیچیدہ جملے صحافی کی تحریر کو گنجلک اور ناقابل فہم بنا دیتے

ہیں۔شروع میں عرض کیا تھا کہ جس عبارت کا ترجمہ کرنا ہے اس کو ایک بار یا کئی بار توجہ سے پڑھ لیجیے۔اس کا مفہوم ذہن نشین کر لیجیے۔ذولسانی لغت میں ان الفاظ کے معانی دیکھ لیجیے اور نوٹ کر لیجیے، جن کے مفہوم کے بارے میں آپ کو شک ہے۔اور پھر اس طرح ترجمہ کیجیے۔یہ تصور کر کے کہ کوئی آپ کے سامنے بیٹھا ہے اور اس عبارت کا مفہوم سمجھانا ہے۔ظاہر ہے تقریر نہیں کرنا ہے، وضاحتیں نہیں کرنی ہے۔عبارت میں جس ترتیب سے جملے اور فقرے ہیں، اس ترتیب سے گفتگو کرنا، کوئی تحریر لفظوں کے بغیر نہیں ہوتی۔لیکن لفاظی سے احتراز کرنا لازمی ہے۔کہیں کہیں ذرا سا انحراف کیا جا سکتا ہے..... ترجمہ لفظوں کا نہیں خیال کی ترسیل کا مقصد ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ترجمے کی کون سی تین قسمیں ہیں؟ اور ترجمے کی کس تکنیک کا اطلاق بالخصوص صحافت پر ہوتا ہے؟
2. صحافت کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟
3. صحافتی ترجمے کے دوران وقت کی کتنی اہمیت ہوتی ہے؟

12.6 صحافت میں ترجمے کے مسائل

اردو صحافت میں ترجمے کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ صحافتی مترجمین کی تربیت کے لیے کوئی باقاعدہ ادارہ نہیں ہے۔اردو صحافیوں کے لیے ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ جیسے کورس تو بعض اداروں اور یونیورسٹیوں کے ذریعے چلائے جا رہے ہیں لیکن ان ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسوں سے نیم صحافی پیدا ہوتے ہیں نتیجتاً اردو صحافت بھی متاثر ہوئی ہے۔ترجمے کا بھی وہی حال ہے۔متعدد اداروں اور یونیورسٹیوں میں ترجمے کے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسس چلائے جا رہے ہیں اور ان کورسوں سے نیم مترجم پیدا ہوتے ہیں۔لہٰذا اردو صحافت میں ترجموں کا بھی تقریباً وہی حال ہے۔جیسا تیسا ترجمہ کر کے لوگ کنارے ہو جاتے ہیں اور یہ احساس کہ دوسرے روز ان ترجموں کی کوئی وقعت نہیں رہ جائے گی، صورت حال کو مزید بدتر بنا دیتا ہے۔اس لیے اشد ضروری ہے کہ صحافت اور ترجمے کے فن کے لیے باقاعدہ اور معیاری کورسس چلائے جائیں اس کے لیے اداروں اور یونیورسٹیوں کو بڑھ چڑھ کر آگے آنا ہوگا۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ماس میڈیا میں باقاعدہ ایم۔اے شروع کیا ہے۔اس کورس میں ایک پرچہ ترجمے کا بھی ہے۔شعبۂ اردو نے بھی اپنے ایم۔اے کے کورس میں ایک پرچہ ترجمے کا بھی رکھا ہے۔لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ترجمے میں ایم۔اے کا آغاز جلد ہی کرنے جا رہی ہے۔جس سے قوی امید ہے کہ صحافت اور ترجمے کے مسائل کافی حد تک حل ہونے لگیں گے۔

اردو صحافت میں ترجمے کا ایک دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ملک گیر پیمانے پر اصطلاح سازی اور ان کی معیار بندی کا کوئی معقول نظام موجود نہیں ہے۔گرچہ یہ حقیقت ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے تقریباً پندرہ بیس موضوعات کی فرہنگیں تیار کرائی ہیں تاہم پورے ملک کے متعلقہ ماہرین سے ان پر نظر ثانی کرا کے مبسوط بنانے کی ضرورت ہے تاکہ پورے ملک میں ان فرہنگوں کی قبولیت اور مقبولیت کو یقینی بنایا جائے۔ویسے بھی ابلاغ عامہ میں ان فرہنگوں سے استفادہ کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔چونکہ اس میدان میں کام بہت تیز ہوتا ہے اور وقت کی پابندی ضروری ہوتی ہے اس لیے استفادہ کرنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ لغات و فرہنگ سے رجوع کرنے کا بھی بہت کم رجحان پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں ایجادات و انکشافات کی تیز رفتار ترقی کے اس دور میں روز نئے نام اور اصطلاحیں وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔مرکزی نظام کا مطلب یہ ہے کہ مرکزی سطح پر ایک ایسا نظام ہونا چاہیے جس کے تحت تمام نئے لفظوں اور اصطلاحوں کے موزوں تراجم تیار ہو کر صحافت کے میدانوں اور اداروں میں پہنچ کر استعمال ہونے لگیں۔کیوں کہ اردو اخبارات میں ترجمے کے کام پر لگے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی نظام یا ادارہ موجود نہیں ہے۔وہ الفاظ کے معانی انگریزی اردو لغت میں دیکھتے ہیں۔لغت میں ہر لفظ کے کئی معنی دیے ہوتے ہیں لہٰذا مترجمین اپنی سمجھ کی سطح کے مطابق ترجمے کر لیتے ہیں۔زبان و موضوع پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے غلطیوں کے کافی امکانات ہوتے ہیں۔

صحافتی ترجمے کے لیے صرف دو زبانوں پر عبور ہی کافی نہیں ہے بلکہ مترجم کو تاریخ، جغرافیہ، سیاست وغیرہ کا جانکار ہونا چاہیے۔مختلف علوم و فنون،

مختلف پیشوں، مشغلوں اور کھیلوں کی معروف اصطلاحوں کا بھی علم ہونا چاہیے۔ دونوں زبانوں پر قدرت ناگزیر ضرورت ہے۔ دونوں زبانوں میں جملے بنانے کے طور طریقوں، زبان کے مزاج، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات واستعارات اور تشبیہات وغیرہ سے واقفیت کے بغیر اردو میں صحیح ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے صحافتی نظام میں ترجمے جیسے مشکل کام کو نوآموز صحافیوں کے حوالے کیا جاتا ہے لیکن ان کی رہنمائی اور مدد کے لیے تجربے کار صحافی بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ کام انتہائی ذمے داری کا ہوتا ہے اور اس کام سے وہی لوگ بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن کے علم، واقفیت عامہ، زبان دانی اور تجربے کا دائرہ زیادہ وسیع ہو کیوں کہ خبروں اور دوسرے صحافتی مواد کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر صورتوں میں ان میں حالات کے سیاق وسباق میں مکمل اضافہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اکثر وبیشتر خلاصہ نویسی کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ ایک اور حقیقت یہ بھی بہت ہم ہے کہ ترجمہ کرنے والے کا بنیادی طور پر اپنی زبان میں براہ راست تحریر کرنے یا تخلیق کرنے والے سے زیادہ عالم وفاضل، تجربہ کار اور ماہر ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جیسا تیسا ترجمہ کر لینے ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے اور اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اردو میں کسی نہ کسی طور پر مفہوم ادا ہو جائے۔

صحافت میں ترجمے کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں ملکوں کے نام مختلف ہوتے ہیں۔ اور بعض اسم معرفہ مختلف طریقے سے تلفظ کیے جاتے ہیں۔ اگر مترجم تاریخ، جغرافیہ اور مختلف زبانوں کے لسانی پہلوؤں سے بخوبی واقف نہ ہو تو وہ ملکوں کے نام اور اسم معرفہ کو صحیح صحیح منتقل نہیں کر پائے گا۔ مثال کے طور پر مصر انگریزی میں ایجپٹ (Egypt) ہو جاتا ہے جب کہ اردو میں مصر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اردن انگریزی میں جارڈن ہو جاتا ہے اور شام انگریزی میں سیریا (Syria) ہو جاتا ہے۔ اردو کے کئی حروف عربی میں نہیں پائے جاتے اس لیے ناموں کے تلفظ میں دقت آتی ہے۔ عربی زبان کے حروف تہجی میں حرف ''گ'' موجود نہیں ہے لیکن جیم سے شروع ہونے والے کئی عربی وفارسی نام انگریزی حرف "G" کی بدولت ''گ'' میں بدل جاتے ہیں۔ جولان کی پہاڑی کو ہمارے یہاں گولان کی پہاڑی پڑھا اور لکھا جاتا ہے یہ اس لیے کہ یہ عربی نام ہمارے یہاں انگریزی سے آیا ہے۔ اسی طرح سے گیلانی اور جیلانی کا مسئلہ ہے۔ بات یہی ختم نہیں ہو جاتی۔ فرانسیسی، ہسپانوی، جرمن اور روسی نام بھی بذریعہ انگریزی اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ لیکن اصل زبانوں میں ان کا تلفظ مختلف ہوتا ہے۔ نتیجتاً اردو میں کئی ناموں کی املا غلط ہو جاتی ہے۔

صحافت میں ترجمے کا ایک مسئلہ ہے کہ لوگ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مفہوم ادا ہو جانا چاہیے۔ یہ روش اس لیے رواج پا گئی ہے کہ زبان پر عبور نہیں ہوتا۔ اکثر بہت سے انگریزی الفاظ اردو املا میں لکھ دیے جاتے ہیں جن کے مناسب اور خوبصورت اردو مترادف موجود ہیں۔ اگر کوئی لفظ زبان زد ہو چکا ہے تو اسے اردو میں من وعن لے لینا چاہیے مثلاً اسکول، کالج، ورکر، فائل، انسپکٹر، یونیورسٹی وغیرہ لیکن اردو میں انگریزی زبان کے قواعد کے مطابق واحد کو جمع بنا کر اردو میں لکھنا اپنی زبان کے ساتھ ظلم ہوگا۔

ان پیشوں سے متعلق لوگوں کے لیے جن کا تعلق اردو زبان سے ہے کوئی تربیتی ادارہ اور کورس کا نہ ہونا بھی ایک مسئلہ ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں مختلف پیشوں سے متعلق لوگوں کے لیے ملازمت کے دوران تربیت کے لیے اور ان کی کارکردگی میں بہتری کے لیے کورسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان پیشوں سے جڑے ہوئے لوگوں کی بہتری کے لیے ورکشاپ اور سیمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان پیشوں سے جڑے لوگوں کی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے اور ان کی کارکردگی کو بہتر کرنے کے لیے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں اور حکمت عملیاں تیار کی جاتی ہیں۔ لیکن صحافت اور ترجمے کے فن کو مزید بہتر کرنے اور ان سے جڑے لوگوں کی کارکردگی کو مزید بہتر کرنے کے لیے ابھی تک ہمارے یہاں بہت معقول ماحول دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے ماحول کا اہتمام خود صحافیوں کی تنظیموں یا اردو اخبارات کے ذمے دار افراد کو کرنا چاہیے ایسے پروگراموں سے قوی امید ہے کہ ترجمے کا معیار اور نتیجتاً صحافت کا معیار بہتر ہوگا

کیا ترجمے کے لیے کوئی بنیادی اصول ایسا ہے، جسے ترجمے کا زریں اصول کہہ سکیں؟

جی ہاں ہے..... اور اگر مترجم اس پر کاربند رہے اور کبھی اس زریں اصول کو ذہن سے اوجھل نہ ہونے دے تو ترجمے میں ہمیشہ کامیابی ہوگی۔

ترجمے کا زریں اصول:

ترجمہ عبارت کے لفظوں کا نہیں

ترجمہ عبارت کے مفہوم کا ہوتا ہے

لیکن کیا کیجیے کہ عبارت لفظوں پر مشتمل ہوتی ہے اور لغت کے لفظ کے ترجمے میں مترجم کو مہارت ہونی چاہیے۔ اس مہارت کے لیے بھی ایک زرین اصول ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں پر عبور ہو۔ عبور پچاس فیصدی یا پچھتر فیصدی نہیں ہوتا۔ عبور مکمل ہوتا ہے۔ یعنی سو فیصدی۔ آپ کہیں گے / کہیں گی کہ اگر عبور مکمل ہوتا ہے تو پھر ذولسانی لُغت کی ضرورت کیا ہے؟ دراصل ذولسانی لغت سے دو زبانوں پر عبور حاصل کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ انگریزی کا برمحل لفظ یا محاورہ، یا مناسب اسلوب القانہ ہو تو معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مادری زبان اردو کا برمحل لفظ، فقرہ یا ترشا ہوا جملہ کسی ذہنی مشقت کے بغیر زبان پر نہ آئے، بہ الفاظِ دیگر القانہ ہو، مخلص لوگ کش مکش کی حالت و کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مہارت، جسے واقعی مہارت کہہ سکیں، وہ تو برسوں کی ریاضت کے بعد پیدا ہوگی۔ نوجوان مترجم کے لیے مفید یہ ہوگا کہ جس عبارت کا ترجمہ کرنا ہو، اس کو توجہ سے ایک بار نہیں، کئی بار پڑھ لے، اور اس کا مافیہا سمجھ لے۔ مافیہا سمجھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ متن میں جس لفظ کے معنی کے بارے میں ذرا بھی شک ہو، اس کے لغوی اور اصطلاحی معانی ذولسانی لغت میں دیکھ لے، اور جن معنوں میں یہ لفظ متن میں استعمال ہوا ہے، وہ نوٹ کر لے۔ یہاں دو باتیں عرض کرنی ہیں اور ان پر دھیان دینا چاہیے۔ اچھا لغت خریدنا ایک طرح سے سرمایہ کاری ہے۔ رقم ایک بار لگائی جاتی ہے اور علمی جستجو اور مشاغل میں قیمتی مدد اور رہنمائی کے روپ میں نہ صرف لغت کے خریدار کو، بلکہ اگلی پیڑھی کو بھی منافع ساری زندگی ملتا رہتا ہے۔ لغت بہت سوچ سمجھ کر خریدنا چاہیے۔ چار معیاری لغات فراہم ہیں :

1. انگلش اردو ڈکشنری: عبدالحق (بابائے اردو)

مولوی عبدالحق کی ڈکشنری بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ اس سے ترجمے میں استفادہ کریں۔ اس لغت کی تالیف میں جن لوگوں نے مولوی عبدالحق کا ہاتھ بٹایا، ان کے نام دیباچے میں مولوی حق نے لکھے ہیں، وہ یہ ہیں :

> ''سید وہاج الدین، مولوی محمد حسین محوی، مولوی وحید الدین سلیم، مولوی غلام یزدانی، مولوی سید ہاشمی، سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر یوسف حسین، شیخ چاند، سید سراج الدین ناگامیاں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ..... لیکن گردِ راہ میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اختر رائے پوری کو نظر ثانی کا اہم کام دیا گیا تھا۔ کچھ حروف خود مولوی عبدالحق دیکھ رہے تھے، لیکن ایک حادثے میں ان کے شانے کی ہڈی اُتر گئی تو ان کا کام بھی اختر حسین رائے دیکھتے تھے۔ لغت کا زیادہ اہم کام عابد صاحب اور اختر صاحب نے کیا۔ ڈکشنری اجتماعی کوشش سے بنتی ہے۔ لیکن مرتبین کچھ ناموں کو ظاہر نہیں کرتے۔''

مولوی عبدالحق کی لغت بنیادی ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر دو اور اہم لغات مرتب ہوئے ہیں۔

2. ڈاکٹر جمیل جالبی کی قومی انگریزی اردو لغت، دو جلدوں میں

3. چھ جلدوں پر مبنی جامع انگریزی اردو لغت، جو پروفیسر کلیم الدین احمد کی نگرانی میں کوئی بیس برس پہلے مرتب ہوئی تھی۔ کلیم الدین صاحب اس پر توجہ سے نظر نہ ڈال سکے تھے، اس لیے اس میں خامیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک اچھا اور مبسوط انگریزی اردو لغت ہے۔

4. شان الحق حقی کی مرتب کی ہوئی انگلش اردو ڈکشنری جدید ترین اور بہت معیاری ہے جسے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے 2003ء میں شائع کیا۔

آپ جب کوئی ایسا کام کریں، جس میں آپ نے کسی سے استفادہ کیا ہو، تو اس کا حوالہ ضرور دیں۔ اس سے آپ کی بات کو استناد حاصل ہوگا۔ لغات کی کئی قسمیں ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا بھی لغت ہے۔ اور مختلف موضوعات پر اصطلاحوں کی کتابوں کو فرہنگ کہتے ہیں۔ حالانکہ بڑی اور چھوٹی لغات کو بھی فرہنگ کہا گیا ہے۔ فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ آصفیہ اس کی مثالیں ہیں۔ کچھ اہم کتابوں اور کچھ اہم مصنفوں کی بھی فرہنگیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً گلستان شیخ سعدی کی فرہنگ۔ جس طرح حادثوں کے لیے کوئی وقت معین نہیں ہے، اسی طرح مترجم کے لیے بھی یہ معین نہیں کہ کس وقت کس موضوع پر ترجمے کی مشقت

اس کے سپرد کردی جائے۔اس لیے ہر وقت معلومات کی کتابوں سے مسلح' آراستہ اور تیار رہنا چاہیے۔ایک اچھی ذولسانی لغت۔ ہو سکے تو انسائیکلو پیڈیا نیز قومی اردو کونسل' دہلی اور مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد کی مختلف موضوعات مثلاً میڈیا' لسانیات' سیاسیات' تاریخ وغیرہ پر تیار کردہ فرہنگوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے صحافیوں کی تربیت کے لیے کیا کوئی ادارہ ہے؟
2. صحافتی تراجم کے دوران مترجم کو کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟
3. کیا صحافی مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے؟
4. اردو طلبہ کے لیے ماس میڈیا سے ایم۔اے کس یونیورسٹی میں شروع ہوا ہے؟
5. صحافتی تراجم کے دوران لغت وفرہنگ کی کیا اہمیت ہے؟

12.7 خلاصہ

اس اکائی میں اس بات پر گفتگو کی گئی ہے کہ اخبار نویسی کو خفیہ نویسی اور اخبار نویسوں کو پرچہ نویسوں کے زمرے میں رکھنا' صحافت کی روایت کے بارے میں خلط مبحث ہے۔اس بات پر بھی گفتگو ہے کہ اخبار نویسی کی اصطلاح کے موجود ہوتے ہوئے' صحافت کی اصطلاح کو کیوں ترجیح دی گئی۔ادبی ترجمے اور صحافتی ترجمے میں فرق ہوتا ہے۔ترجمے کے لیے اگر کوئی زریں اصول ہے' تو وہ کیا ہے؟ لغت اور فرہنگوں کی اہمیت کیا ہے' خاص طور سے ذولسانی لغات ترجمے اور مترجم کے لیے ضروری ہیں۔اردو کی اہم ذولسانی لغات کا بھی اختصار سے ذکر ہے۔

صحافت میں کسی واقعے کو معروضی طور سے پیش کیا جاتا ہے۔اس میں اپنے اخلاقی نظریے' سماجی نظریے' سیاسی نظریے اور مذہبی نظریے کی آمیزش نہیں کی جاتی۔اخبار نویسی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔مثلاً ایڈیٹوریل ہوتے ہیں' شذرے ہوتے ہیں' مختلف قسم کے کالم ہوتے ہیں مضامین اور مراسلے ہوتے ہیں۔جس طرح سے ترجمے کی عموماً تین قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح سے ترجمے کی تین تکنیکیں بھی ہوتی ہیں۔علمی ترجمہ یعنی دفتری اور قانونی ترجمہ' ادبی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ۔بڑے پیمانے پر ترجمے کی یہی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ان تینوں پر عام طور سے تین قسم کی تکنیکوں کا اطلاق ہوتا ہے۔پہلی تکنیک لفظی ترجمہ' دوسری تکنیک بامحاورہ ترجمہ اور تیسری تکنیک آزاد ترجمہ ہے۔

اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہے۔جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے شروع کیا تھا۔اردو صحافت کے ابتدائی معماروں کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد انگریزوں کو ملک سے بے دخل کر کے آزاد کرانا تھا جس کے لیے ان کا صحافتی قلم مانند تلوار چلتا تھا۔شروع شروع میں اردو صحافت میں ترجمے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوئی کہ پورا ملک انگریزی اور دیگر زبانوں کے زمرے میں منقسم تھا۔ورنا کولر زبانوں کے اخباروں کے ذریعے عوام کو بیدار کرنا مقصود تھا جو بغیر ترجمے کے بحسن وخوبی انجام دیا جارہا تھا۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ تمام چیزیں بدلتی گئیں حالات بدلتے گئے موضوع ومواد اور زیادہ سے زیادہ خبروں کی خاطر ترجمے شروع ہوئے اب تو یو۔این۔آئی کی اردو سروس ٹیلی پرنٹر سروس کے ذریعے ملک کے مختلف شہروں سے نکل رہے اخباروں کو ایک جیسی خبریں ترجمہ کرا کے فراہم کر رہی ہے۔

صحافتی تراجم کے باوصف اردو زبان میں وسعت وگیرائی آئی ہے عوام الناس تک یہ پہنچ پاتی ہے۔اس میں متعدد قسم کی لفظیات اور اصطلاحیں ترجمہ ہو کر عوام میں زبان زد ہوئیں نیز موضوع ومواد کی سطح پر بھی زبان کافی متمول ہوئی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترجمے کرتے کرتے صحافتی مترجم دونوں زبانوں میں سوچنے اور لکھنے لگتے ہیں اور اس طرح سے صحافتی تراجم سے باوصف امتدادِ زمانہ ترجمے کی زبان میں تحریری اور تخلیقی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

صحافت کی زبان عام فہم، سادہ اور سلیس ہونی چاہیے کیوں کہ اس کا تعلق عوام و خواص دونوں سے ہوتا ہے اور سادگی اور سلاست ہی ایسی خوبیاں ہیں جن کی طرف ہر کس و ناکس متوجہ ہوتا ہے اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سمجھ لیتا ہے۔ صحافتی ترجمے میں مفہوم پر پورا زور دیا جاتا ہے کیوں کہ وقت کی قلت ہوتی ہے۔ اردو کے صحافیوں کی تربیت کے لیے معقول اداروں کا فقدان ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ماس میڈیا میں ایم۔اے کا کورس شروع کر کے اس کمی کو دور کرنے کی سمت میں ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ صحافتی مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے۔ اس کی واقفیتِ عامہ عہدِ حاضر سے بھی ہم آہنگ ہونی چاہیے۔

12.8 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو صحافت میں ترجمے کی روایت پر روشنی ڈالیے۔
2. اردو صحافت میں ترجمے کی اہمیت و افادیت سے بحث کیجیے۔
3. صحافتی تراجم کی خصوصیات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. صحافت کے مادے، تعریف اور آغاز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. صحافتی ترجمے کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟
3. پرچہ نویس یا اخبار نویس کیا فرائض انجام دیتے ہیں؟

12.9 فرہنگ

تحدیدات = پابندیاں، مجبوریاں، معذوریاں

شذرہ = پراگندہ، منتشر، بکھری ہوئی چیز، اخبار میں ایڈیٹر کا کسی واقعے پر مختصر تبصرہ

آمیزش = ملاوٹ

زِچ = عاجز، تنگ، مجبور، بے بس

اِلقا = ڈالنا، غیب سے دل میں ڈالنا

ریاضت = محنت، مشقت، سختی

استناد = سند میں پیش کرنا، سند لانا

ضرب الامثال = کہاوت، وہ جملہ جو مثال کے طور پر مشہور ہو۔

تلمیح = کلام میں کسی قصے کی طرف اشارہ کرنا، اچٹتی نگاہ ڈالنا

عہدہ برآ ہونا = بری الذمہ ہونا، فرض ادا کرنا، وعدہ پورا کرنا

اسم معرفہ = وہ اسم جو کسی خاص شخص، مقام یا چیز کا نام ہو

من وعن = ہو بہو، جیسے کا تیسا

محصور	=	حصر کیا گیا، گھرا ہوا
اِمتداد	=	طوالت، درازی، لمبائی، مدت
تعفن	=	سڑاند، بدبو، عفونت
بقا	=	قیام، ہمیشگی، دوام، پائیداری، باقی رہنا، زندہ رہنا
عوام الناس	=	عام لوگ، بازاری آدمی، تمام آدمی
متمول	=	مالدار، دولت مند

12.10 سفارش کردہ کتابیں

1. اعجاز راہی (مرتبہ) — اردو زبان میں ترجمے کے مسائل
2. انور علی دہلوی (مرتبہ) — اردو صحافت
3. خلیق انجم (مرتبہ) — فن ترجمہ نگاری
4. قمر رئیس (مرتبہ) — ترجمہ کا فن اور روایت
5. ڈاکٹر کمال احمد صدیقی — اردو: ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل اور ابلاغ کی زبان
6. ڈاکٹر محمد شاہد حسین — ابلاغیات
7. سجاد حیدر — ریڈیائی صحافت
8. ڈاکٹر شافع قدوائی — خبر نگاری
9. محمد عتیق صدیقی — ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں
10. گربچن چندن — جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا

اکائی 13: اردو میں سائنسی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

13.1 تمہید

13.2 اردو میں سائنسی تراجم کی روایت

13.2.1 اردو میں سائنس کے اولین تراجم

13.2.2 شمس الامرا نواب فخر الدین کے دارالترجمے میں سائنسی تراجم

13.2.3 شاہانِ اودھ کے زیر اہتمام سائنسی تراجم

13.2.4 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں سائنسی تراجم

13.2.5 دہلی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی میں سائنسی کتب کے تراجم

13.2.6 سائنٹفک سوسائٹی اور سائنسی تراجم

13.2.7 طامسن انجینیرنگ کالج رڑکی کی جانب سے سائنسی تراجم کا اہتمام

13.2.8 قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا سائنسی ترجموں میں رول

13.2.9 ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ اور سائنسی تراجم

13.2.10 دارالمصنفین اور سائنسی تراجم

13.2.11 ہندوستان میں سائنسی تراجم کا اہتمام کرنے والے دیگر ادارے

13.2.12 پاکستان میں سائنسی تراجم

13.3 سائنسی تراجم کی ضرورت واہمیت

13.4 سائنسی تراجم کے مسائل

13.4.1 سائنسی تراجم کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل

13.4.2 سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی

13.5 خلاصہ

13.6 نمونۂ امتحانی سوالات

13.7 فرہنگ

13.8 سفارش کردہ کتابیں

13.1 تمہید

زبانیں معلومات کی ترسیل کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ ہر دور میں ماہروں، عالموں اور مفکروں نے اپنے علم وفضل کو عام کرنے کے لیے تصنیف وتالیف اور ترجمے کے راستے کو ہی اپنایا ہے۔ قوموں کی ترقی کی رفتار کا اندازہ بھی اس کے علمی اور تحقیقی ذخائر کو دیکھ کر ہی لگایا جاتا ہے۔ انسان کے علم و عرفان اور افکارِ تازہ کو بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث بنانے میں ترجمے نے غیر معمولی اور نتیجہ خیز رول ادا کیا ہے۔ ترجمے کے ذریعے ایک قوم کے ذخیرۂ

علم وادب کو دوسری قوموں تک پہنچایا ہے۔ یہ مترجمین ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے انسانوں کے تجربات، تحقیق اور علوم وفنون کے میدانوں کی مختلف ایجادات کو دیگر انسانوں تک پہنچاتے ہوئے فروغ علم میں زبردست تعاون فراہم کیا ہے۔ بیسویں صدی کے دوران علوم اور فنون کی ترقی اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں انسان کی حیران کن فتوحات اور کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اس تیز رفتار ترقی نے ترجمے کی رفتار کو بھی تیز ترین کر دیا ہے۔ جدید تحقیقات کے باعث نت نئی اصطلاحات نے جنم لیا ہے۔

سائنس کی اصطلاح کو عام طور پر مخصوص میدان سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا اصل مادہ لاطینی لفظ ''سائنشیا'' ہے۔ جس کے لغوی معنی ''علم'' کے ہیں۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں سائنس کے معنی منضبط یا منظم علم کے بیان ہوئے ہیں اور انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق ''وہ علم جو منظم اور نتیجہ خیز ہو سائنس ہے''۔ سائنسی علوم کی خاص بنیادیں دو ہیں' (1) دلیل (2) نتائج کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھنا۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ سائنس نئی نئی ایجادات کرتی ہے اور ٹکنالوجی نئی نئی ترکیبیں نکالتی ہے۔

اردو زبان دنیا کی شائستہ اور شیریں زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ یقیناً اردو کا لسانی و ادبی سرمایہ ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ دشواریوں کے باوجود اردو سائنسی اور تکنیکی ادب کی دوڑ میں کسی دوسری زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں موجود سائنسی سرمایہ ہندوستان کی بہت سی دیگر زبانوں کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے۔

اگر راستے کی مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے خلوص کے ساتھ سائنس اور تکنالوجی کے میدان کے جدید ترین تصورات کو اردو میں منتقل کیا جائے تو آج اس شیریں زبان میں وہ وسعت اور پھیلاؤ موجود ہے کہ اس کے دامن میں علم و تحقیق کے نئے موتی جڑ سکتے اور پیدا ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں موجود سائنسی ادب کے سرمایے کو جو بہت پہلے سے موجود ہے مربوط اور یکجا کیا جائے، اس ذخیرے کو پرکھا جائے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور پھر مزید ترقی دینے کے لیے واضح منصوبے تیار کیے جائیں اور اقدامات کیے جائیں۔

13.2 اردو میں سائنسی تراجم کی روایت

اردو کا شمار مشرق کی نوعمر زبانوں میں ہوتا ہے۔ تاہم اردو میں سائنسی ادب کی روایت کا آغاز تقریباً دو سو سال قبل ہی ہو چکا تھا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق سولھویں صدی میں بھی اردو کے سائنسی لٹریچر کی موجودگی کا امکان ظاہر ہوتا ہے۔ گو کہ قدر و قیمت کے لحاظ سے اردو میں سائنسی سرمایہ انگریزی کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اردو کے نثری سرمایے میں اس کا بھی قابل لحاظ حصہ ہے۔

ہندوستان میں ترجمے کا آغاز مغلیہ دور حکومت سے ہوتا ہے۔ ابتدا میں فارسی زبان میں علمی سرمایے کو منتقل کرنے پر توجہ زیادہ رہی۔ عربی زبان میں بھی کئی تراجم کیے گئے۔ پھر اردو زبان کی طرف توجہ ہوئی اور شروع میں فارسی، عربی اور سنسکرت زبان میں موجود علمی سرمائے کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی میں زیادہ تر کتابیں فارسی اور عربی سے اردو میں منتقل ہوئیں۔ انیسویں صدی عیسوی اردو تراجم کے عہد زریں کا آغاز ہے۔

یہاں سے اردو ترجمے کو ترقی کا نیا موڑ ملا۔ مختلف ادارے قائم ہوئے۔ اصطلاحات وضع کی جانے لگیں۔ تراجم پر نقد و نظر کا باضابطہ آغاز ہوا۔ ترجمے کے مختلف انداز اور اسلوب اختیار کیے گئے۔ سادہ، سلیس اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی زبان کا استعمال شروع ہوا۔ ان اداروں نے علوم وفنون، ادب، سائنس اور درسی کتابوں کے اردو تراجم کا باقاعدہ کام شروع کر دیا۔

13.2.1 اردو میں سائنس کے اولین تراجم

سائنسی کتابوں کے قدیم ترین ترجموں میں پادری پرکنس کی تالیف کردہ کتاب ''بحر حکمت'' ہے' جس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر نے کیا تھا۔ یہ کتاب 1798ء میں اردو میں ترجمہ کی گئی۔ اس میں ''اسٹیم'' یعنی ''بھاپ'' کے موضوع پر بحث کی گئی ہے اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 1811ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت ''جہاز رانی'' شائع کی' جس میں جہاز رانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا بھی اردو ترجمہ کیا گیا جو کمان

داروں کے لیے میدان جنگ میں اور بارکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔

اردو کے ابتدائی مترجمین میں سید محمد میر لکھنوی کا بھی نام آتا ہے انہوں نے ریورنڈ چارلس کی چھے جلدوں پر مشتمل کیمیا سے متعلق کتاب کا ترجمہ کیا تھا جو 1828ء میں طبع ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میر امّن دلی والے نے ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کے بعد ریورنڈ چارلس کی سات جلدوں پر مشتمل ''ستہ شمسیہ'' کا ترجمہ غلام محی الدین متین حیدر آبادی، مسٹر جونس اور موسیو تنڈرس کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔

1834ء میں دارالترجمہ کے قیام کے بعد شاہ علی متوطن قلعہ ادھونی نے ''ترجمہ شرح چغمنی'' کا کام انجام دیا۔ علم ہیت اور فلکیات کی یہ مستند کتاب سمجھی جاتی تھی۔

شمس الامرا کی سرپرستی میں رتن لال نے 1836ء میں انگریزی کے ایک رسالے علم جغرافیہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور طلبا کی معلومات کے لیے ایک اور رسالہ مرتب کیا جو ''رسالہ علم ہندسہ'' کے نام سے طبع ہوا۔

رائے منولال نے، جو کہ مدرسہ انجینیر ی حیدر آباد کے پرنسپل بھی تھے ''برنارڈ ہنٹر'' کی انگریزی کتاب ''علم ہندسہ'' ترجمہ کی، جو 562 صفحات اور 16 ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ اردو زبان میں ''ہندسہ بالوتر'' کے موضوع پر اردو زبان کی سب سے پہلی کتاب ہے، جس میں نظری مساوات کو اشکال کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ مسٹر مرّی نے ڈاکٹر میکلن کے انگریزی رسالے ''رسالۂ چیچک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں چیچک کے دہشت ناک اثرات کو واضح مثالوں کے ساتھ سمجھایا گیا ہے اور احتیاطی تدابیر کے ساتھ چیچک کے مریض کی جملہ کیفیت، پرہیز اور علاج سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ 1848ء میں شائع ہوا۔

مولوی محمد احمد نے 1851ء میں چارلس واکر کی انگریزی تصنیف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں ایک دھات سے دوسری دھات پر ملمع سازی کے آسان طریقے عام فہم زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔

سید محمد عبدالرحمٰن نے فارگیوسن کے ''رسالۂ علم ہیئت'' کے ایک جزو کا ترجمہ ''تختۂ گراں'' کے نام سے 1875ء میں کیا۔

اس عہد میں اردو ترجمے کا کام لکھنؤ میں بھی شروع ہوا۔ لیکن حالات زمانہ کی وجہ سے اس دور میں ترجمہ کی جانے والی اہم ترین کتابوں کے نسخے پوری طرح شہرت نہ پا سکے۔ سید کمال الدین حیدر نے نہ صرف یہ کہ اردو ترجمے کی ابتدا کی تھی بلکہ انہوں نے 19 مغربی رسالوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

13.2.2 شمس الامرا نواب فخر الدین کے دارالترجمے میں سائنسی تراجم

ہندوستان میں سائنسی علوم کی اشاعت اور فروغ میں شمس الامرا کبیر ثانی نواب فخر الدین خان کا کردار نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے جدید سائنسی علوم سے متعلق ہر نئی کتاب فرانس اور انگلستان سے منگوانی شروع کی اور ان کتابوں کے ترجمے کا اہتمام کرنے کے لیے عملی طور پر ایک ''دارالترجمہ'' قائم کیا۔ انہوں نے اپنی تمام درباری ذمے داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے ساری توجہ ادبی اور سائنسی علوم پر مرکوز کی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے 1825ء میں ایک مطبع سنگی بھی قائم کیا تھا۔

شمس الامرا نے اردو تراجم کے لیے سائنسی اصطلاح سازی کا کام بھی انجام دیا۔ انہوں نے حویلی جہاں نما میں دارالترجمہ شمس الامرا قائم کیا۔ اس میں ہندو، مسلم، انگریز اور فرانسیسی عالموں اور دانشوروں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ جدید علوم کو عوام سے روشناس کرانے کے لیے دارالترجمہ نے بے شمار کتابیں شائع کیں۔ شمس الامرا وہ پہلے ہندوستانی ہیں، جنہوں نے یورپی زبانوں سے اردو میں سائنسی تصنیفات کے تراجم پیش کیے۔

دارالترجمہ کے قیام اور تراجم کے سلسلے میں عملی تعاون دینے والوں میں قابل ذکر عالموں اور دانشوروں میں غلام محی الدین حیدر آبادی، مسٹر جونس، مسٹر جوزف، رتن لال اور میر شجاعت علی مکرم قابل ذکر ہیں۔ دارالترجمہ سے شائع ہونے والی تقریباً 50 کتابوں میں حساب، جیومٹری، طبیعیات،

کیمیا، فلکیات، طب یونانی اور میڈیسن وغیرہ شامل ہیں۔

شمس الامرا اور ان کا خاندان اور اس خاندان سے علمی طور پر وابستہ افراد کی سائنسی خدمات 1833ء سے 1877ء تک جاری رہیں۔ شمس الامرا کے علاوہ ان سے متعلق اربابِ علم کی انفرادی کوششوں اور خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان قابل ذکر اصحاب میں بدرالدین خاں رفعت جنگ تمیز، وزیرالدین خان، شمس الدین خاں فیض، میر عبداللطیف حکیم، شاہ علی، رتن لال، رام پرشاد، رائے منولال، مسٹر جوزف ولیم میکنزی، موسیو تندوسی، مسٹر جونس، مسٹر مرّی، حکیم قمرالدین، خواجہ نورالدین خاں عظمت جنگ، شیر علی، غلام امام خان، شمس العلما سید علی بلگرامی، میر طفیل علی، مولوی محمد احمد، سید محمد عبدالرحمٰن اور ابوعلی وغیرہ تھے۔ ان سب حضرات نے اپنی علمی استعداد اور صلاحیت کے مطابق علمی موضوعات اور سائنسی تراجم کے سلسلے میں گراں بہا کارنامے انجام دیے۔

شمس الامرا ابوالفتح خان کے بڑے فرزند شمس الامر افخرالدین خان نے حکمت، ہندسہ اور ریاضی میں سب سے پہلے یورپی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔

مندرجہ ذیل کتابیں ان ہی کی سرپرستی میں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر سنگی مطبع شمس الامرا سے ہی شائع ہوئیں۔ ترجمہ شرح چغمنی (قلمی) (1834ء)، اصول علم حساب (1836ء)، رسالہ کسوراتِ اعشاریہ (1837ء)، ترجمہ شمس الہندسہ (1839ء)، رسالہ علم جرثقیل (ستہ شمسیہ جلد اول) (1840ء)، رسالہ علم ہیئت (ستہ شمسیہ جلد دوم) (1840ء)، رسالہ علم آب (ستہ شمسیہ جلد سوم) (1840ء)، رسالہ علم ہوا (ستہ شمسیہ جلد چہارم) (1840ء)، رسالہ علم مناظر (ستہ شمسیہ جلد پنجم) (1840ء)، رسالہ علم برق (ستہ شمسیہ جلد ششم) (1840ء)، رسالہ علم واعمال کرّے کے بیان میں (1841ء)، منتخب البصر (دورنما) (1841ء)، کیمسٹری کا مختصر رسالہ (1843ء)، رسالہ مفتاح الافلاک (1844ء)، رسالہ کیمسٹری (1845ء)، خلاصۃ الادویہ (1846ء)، نافع الامراض (1846ء)، ترکیب ادویہ (1846ء)، رسالہ حیوانیاتِ مطلق (1848ء)، مرقع تصویر حیوانات (1848ء)۔

شمس الامرا رفیع الدین خاں کی سرپرستی میں جو کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئی ہیں ان کی تعداد بھی خاصی ہے ان میں سائنسی موضوعات پر مشتمل تصانیف و ترجمہ مندرجہ ذیل ہیں:

رسالہ علم ہندسہ (1835ء)، رفیع الحساب (1836ء)، تکملۂ رفیع الحساب (1838ء)، رفیع البصر (1841ء)، رفیع الصّنعت (1852ء)، رفیع التّرکیب (1868ء)، تختۂ گرداں (1875ء)۔

مندرجہ بالا مطبوعات کے علاوہ کئی قلمی کتابیں، کتب خانہ سالار جنگ میں آج بھی بہتر حالت میں موجود ہیں جن کی طباعت نہ ہوسکی۔

13.2.3 شاہان اودھ کے زیر اہتمام سائنسی تراجم

ہندوستان میں جدید علوم و فنون کی راہیں انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہی استوار ہوگئی تھیں، جن میں شاہان اودھ کو ایک ادارے کی حیثیت سے مرکزیت حاصل رہی۔ یوں تو انفرادی طور پر بہت سی کوششیں ریاضی، کیمیا، طبیعیات، حیاتیات، طب، ہیئت، نجوم اور موسیقی وغیرہ پر کی گئیں، لیکن ان میں باقاعدگی نہ تھی۔ دوسرے ان کی اشاعت و ترویج کے لیے اس دور میں وہ ذرائع اور وسائل بھی مہیا نہ تھے، جو بعد میں ہندوستان کو میسر آئے۔

شاہان اودھ کی سائنسی اور علمی سرگرمیوں کا باقاعدہ عہد 1833ء سے 1853ء تک ہے۔ اس عرصے میں نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ اودھ کے قابل ذکر حکمران رہے اور ان سبھی نے حسب استطاعت خود بھی جدید علوم سے متعلق کتابیں ترتیب دیں اور دیگر اصحابِ علم سے سائنسی کتابوں کے ترجموں اور تالیفات میں مدد بھی لی۔ اودھ کے اربابِ اقتدار کے علاوہ عبدالسلام لکھنوی، سید کمال الدین حیدر وغیرہ نے کئی انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے۔

سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی اور اشاعت میں اودھ کے حکمرانوں کا کردار نمایاں اور قابل ستائش ہے۔ اودھ کے آخری فرماں رواؤں کو جدید

علوم اور بالخصوص علم ہیئت سے نہایت دلچسپی تھی۔ اور انہوں نے انگریزی زبان سے مختلف سائنسی علوم کے ترجمے کرائے، جو مطبع سلطانی سے طبع ہوئے۔ انہوں نے رصد خانۂ سلطانی میں ایک انگریز عالم کو بطور مہتمم رکھا، تاکہ سائنسی ترجموں میں مدد ملے۔ اس مطبع سے شائع ہونے والے سب سے زیادہ ترجمے سید کمال الدین حیدر نے کیے۔ جواب تمام دستیاب نہیں ہیں لیکن 11 کتابوں کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ (1) رسالۂ علوم طبعیہ، (2) رسالۂ مقناطیس، (3) رسالۂ علم الحرارت، (4) رسالۂ علم المنظر، (5) رسالۂ علم الکیمیا، (6) رسالۂ مقاصد العلوم مصنفہ لارڈ بردوم، (7) رسالۂ علم الماء، (8) رسالۂ علم ہیئت مصنفہ جان برنکلی، (9) بحر حکمت از پادری پرکنس، (10) رسالۂ علم الہوا، (11) رسالۂ ہیئت مصنفہ ڈاکٹر ولسن وغیرہ۔

13.2.4 دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں سائنسی تراجم

اردو زبان میں سائنسی موضوعات کی منتقلی کا نکتۂ آغاز شمس الامرا کی کوششیں تھیں اور اس کے تقریباً ایک صدی بعد حیدرآباد ہی کی سرزمین سے ایک اور اجتماعی منظم کوشش نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں ہوئی، جنہوں نے سائنسی موضوعات کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ قائم کیا۔ دارالترجمہ کا قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے عظیم الشان منصوبے کا ایک حصہ تھا جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جائے گی۔ اس کے لیے نصابی کتابوں کی فراہمی اور ترجمے کے لیے اصطلاح سازی بنیادی مسائل کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔ لہٰذا عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے دو سال قبل 14/اگست 1917ء کو تالیف اور ترجمے کا شعبہ قائم کیا گیا۔ ترجمے کے لیے دارالترجمہ میں مستقل اسٹاف رکھا گیا تھا۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ مترجم اپنے مضمون کا ماہر ہو۔ اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی پوری قدرت رکھتا ہو۔ مستقل مترجمین کے علاوہ ہندوستان کے اسکالرز کی خدمات دارالترجمہ کے لیے بھاری معاوضے پر حاصل کی گئی تھیں۔ ابتدا میں دارالترجمہ کی نظامت مولوی عبدالحق کے سپرد کی گئی۔ دارالترجمہ کے اولین مترجمین میں قاضی محمد حسین کی تقرری ریاضیات کے لیے اور چودھری برکت علی کی تقرری سائنس کے لیے عمل میں آئی۔ دارالترجمہ کا کام دو طرح کا تھا یعنی اصطلاح سازی اور ترجمہ۔ شروع میں مغربی زبانوں کی کتابوں کے تراجم کیے گئے۔ بعد میں عربی، فارسی اور مشرقی علوم کی کتابیں بھی اردو میں منتقل کی گئیں۔ یہاں وضع اصطلاحات کے لیے مختلف علوم وفنون کی ذیلی مجلسیں اپنے اجلاس منعقد کرتی تھیں۔

متعلقہ فن اور لسانیات کے ماہر پورے غور وخوص اور مباحثے کے بعد اصطلاحات وضع کرتے تھے۔ ہر وضع کردہ اصطلاح کو مختلف پہلوؤں سے پرکھنے کے بعد ہی منظور کیا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں وضعِ اصطلاحات کے مسئلہ پر سخت اختلافِ رائے تھا۔ اور خاص طور سے سائنسی اصطلاحات کی تدوین کے سلسلے میں یہ اختلاف نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ابتدا میں یہ طے کیا گیا کہ انگریزی زبان کی اصطلاحات کے لیے اردو زبان میں اصطلاحات وضع کی جائیں۔ چودھری برکت علی خان نے وضعِ اصطلاحات کا طریقۂ کار تجویز کیا اور مخصوص بنیادی اصولوں پر مبنی ایک خاکہ تیار کیا۔ مختلف لوگوں نے اس خاکے کو پسند کیا، لیکن پروفیسر وحیدالدین سلیم کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کے مطابق یورپین زبانوں کی تمام اصطلاحوں کے لیے اردو اصطلاحیں وضع کرنا ضروری تھا۔ مسلسل دو سال کی بحث وتمحیص بھی اتفاق رائے پیدا نہ کرسکی۔ آخر کار غور وخوص کے بعد یہ طے کیا گیا کہ بحالت مجبوری موجودہ بین الاقوامی اصطلاحات ہی کو اختیار کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی اردو میں وضع اصطلاحات کی تحریک کو جاری رکھا جائے۔

اس تاریخی فیصلے کے بعد سائنسی کتابوں میں بین الاقوامی اصطلاحات کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ بعد میں طب وانجینیرنگ کے لیے بھی اس فیصلے سے استفادہ کیا گیا۔ تاہم ان شعبہ جات میں اصطلاح سازی کا کام بھی جاری رہا۔ یہ کام کس قدر پھیلا ہوا تھا اس کا اندازہ وضع کردہ اصطلاحات کی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نظام الدین ناظم نے اصطلاحوں کی جملہ تعداد 91088 بتائی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اصطلاحات علمیہ کا شماریاتی اشاریہ Numerical Index

ا۔ شعبۂ فنون:

1۔ فلسفہ	837
2۔ تاریخ	618
3۔ عمرانیات (سیاسیات ومعاشیات)	1728

ب۔	شعبۂ تعلیم:	
	تدریسیات (مطبوعہ)	537
ج۔	شعبۂ قانون:	
	قانون	18000
د۔	شعبۂ سائنس	
	1۔ ریاضیات وعلم ہئیت	1696
	2۔ طبیعیات	2000
	3۔ کیمیا	2452
	4۔ ارضیات	1387
	5۔ حیاتیات	7000
ھ۔	شعبۂ طب (حروف A-D مطبوعہ)	40000
و۔	شعبۂ انجنیری	10000
	جملہ	91088

اس طرح کل ملا کر سائنس وتکنالوجی اور میڈیسن کی اصطلاحات کی تعداد 63,146 ہوتی ہے۔ متفرق اصطلاحات کی کثیر تعداد اس میں شامل نہیں ہے۔ ایسی اصطلاحات پر نظر ثانی کی جارہی ہے اور عنقریب انہیں فن وار شائع کیا جائے گا۔ شرح دستخط ڈاکٹر محمد نظام الدین (مارچ 1946ء)

اس ادارے میں اصطلاح سازی کا کام نہایت احتیاط اور دانش مندی کے ساتھ انجام دیا گیا۔ پھر بھی بے احتیاطیاں ہوئیں اور بعض ثقیل اور نامانوس اصطلاحیں بھی مدون کر لی گئیں۔

دارالترجمہ نے مغربی علوم کی اردو میں منتقلی کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا اور مستقبل کے لیے راہیں ہموار کیں۔ شعبۂ ترجمہ واشاعت، جامعہ عثمانیہ کے مطابق دارالترجمہ میں 306 کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ اور انہیں شائع کیا گیا۔ ان میں طبیعیات، نظری کیمیا، فزیکل کیمیا، آرگینک کیمیا، باٹنی، زوالوجی، انجینیرنگ، اناٹومی، فزیالوجی، ہسٹیالوجی، آپتھلمالوجی، امراضِ نسواں، الجبرا، جیومیٹری، علم مثلث، کلکولس، اطلاقی ریاضی، اسٹرونومی اور جیالوجی وغیرہ جیسے اہم سائنسی میدانوں کی کتابیں شامل ہیں۔

13.2.5 دہلی کالج اور ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی میں سائنسی کتب کے تراجم

ہندوستان میں جن اداروں نے جدید علوم اور سائنس کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، ان میں دہلی کالج اور اس کی ورنیکلر سوسائٹی کا نام سرفہرست ہے۔ 1825ء میں اس کالج کا افتتاح ہوا۔ یہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ ریاضی، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اخلاقیات وغیرہ کے لیے بھی ذریعۂ تعلیم اردو ہی رہا۔ کالج کے مصلح بوترو نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے 1841ء میں ایک انجمن قائم کی۔ جس کا مقصد دیسی زبانوں میں سائنسی اور جدید علوم کے تراجم کرانا تھا۔ سوسائٹی نے تراجم کے اصول مقرر کیے اور اصطلاحیں وضع کیں۔ 1842ء سے یہ انجمن دہلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کہلانے لگی۔ یہ کالج کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی۔ غدر سے پہلے تک اس سوسائٹی میں ایک سو سترہ (117) کتابیں ترجمے اور تصنیف کے ذریعے تیار ہوئیں۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کو فروغ دینے والوں میں مسٹر بوترو، ڈاکٹر اسپرنگر، منشی کریم الدین، مولوی ذکاءاللہ، پنڈت رام چندر، پنڈت رام کرشن، ماسٹر بھیروں پرشاد، پیارے لال، ہردیو سنگھ اور ڈاکٹر ضیاالدین قابل ذکر ہیں۔ اس سوسائٹی کے ترجموں اور تالیف کی جملہ تعداد 128 ہے، جو تاریخ، جغرافیہ، اصولِ قانون، ریاضی، کیمیا، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، معاشیات، دیگر علوم وفنون نیز

ادب وغیرہ پر مشتمل ہے۔

دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر کا دامن وسیع کرنے میں اس قدر اہم خدمات انجام دیں کہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں ہی اردو زبان میں متنوع مضامین پر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں میں درج ذیل اہم ہیں۔

الجبراء، اصول علم ہیئت، رسالۂ کیمسٹری، جغرافیہ طبعی، علم وعمل طب، مساحت، طبیعیات، رسالۂ مقناطیس، حرکیات وسکونیات، علم مناظر، حرارت، رسالۂ علم برق، گالون ازم، رسالۂ علم حساب، رسالۂ علم مساحت، مستعمل وعلم مثلث (1844ء)، مبادیات تفرقی احصاء وتکمیلی احصاء، رسالۂ اعمال جراحی (1848ء)، اصول وقواعد مایعات (1850ء)، مزید الاموال یا سلاح الاحوال (1854ء)، اصول علم مثلث وترش ہائے مخروطی وعلم ہندسہ بالجبر (1844ء) اور رسالۂ اصول کلوں کے باب میں (1863ء) وغیرہ۔

چوں کہ کالج کو پہلے درسی کتابوں کی ضرورت تھی اس لیے سب سے پہلے درسی کتابیں ترجمہ یا تصنیف کی گئیں اس کے بعد دیگر کتابوں کے ترجموں اور تالیف کا اہتمام کیا گیا۔ ترجمے کے لیے اس سوسائٹی کے ذریعے تدوین کیے گئے اصول وضوابط کی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ ان قواعد کی روشنی میں آئندہ امکانات کی راہیں تلاش کی جاسکتی ہیں تاکہ زبان کو فطری سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے غیر زبانوں سے علمی اور سائنسی تراجم اور تالیفات کے کام کو انجام دے کر اردو نثر میں بڑی رنگارنگی پیدا کی ہے اور اس اعتبار سے اس سوسائٹی کے کارنامے ادب کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہیں۔

13.2.6 سائنٹفک سوسائٹی اور سائنسی تراجم

1863ء میں ڈیوک آف آرگائل کے زیر سرپرستی ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا غازی پور میں قیام عمل میں آیا۔ انگریز، مسلمان اور ہندوؤں پر مشتمل اس انجمن کے سکریٹری سرسید احمد خان تھے۔ سرسید نے خود اپنے الفاظ میں سوسائٹی کے مقاصد کا اس طرح تذکرہ کیا ہے۔ ''ہندوستان میں علم کو پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرکے چھاپے''۔ سوسائٹی نے صرف سائنسی ترجموں کے کاموں پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ عوامی شعور کی بیداری کے لیے اس کے زیر اہتمام سائنسی تجربات کا عوامی مظاہرہ منعقد کیا جاتا اور علمی جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام تقریباً سینتیس (37) کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں لیکن وہ سب آج کل نایاب ہیں۔ سوسائٹی نے جن کتابوں کا ترجمہ کرایا ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ حواشی کی مدد سے متن کے ایسے اشاروں اور اصطلاحوں کی وضاحت کی جاتی تھی جن سے عام طور پر ہندوستانی ناواقف ہوتے تھے۔ سوسائٹی کے یہ ترجمے عام فہم ہونے کی بنا پر کافی مقبول ہوئے۔ ان ترجموں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو مغربی افکار وخیالات اردو کے سانچے میں ڈھل رہے تھے تو دوسری طرف تخلیقات یا طبع زاد تحریریں بھی ان ترجموں کا اثر قبول کر رہی تھیں اور ان کا ایک مزاج متعین ہو رہا تھا۔ سائنٹفک سوسائٹی دراصل علی گڑھ تحریک کا نقطۂ آغاز تھی۔ سوسائٹی کی جانب سے ترجمہ کردہ چند اہم سائنسی کتابیں یہ ہیں۔ رسالۂ فلاحت، فن کاشت کاری، رسالۂ علم برقی اور رسالۂ جرثقیل وغیرہ۔

13.2.7 طامسن انجینیرنگ کالج رڑکی کی جانب سے سائنسی تراجم کا اہتمام

طامسن کالج خاص طور پر ان انگریز تعلیم یافتہ طلبا کی ضرورت کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا، جو انجینیرنگ کے میدان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خواہاں تھے۔ یہ کالج 19/ اکتوبر 1847ء کو وجود میں آیا۔ 1870ء میں اس کالج میں ہندوستانی طلبا بھی شریک ہونے لگے۔ ہندوستانی طلبا کی شمولیت کے باعث ہندوستانی زبان میں نصابی کتب کی فراہمی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے نصاب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کالج کے پرنسپل کرنل اے ایم برنڈریتھ کی زیر نگرانی ایک ترجمہ کمیٹی مقرر کی گئی اور ایک پریس بھی قائم ہوا۔ محدود مدت تک ترجمے کی خدمات انجام دینے کے باوصف رڑکی کالج ایک آزاد ادارے کی حیثیت سے سائنسی علوم کے ترجمے اور تالیف میں معاون ثابت ہوا۔

رُڑکی کالج کی مطبوعات سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت میں ایک نمایاں اہمیت کی حامل ہیں، کیوں کہ ایسی کتابیں اردو میں نایاب تھیں، جو کتابیں یہاں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں ان میں مندرجہ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں:

استعمال جرثقیل مصنف طامس ٹیٹ مترجم لالہ منولعل بہاری (مطبوعہ 1856ء)، رسالہ نمبر ہفتم در بابِ پیمائش مصنف میجر ایف فائر بریس مترجم شمبھوداس (مطبوعہ 1869ء)، رسالہ در بابِ فن نجاری مترجم لالہ منولعل بہاری (مطبوعہ 1870ء)، بیان لوکارتم اور استعمال ٹیبل لوگارتم مصنف کیپ مترجم شمبھوداس (1862ء)، مجموعہ سامان عمارت مصنف کرنل اے۔ایم۔ برنڈریتھ مترجم لالہ منولال بہاری ونشی روپ چند وغیرہ (مطبوعہ 1888ء)، قواعدِ حساب متعلقہ فن انجینیرنگ مصنف کرنل اے۔ایم۔ برنڈریتھ۔ مترجم لالہ جگ موہن لال (مطبوعہ 1885ء)، رسالہ نمبر نہم پول کے بیان میں مترجم لالہ بہاری لعل تیسرا ایڈیشن (مطبوعہ 1886ء)۔

13.2.8 قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کا سائنسی ترجموں میں رول

قومی اردو کونسل کی تشکیل 1996ء میں عمل میں آئی اور اس نے ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے اردو زبان کے فروغ کے لیے ہمہ جہت پالیسی کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔۔قومی نوڈل ایجنسی کے طرز پر کام کرنے والی اس قومی کونسل کی ذمے داریوں میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے پالیسیوں کا نفاذ شامل ہے۔نیز ایسے اقدامات بھی اس کی ذمے داریوں میں شامل ہیں جن سے اردو زبان میں سائنسی اور تکنیکی علوم کی توسیع ہو سکے۔قومی کونسل نے نئے وژن سے اپنے کام کی ابتدا کی اور اردو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، اسے جدید علوم کی کتابوں سے آراستہ کرنے کے لیے اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی سائنسی اور تکنیکی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی غیر معمولی کوششیں کیں۔اردو میں تعلیمی اور تکنیکی مواد فراہم کرنے کی خاطر قومی کونسل نے معیاری نصابی کتب کی اشاعت کی ذمے داری بھی لی۔اس ضمن میں مختلف سائنسی علوم کی کتابوں میں حیاتیاتی سائنس، طبعیاتی سائنس کے علاوہ جدید ریاضیات کے متعلقہ نصابی کتب برائے درجہ ہشتم تا دہم منظر عام پر آچکی ہیں۔

قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتابوں کی تعداد 1150 ہے، جس میں سائنس کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تعداد بھی کافی ہے۔کتابوں کے علاوہ اردو دنیا اور سہ ماہی فکر و تحقیق جیسے معیاری رسائل میں گاہے بہ ماہے سائنسی مضامین کے ترجمے بھی شائع ہوتے ہیں۔

13.2.9 ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ اور سائنسی تراجم

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی علی گڑھ کا قیام 1981ء میں ایک آزاد رجسٹرڈ سوسائٹی کے تحت عمل میں آیا۔دینی اداروں میں اس ادارے کو امتیاز حاصل ہے کیوں کہ یہاں منصوبہ بند طریقے سے ایسے موضوعات پر کام کیا جاتا ہے جن سے عصری مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔اسی لیے ادارے کی جانب سے مختلف ایسے سائنسی موضوعات پر مشتمل کتابوں اور مخطوطات کا ترجمہ کیا جاتا ہے، جن کا تعلق جدید معاشرتی اور تہذیبی مسائل سے ہے۔اس ادارے نے دورِ اسلامی کے سائنسی مخطوطات اور تحقیقی مضامین میں سے اب تک کئی سائنسی مضامین کا ترجمہ کیا ہے جو خود ادارے کی جانب سے بھی شائع ہوا ہے اور دیگر رسائل اور جرائد نے بھی اسے شائع کیا ہے۔

اس ادارے کی تاسیس مشہور عالم دین مولانا صدر الدین اصلاحی نے کی تھی۔ادارے کے موجودہ سرپرست مولانا سید جلال الدین عمری اس ادارے کے زمانۂ تاسیس سے سکریٹری بھی رہے ہیں۔اس ادارے کے علمی تراجم کے شعبے سے وابستہ افراد میں معروف نام ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، مولانا جرجیس کریمی، مولانا محمد فاروق خان اور مولانا سلطان احمد اصلاحی شامل ہیں۔

یہ ادارہ 1982ء سے پوری پابندی اور تسلسل کے ساتھ ایک سہ ماہی مجلّہ تحقیقاتِ اسلامی کے نام سے شائع کر رہا ہے۔ادارے کی بعض مطبوعات و تراجم دیگر مکتبوں سے بھی شائع ہوئے ہیں۔اس ادارے نے اپنے مقاصد میں اس بات کو بھی شامل کیا ہے کہ انگریزی اور ہندی زبانوں میں لٹریچر کی تیاری، ترجمہ اور اشاعت کی جائے۔ادارہ تحقیق کو جو چیز ملک کی دیگر علمی اور اشاعتی اداروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کالجوں،

یونیورسٹیوں اور دینی درسگاہوں سے فارغ طلبا کو تصنیف اور تالیف کے علاوہ ترجمے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ دینی مدارس سے فارغ طلبا کے لیے انگریزی اور کالج و یونیورسٹیوں سے فارغ طلبا کے لیے عربی سیکھنے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جامع منصوبہ ہے، جس کے ذریعے اردو زبان میں سائنسی مترجمین کی تیاری کا قابل قدر کام انجام دیا جارہا ہے۔

13.2.10 دارالمصنفین، اعظم گڑھ اور سائنسی تراجم

علامہ شبلی نے 1913ء میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا۔ جس نے مشرقی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کی بعض اعلیٰ تصانیف کے اردو میں تراجم کرائے۔ گو دارالمصنفین کی زیادہ تر توجہ مشرقی علوم وفنون اور مذہبی مسائل و دینیات کی طرف رہی لیکن اس ادارے نے مغربی علوم کی کتابوں کے تراجم کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کیا، یہی وجہ ہے کہ 1964ء تک دارالمصنفین سے مختلف علوم وفنون سے متعلق 117 کتابیں تالیف وترجمہ ہوکر شائع ہوئیں۔

عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا حمیدالدین اور پروفیسر نواب علی کو دارالمصنفین میں کیے گئے ترجموں کے باب میں اہمیت حاصل ہے۔ دارالمصنفین کے ترجموں میں انقلاب الامم۔ مبادی علم انسانی مکالمات برکلے، پیام امن، فطرت انسانی اور افکار عصر شامل ہیں۔

13.2.11 ہندوستان میں سائنسی تراجم کا اہتمام کرنے والے دیگر ادارے

ہندوستان میں اوپر بیان کیے گئے اداروں کے علاوہ مزید کئی اداروں نے علمی اور سائنسی تراجم میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ مثلاً ساہتیہ اکیڈمی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی مظفر پور، شاہ جہاں پور لٹریری انسٹی ٹیوٹ اور مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی وغیرہ۔ این سی ای آر ٹی نے بھی طلبا کے لیے نصابی سائنسی کتب این جی ٹی نے جنرل سائنس کی متعدد کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اور اب انیسویں صدی میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ نے سائنسی تراجم کے میدان میں نئے عزائم کے ساتھ اپنے کاموں کا آغاز کیا ہے، تاحال سرٹی فیکیٹ ان کمپیوٹنگ کی 16 کتابوں کے علاوہ بیچلر آف ایجوکیشن کی 48 ترجمہ شدہ نصابی کتابوں میں سے بعض کتابیں سائنسی علوم کی ہیں اور ڈپلوما ان پرائمری ایجوکیشن کی 32 زیر ترجمہ نصابی کتابوں میں سے بعض کتابیں سائنسی علوم کی ہیں۔

13.2.12 پاکستان میں سائنسی ترجمے

ہندوستان کی آزادی سے پہلے ہی متحدہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جو آج پاکستان میں شامل ہیں علمی میدان میں شائع ہونے والی کتابوں کے ترجموں کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن مشرق ومغرب کی بلند پایہ سائنسی کتب کو منتخب کر کے ترجمہ کرنے کا آغاز 1950ء میں مجلس ترجمہ، لاہور نے کیا۔ 1958ء میں حکومت مغربی پاکستان کے محکمۂ تعلیم نے اس ادارے کو نئی شکل بخشی اور اس کا نام مجلس ترقی ادب رکھا گیا۔ 1958ء کے آخر تک مجلس کی جانب سے 241 کتابیں شائع ہوئیں، جن میں مقدمۂ تاریخ سائنس، مادام کیوری اور افکار حاضرہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔

سرسید احمد خان اور ان کے جانشینوں کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے متعلق ادارہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی کی بنیاد 1886ء میں سرسید احمد خان نے رکھی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد 1951ء میں اسی نام کے ادارے کا احیا کراچی میں ہوا۔ ریسرچ اکیڈمی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، زبان وادب کی ترویج اور ترقی کے علاوہ علمی اور سائنسی کام کو بھی آگے بڑھا رہی ہے۔

1952ء میں مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن، نیویارک لاہور قائم کیا گیا۔ اس ادارے نے خاص طور پر امریکہ میں شائع ہونے والی جدید علوم کی کتابوں کا ترجمہ کر کے شائع کرانے کا اہتمام کیا محتاط اندازے کے مطابق مؤسسۂ فرینکلن کے زیر اہتمام تقریباً 400 کتابیں ترجمہ کی گئیں۔

شعبۂ تصنیف وتالیف اور ترجمہ، کراچی یونیورسٹی کا ایک شعبہ ہے۔ اس شعبے نے درسی کتابوں کی تصنیف وتالیف کے ساتھ تراجم اور فرہنگ کے

علاوہ وضع اصطلاحات کو یکساں اہمیت دی۔ اس ادارے کے ''جریدہ'' نامی تحقیقی مجلّے نے علمی اور سائنسی اصطلاحات سازی میں نمایاں کردار ادا کیا، اس ادارے میں ترجمہ کی گئی اہم کتابوں میں مغربی تعلیم کی تاریخ اور طبعی کیمیا وغیرہ شامل ہیں۔

ادارۂ وزارتِ تعلیمات پاکستان نے 1958ء میں ترقی اردو بورڈ کراچی کا قیام عمل میں لایا۔ بنیادی مقصد تو جامع اردو لغت کی تیاری تھا لیکن بعد میں بورڈ نے اپنے کام کو پھیلایا اور تمام علوم وفنون کی اصطلاحات، الفاظ، محاورات پر مشتمل لغت کے علاوہ ترجمے کے کام کو بھی انجام دیا۔ 1952ء میں قومی تعلیمی کمیشن کی سفارش پر مرکزی اردو بورڈ' لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ بورڈ کے قیام کا ایک اہم مقصد سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں اردو کی ترقی بھی تھا۔ بورڈ نے سائنس کی متعدد مضامین کی کتابیں اردو میں تیار کروائیں۔

حکومتِ پاکستان نے 1979ء میں مقتدرہ قومی زبان کا قیام عمل میں لایا۔ مقتدرہ قومی زبان نے نہایت ہی منصوبہ بند طریقے سے اپنی کارکردگی کا آغاز کیا اور علومِ جدیدہ کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ مقتدرہ نے فروغ اردو کے ضمن میں مواد فراہم کرنے کی خاطر کشاف اصطلاحات، نصابی کتب کی تدوین اور علمی وسائنسی کتابوں کے ترجمے جیسے غیر معمولی کام انجام دیے۔

پاکستان میں تراجم کے ان بڑے اداروں کے علاوہ مکتبہ اردو' لاہور، پیوپلز پبلشنگ ہاؤز' لاہور اور مقبول اکیڈمی لاہور ایسے ادارے ہیں' جنہوں نے علومِ جدیدہ سے متعلق کتابوں کے ترجموں میں اپنا رول ادا کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. انیسویں صدی کو اردو تراجم کا عہد زریں کیوں کہا جاتا ہے؟
2. سائنس کی کتابوں کا قدیم ترین اردو ترجمہ کون سا ہے؟
3. سائنسی تراجم میں شمس الامرا کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
4. شاہانِ اودھ نے سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟
5. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں اولین سائنسی مترجمین کون تھے؟
6. پروفیسر وحیدالدین سلیم کے مطابق وضع اصطلاحات کے لیے کون سا طریقۂ کار مناسب ہے؟
7. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات کی مجموعی تعداد بتائیے۔
8. سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا مقصد کیا تھا؟
9. طامسن انجینئرنگ کالج رڑکی کی ترجمہ کردہ سائنسی مطبوعات کون سی ہیں؟
10. قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا سائنسی تراجم میں کیا رول ہے؟
11. ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی نے طلبا کو ترجمے کے میدان میں تربیت دینے کے لیے کیا منصوبہ بندی تیار کی ہے۔
12. دارالمصنفین کی جانب سے مختلف علوم وفنون کی کتنی کتابیں تالیف وترجمہ کی گئی ہیں؟
13. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ نے سائنسی ترجمے کے میدان میں کیا کیا ہے؟
14. پاکستان میں اردو زبان میں سائنسی تراجم کے میدان میں مصروف اداروں کے نام بتائیے۔
15. مقتدرہ قومی زبان' پاکستان کا جدید علوم کی اردو میں منتقلی میں کیا رول ہے؟

13.3 سائنسی تراجم کی ضرورت واہمیت

انسانی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ علوم وفنون کی ترقی سارے خطۂ ارض پر کبھی بھی یکساں طور پر نہیں ہوئی۔ مختلف ادوار میں مختلف قوموں نے علم کے میدان میں الگ الگ کارنامے انجام دیے۔ لیکن اس کا دائرہ اس مخصوص قوم تک اس وقت تک محدود رہتا ہے' جب تک کہ ان کے علوم وفنون کا

دوسری زبان میں ترجمہ نہ کیا جائے۔ ترجمے کے ذریعے علوم وفنون کے دروازے سارے انسانوں کے لیے کھل جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف زبانوں مثلاً یونانی، سریانی، سنسکرت اور فارسی وغیرہ میں موجود علوم وفنون کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ اپنی مادری زبان میں منتقلی کے بعد ہی عربوں میں نہایت ہی بلند پایہ علما، مفکرین اور سائنسدان پیدا ہوئے۔ اہل یورپ نے بھی عربوں کی علمی اور سائنسی ترقی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ راجر بیکن نے بغداد اور اسپین میں موجود سائنسی سرمایہ فکر کو یورپ کے دیگر مقامات تک منتقل کیا اور سائنسی میدان میں مسلمانوں کی جانب سے پروان دی گئی تجربی فکر کو یورپی سائنس کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثال کے طور پر بوعلی سینا کی کتاب القانون یورپی جامعات کے میڈیسن کے نصاب میں تقریباً پانچ سو سال تک شامل رہی۔

ترجمے کے ذریعے سرمایۂ علم ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے۔ تجربات کے باہمی لین دین کے نتیجے میں زبانیں جدید علوم و فنون سے مالا مال ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کی تحقیقات، ایجادات اور اختراعات سے واقفیت حاصل کرتی ہیں۔ ترجمہ ہی وہ اہم ترین ذریعہ ہے، جس کی مدد سے قوموں میں علمی چیلنجس کو قبول کرنے کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں مسابقتی ماحول کو فروغ دیا جاسکتا ہے جو بنی نوانسان کے ارتقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔

جواہر لال نہرو نے ہندوستان کی آزادی کے بعد اس بات پر زور دیا تھا کہ عوام میں سائنسی مزاج اور سوچ کو فروغ دیا جائے۔ سائنسی تراجم اس ضمن میں بنیادی ضرورت ہیں۔ اس سے نہ صرف عوام کی معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ ان کے ذہنوں کے دریچے بھی کھلیں گے۔ اور فکر میں وسعت پیدا ہوگی۔ لہٰذا انسانی ذہن سازی کے لیے ترجمے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

بیسویں صدی میں سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں اتنی زبردست ترقی ہوئی ہے کہ اطلاعاتی تکنالوجی نے ساری دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے اور حیاتیاتی تکنالوجی نے انسانی وجود کے بنیادی عناصر تک کو سب کے سامنے عیاں کردیا ہے۔ لیکن اس ترقی کا مرکز ومحور دنیا کا مخصوص علاقہ ہی ہے۔ اگر موجودہ ترقی سے متعلق بھرپور معلومات اور فہم وبصیرت میں عمومیت پیدا کرنی ہے اور ساری دنیا میں موجود انسانی صلاحیتوں کو علمی چیلنج کے مقابلے کے لیے تیار کرنا ہے تو نہایت ہی ضروری ہے کہ سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں ہورہی ترقی کو دیگر زبانوں میں منتقل کیا جائے۔

قوموں میں ہورہی سائنسی ترقی کا اندازہ ہم ان کی مادری زبانوں میں تیار کی جارہی سائنسی تصنیفات اور تالیفات سے لگا سکتے ہیں۔ لیکن کتابوں کی تصنیف کوئی آسان کام نہیں ہے، سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں تصنیف کا کام تو اور بھی مشکل ہے۔ سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئی اصطلاحات وجود میں آرہی ہیں اور ہر وقت انسان کو نئے تجربات سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر سائنس اور تکنالوجی کے مواد کو دیگر زبانوں میں منتقل نہیں کیا جاتا رہے گا تو معلومات محدود دائرے میں ہی رہیں گی۔ ترجمے سے علمی اور سائنسی موضوعات پر کتابوں کی تیاری کے لیے ترقی پذیر قوموں کے افراد کو زبردست تحریک ملے گی۔ اس کے ذریعے علمی آگہی اور سائنسی بصیرت پروان چڑھے گی اور پژمردہ زبانوں میں حرارت پیدا ہوگی۔

کوئی بھی زبان تنہا نشوونما نہیں پاسکتی، اس لیے کہ انسان فی نفسہ اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا بھر میں ہورہی علمی کاوشوں اور کوششوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرتی رہیں۔ آج بھی ترقی یافتہ ممالک میں اس طرح کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں سائنس اور تکنالوجی کی بے انتہا ترقی کے باوجود دوسری زبانوں کے علوم وفنون خاص طور سے سائنس اور تکنالوجی کی ترقیات کو وہ اپنی زبانوں میں مستقل منتقل کررہے ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں ہمیشہ باشعور ہوتی ہیں اور آگہی اور اکتساب کا جذبہ اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد ان قوموں کا شیوہ رہا ہے۔

یورپ میں نہ صرف بڑے بڑے دارالترجمے قائم ہیں بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے ترقی یافتہ زبانوں نے ترجمے کے لیے مشینی ترجمے کی مؤثر تکنیک کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ آج انٹرنیٹ پر ایسی کئی ویب سائٹس موجود ہیں جو معلومات کے خزانے، علمی اور سائنسی رسائل وجرائد اور تحقیقی مضامین وغیرہ کا خودکار ترجمہ فراہم کردیتی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کی ترقی میں بھی سائنس اور تکنالوجی بنیادی مقام اور اہمیت کی حامل ہیں۔ ترقی پذیر ممالک سائنسی تراجم

کے ذریعے جدید علوم وفنون سے نہ صرف یہ کہ مالا مال ہو سکتے ہیں بلکہ انسانیت کے لیے اس میدان میں درپیش چیلنجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنا رول ادا کر سکتے ہیں۔

علمی اور سائنسی دریافتوں سے واقف ہونے کے بعد ہی کوئی قوم ان سے استفادہ کر سکتی ہے۔ بنی نوع انسان کو ان دریافتوں سے فیض پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف افراد مادری زبانوں میں سائنسی دریافتوں سے متعلق معلومات کو منتقل کریں۔ سائنسی ترقیوں نے انسانیت کے لیے بعض خطرات بھی پیدا کر دیے ہیں اور مختلف ممالک کے درمیان اس سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ ترجمہ مختلف اقوام کے درمیان افہام وتفہیم کا باعث بنتا ہے۔

اردو زبان میں سائنسی تراجم مندرجہ بالا تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اشد ضروری ہیں۔ اگر اردو زبان میں سائنسی ترقی سے متعلق سرمایۂ علم کو بروقت منتقل نہیں کیا گیا تو ہم عالمی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے نظری سائنس اور اس کے مسائل کو اردو میں منتقل کرنے کی بھر پور کوشش کی تھی، آج زمانہ نظری سائنس سے آگے بڑھ کر اطلاقی سائنس کے دائرے میں داخل ہو چکا ہے۔ نئی نئی دریافتوں کے باعث اصطلاحات کا ڈھیر لگتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں وقت کی ضرورت ہے کہ سائنسی علوم وفنون کی اردو زبان میں تیز رفتاری سے منتقلی کے لیے مناسب، مؤثر اور بروقت اقدامات کیے جائیں۔ اردو زبان نہایت شیریں زبان ہے، اگر سائنسی تراجم کو خشک اور جامد ترجموں کے بجائے ادب کی شیرینی سے مامور پرکشش اور جاذب ترجمے کا پیراہن پہنایا جائے تو اردو میں سائنسی علوم کے فروغ میں مدد ملے گی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ''ترجمے کے ذریعے علوم وفنون کے دروازے سارے انسانوں کے لیے کھل جاتے ہیں''۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
2. کیا عوام میں سائنسی مزاج اور سوچ کو فروغ دینے میں سائنسی تراجم مؤثر رول ادا کر سکتے ہیں؟

13.4 سائنسی تراجم کے مسائل

اردو زبان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ صرف شعر وادب کی زبان ہے اور علم وتحقیق، سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق مواد کی منتقلی کے لیے متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح کی باتیں اس وقت اور بھی سچی لگتی ہیں جب ہمارے سامنے سائنسی ترجموں کے نام پر ایسا مواد پیش کیا جائے جن کو پڑھنے کے بعد لطف اندوز ہونا تو دور کی بات مفہوم کو اخذ کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو۔ ظاہر ہے جب کسی زبان میں مواد کی ترسیل ترجمے کی شکل میں کی جائے اور اس کی راہ میں آنے والے مسائل پر پوری طرح نگاہ نہ ڈالی جائے تو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت حال میں یا تو اوپر بیان کیا گیا الزام حقیقت پر مبنی ہے کہ اردو زبان میں وہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایسے مضامین کو مؤثر طریقے سے پیش کر سکے جن کا تعلق نظری یا عملی سائنسی مسائل سے ہو۔ یا پھر ترجمہ کرنے والوں کے ذہن میں مسائل خود ٹھیک سے واضح نہ ہوں جن کو دور کر کے سائنسی ترجموں کو بھی قارئین کے لیے پرکشش اور جاذب بنایا جا سکتا ہے۔ ایک اور پہلو اس مسئلے کا یہ بھی ہے کہ قارئین کی بڑی تعداد خود اپنی زبان کے استعمال سے اتنی دور ہو چکی ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو استعمال نہ کر کے خود اپنی صلاحیت اور فہم کو گھٹا لیا ہے۔ سائنسی تراجم کے سلسلے میں درج ذیل مسائل اہمیت کے حامل ہیں۔

13.4.1 سائنسی تراجم کے دوران اصطلاح سازی کے مسائل

اصطلاح سازی ایک بہت ہی تکنیکی عمل ہے۔ اور سائنسی اصطلاح سازی میں نزاکت اور بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ اصطلاحات میں بہت ساری اصطلاحات کے بارے میں شدید اختلافات رہے ہیں۔ ایک بڑی تعداد متروک اصطلاحات کی بھی پائی جاتی ہے۔ اور کئی اصطلاحات پر غور وفکر کے لیے مشورے اور رائیں بھی آتی رہتی ہیں۔ اصطلاحات کے نظام کو سائنسی طریقے پر استوار کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ مسائل کی شدت میں مزید اضافہ ہوگا۔ اردو زبان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اردو کا رشتہ محض کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں رہا بلکہ اب اردو دنیا کے وسیع خطے میں تقریباً ہر جگہ بولی جاتی ہے لہٰذا مختلف النوع مسائل بھی ابھر رہے ہیں۔ سائنسی اصطلاحات کے ضمن میں درج ذیل مسائل کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔

عدم یکسانیت: اصطلاح سازی کا عمل نازک عمل ہے۔ اردو زبان پر مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں کے اثرات مرتب ہوئے اور بعض وقت ایک ہی اصطلاح کے مختلف ترجمے ہو جاتے ہیں۔ اور مترجمین کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کی وضع کردہ اصطلاح ہی درست ہے۔ مثلاً Acid کے لیے مختلف اصطلاحیں پائی جاتی ہیں جیسے کھٹا، ترشہ، ایسڈ اور تیزاب۔

انتشار: سائنسی اصطلاح سازی کے عمل میں جاری کوششوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور موجودہ انتشار کو دور کرتے ہوئے اردو زبان میں منتشر سائنسی سرمایے کو یکجا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تعلیم کے مختلف مرحلوں میں بھی سائنسی اصطلاحات کے استعمال میں دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مثلاً اسکول کی سطح پر نصابی کتابوں میں اصطلاحات کچھ ہیں اور کالج کی سطح پر کچھ اور، اور یونیورسٹی کے نصاب میں طلبا کو پھر جدید اصطلاح سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس طرح کا انتشار مروجہ سائنسی اصطلاحات میں جا بجا نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر نہ تو اس سرمایے سے کلی طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے اور نہ اردو زبان کو معیاری انداز میں آئندہ کی نسلوں تک منتقل کرتے ہوئے اسے سائنس و تکنالوجی کے جدید میدانوں میں موجود چیلنجس کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مروجہ اصطلاحات کی تطہیر کرتے ہوئے ان میں سے ادق، غیر معیاری اور گنجلک اصطلاحات کو پاک کرنا نہایت ضروری ہے۔ تطہیر اصطلاحات کا عمل بھی سائنسی ترجمے کے میدان کا ایک بہت بڑا ہدف ہے۔ اس کے لیے واضح منصوبہ بندی کے ساتھ اقدامات کرنا نہایت ضروری ہے۔

جدید ترقیاتی میدانوں میں اصطلاح سازی یا اصطلاحوں کا ترجمہ: جدید سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں نئے نئے الفاظ کا روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور ایسی نئی نئی اصطلاحیں وجود میں آرہی ہیں، جن کا انگریزی زبان و ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں زیادہ تر اصطلاحیں خود ساختہ ہوتی ہیں جو فنی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ضروریاتِ زمانہ کے ساتھ مقبول ہوتی ہیں۔ ایسی اصطلاحیں اردو ذخیرۂ کتب میں مدون اور مروج تو ہوتی ہیں لیکن آپ ان کے معانی کسی ڈکشنری میں تلاش کرنا چاہیں تو نہ مل پائیں گے بلکہ جہاں ایسی اصطلاحات موجود ہیں وہاں ان کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے تفصیل کے ساتھ مثالیں دیتے ہوئے ایک وضاحتی نوٹ بھی لکھا جاتا ہے۔ یہ کوئی بہتر طریقہ نہیں، انگریزی میں بھی ایسے کئی لاطینی اور یونانی زبانوں کے بے شمار الفاظ موجود ہیں (مثلاً طبی کتابوں میں یونانی اصطلاحات) جن کو انگریزی زبان میں یا تو ضم کر دیا گیا ہے یا اس کی شکل کو انگریزی کی طرح تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اصطلاح سازی اور ترجمہ دونوں ہی کام بیک وقت اہمیت کے حامل ہیں۔ مناسب ہے کہ سائنسی اور تکنیکی میدان کی اصطلاحات کے الگ الگ میدانوں کے لیے مسودے تیار کیے جائیں اور متعلقہ مضامین کے ماہرین سے استفادہ کرتے ہوئے اہل زبان اور اصحاب مضامین اصطلاحات سازی کے عمل کو تیز تر کر دیں۔ موجودہ رفتار اردو زبان میں علوم جدیدہ کی منتقلی کے لیے قطعاً کافی نہیں ہے۔

طریقۂ کار اور پالیسی کا فقدان: سائنسی اصطلاحات سے متعلق جملہ مسائل میں سے چند مسائل اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ ان تمام مسائل پر غور وفکر کے لیے جامع طریقۂ کار اور پالیسی کا فقدان خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ سائنسی تراجم کے میدان کو قطعاً کسی مخصوص خطۂ ارض سے جوڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس سلسلہ میں عالمی سطح پر ایک طریقہ کار اور پالیسی کو مرتب کرتے ہوئے ہی ان مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ایسے بے شمار قومی سطح کے ادارے ہیں جو باہمی اشتراک، تعاون اور ہم آہنگی کے ساتھ کوئی ایسا وفاق تشکیل دے سکتے ہیں جس کو عالمی پیمانے پر اعتبار اور قبولیت کا درجہ حاصل ہو۔

13.4.2 سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی

سائنسی ترجمے کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ نسبتاً یہ آسان ہوتے ہیں لیکن دور جدید کی تیز رفتار ترقی اور سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں نئے نئے زاویوں کے اضافے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے ساتھ بے اعتنائی اور بے گانگی نے سائنسی تراجم میں بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں۔

اردو کے عروج کے زمانے میں مملکت آصفیہ کے زیر اہتمام جامعہ عثمانیہ نے سائنس کے میدان کے نہایت لائق، عالم و فاضل اور ماہر افراد سے استفادہ کیا تھا۔ معیاری مترجمین کے تقررات عمل میں آئے تھے اور سائنس کے مضامین (طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیوانیات) کی انگریزی کتابوں کے

اردو ترجمے کا کام مقامی اور بیرون ریاست کے ماہر مترجمین اور پروفیسروں سے کروایا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ حالات میں سائنس اور تکنالوجی کے معیاری اردو مترجمین کی فراہمی ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کے میدان کے ایسے ماہرین تو تقریباً عنقا ہیں جن کو اصل زبان (Source Language) اور ترجمے کی زبان (Target Language) دونوں پر عبور ہو۔ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہوئے کسی مخصوص سائنسی میدان سے واقفیت رکھنے والے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ پھر کچھ لوگ ایسے ہیں جو مضمون میں تو درک رکھتے ہیں لیکن اصل اور ترجمے کی زبانوں میں سے کسی ایک زبان پر ہی قدرت رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں سائنسی علوم اور تکنالوجی کے ابھرتے میدانوں سے متعلق اہم ترین تصنیفات یا سائنس اور تکنالوجی کی درسی کتابوں کے ترجمے کا حشر اچھا نہیں ہوگا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ نے اس مسئلے کو اس طرح بیان کیا ہے۔ ''..... ہمارے ایک قومی ادارے نے ساتویں جماعت کی جنرل سائنس کی کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے کسی مترجم کو دی۔ مترجم نے بڑی محنت کی مگر سبجیکٹ سے ناواقف تھا اس لیے جہاں آکسیجن کی تیاری میں ''بی ہائیوشیلف'' کا ذکر آیا تو اس نے اردو میں ''شہد کی مکھیوں کے چھتے کے رکھنے کی جگہ لکھ دیا''۔ قصور اس کا نہیں تھا' بیچارے نے ڈکشنری سامنے کھول رکھی تھی.....''

گذشتہ دو صدیوں سے سائنسی علوم کے اردو ترجمے کا کام ہو رہا ہے اور مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے ہنوز جاری ہے۔ تاہم ابھی تک سائنسی علوم کے لیے ایسے مترجمین کی کھیپ تیار نہیں ہو سکی ہے' جو ان علوم سے وابستہ تمام تقاضوں کو پورا کر سکے۔

پاکستان بھی اس طرح کے مسائل سے دوچار ہے۔ منیر عالم عارفی نے اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالی ہے۔ ''ہمارے ادبا، جدید سائنسی تکنالوجی سے بہرہ ور نہیں ہیں اور جو سائنس داں ہمارے ملک میں موجود ہیں وہ قومی زبان سے ناواقف ہیں اس لیے اس میدان میں مخلصانہ کوششوں کی اشد ضرورت ہے''۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سائنسی تراجم کے دوران درپیش مسائل کون کون سے ہیں؟
2. مختصر نوٹ لکھیں۔ (1) تطہیر اصطلاحات (2) جدید ترقیاتی میدانوں میں اصطلاحات کا ترجمہ
3. سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی کے مسئلے کو کیسے حل کیا جائے؟

13.5 خلاصہ

اردو کا شمار مشرق کی نوعمر زبانوں میں ہوتا ہے، تاہم اردو میں سائنسی ادب کی روایات کا آغاز تقریباً دو سو سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں ترجمے کا آغاز مغلیہ دورِ حکومت سے ہوا۔ انیسویں صدی میں اردو تراجم کو ایک نیا موڑ ملا اور مختلف ادارے قائم ہوئے۔ باوجود مشکلات کے اردو کے پاس دیگر زبانوں کے مقابلے میں قابل قدر سائنسی سرمایہ موجود ہے۔ اگر اس سرمائے کو یکجا کیا جائے، پرکھا جائے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جائے اور مزید ترقی دینے کے لیے واضح منصوبہ بندی کی جائے تو اردو زبان میں علم و تحقیق کے نئے موتی جُو سکتے ہیں۔ سائنسی کتابوں کے قدیم ترین مترجم سید کمال الدین حیدر ہیں جنھوں نے پادری پرکنس کی تالیف کردہ کتاب ''بحرِ حکمت'' کا ترجمہ کیا تھا۔

شمس الامرا نواب فخر الدین کا رول ہندوستان میں سائنسی علوم کی اشاعت و فروغ میں ناقابل فراموش ہے۔ شاہانِ اودھ نے بھی سائنسی علوم کی اردو میں منتقلی اور اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نواب میر عثمان علی خاں کے عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمے کا قیام دراصل سائنسی علوم و فنون کی اردو میں منتقلی کی منظم اجتماعی کوشش تھی، دارالترجمہ نے سائنس اور تکنالوجی کی 63146 اصطلاحیں وضع کیں، اور دارالترجمہ کی وضع کردہ مجموعی اصطلاحوں کی تعداد 91088 ہے۔ دہلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی، طامسن انجینیرنگ کالج رڑکی اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے علاوہ دیگر کئی ادارے سائنسی تراجم کی روایات کو تازہ کیے ہوئے ہیں۔ دینی رجحان کے حامل اداروں میں ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی،

علی گڑھ اور دارالمصنفین اعظم گڑھ نے سائنسی تراجم میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستان میں بھی کئی ادارے سائنسی کتب کے تراجم میں مصروف ہیں جن میں مقتدرہ قومی زبان قابل ذکر ہے۔ بیسویں صدی میں سائنس اور تکنالوجی کی ترقی نے ساری دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایسے میں اردو زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دیگر زبانوں کا سرمایۂ علم اردو میں منتقل ہو۔ اس لیے کہ علمی اور سائنسی دریافتوں سے واقف ہونے کے بعد ہی کوئی قوم ان سے استفادہ کر سکتی ہے۔ اگر اردو زبان میں سائنسی ترقی سے متعلق سرمایۂ علم کو بروقت منتقل نہیں کیا گیا تو ہم عالمی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سائنسی ترجمہ بالکل آسان کام ہرگز نہیں ہے، سائنسی مترجمین کی عدم دستیابی ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ سائنسی ترجمے میں اصطلاح سازی بنیادی مسئلہ ہے۔ اصطلاح سازی سے متعلق مسئلوں میں اصطلاحات میں عدم یکسانیت، پیچیدگی، انتشار، تطہیر کا نہ ہونا، اصطلاح سازی کے طریق کار اور پالیسی کا فقدان جیسے مسائل شامل ہیں۔

13.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1- اردو میں سائنسی تراجم کی روایت پر روشنی ڈالیے۔

2- شمس الامرا نواب فخر الدین کے دارالترجمہ کے سائنسی ترجموں پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

3- دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے سائنسی تراجم کے میدان میں کیا خدمات انجام دیں؟

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1- ہندوستان میں سائنسی تراجم کے میدان میں رول ادا کرنے والے اداروں پر مختصراً روشنی ڈالیے۔

2- سائنسی تراجم کی ضرورت اور اہمیت پر ایک نوٹ لکھیے۔

3- سائنسی تراجم کے دوران کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بحث کیجیے۔

13.7 فرہنگ

اظہر من الشمس	=	سورج سے زیادہ ظاہر، سورج کی طرح ظاہر اور عیاں
ملمع سازی	=	سونا چاندی چڑھانا
نشاۃ ثانیہ	=	کسی قوم یا ملک کا از سر نو ترقی کرنا، دوبارہ عروج پانا
پیراہن	=	لباس، کپڑا، پوشاک
عنقا	=	سیمرغ، ایک خیالی پرندہ، نایاب شئے
استوار	=	مضبوط، محکم، مستحکم، پائیدار
جامعیت	=	ہمہ گیری، کاملیت، جس میں سب کچھ آ گیا ہو
ادق	=	نہایت مشکل، نہایت باریک
تطہیر	=	پاک کرنا، تزکیہ، پاکی، طہارت
درک	=	سمجھ، عقل، تمیز

13.8 سفارش کردہ کتابیں

-1	ڈاکٹر محمد شکیل خاں	اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
-2	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	مغرب سے نثری تراجم	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان
-3	مرتب ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ، حیدرآباد		مملکت آصفیہ میں اردو زبان کی ترویج و ترقی
-4	ڈاکٹر قمر رئیس	ترجمہ کا فن اور روایت	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
-5	مدیر اعلیٰ، ظہور الدین	ششماہی مجلّہ ''تسلسل''، جموں توی	شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں توی، جموں و کشمیر
-6	ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال	حیدرآباد میں اردو کی ترقی (تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے)	شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد
-7	اصطلاحات سازی		مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان

اکائی 14: اردو میں مذہبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل

ساخت

14.1 تمہید
14.2 اردو میں مذہبی تراجم کی روایت
14.2.1 اردو کا پہلا مذہبی ترجمہ
14.2.2 اردو میں دیگر دو مذہبی تراجم
14.3 مختلف مذاہب کی کتابوں کے ترجمے
14.3.1 قرآن مجید کے تراجم
14.3.2 نمونۂ ترجمہ (سورۃ فاتحہ)
14.3.3 حدیث کی کتابوں کے اردو تراجم
14.3.4 فقہ سے متعلق کتابوں کے اردو تراجم
14.3.5 ہندوؤں کی مذہبی ومقدس کتابوں کے اردو تراجم
14.3.6 سکھ مذہب اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں کے تراجم
14.3.7 انجیل کا ترجمہ
14.4 مذہبی تراجم کی اہمیت
14.4.1 ترجمہ برائے معلومات
14.4.2 ترجمہ برائے تبلیغ
14.5 مذہبی تراجم کے مسائل
14.6 خلاصہ
14.7 نمونۂ امتحانی سوالات
14.8 فرہنگ
14.9 سفارش کردہ کتابیں

14.1 تمہید

یوں تو ترجمے کی بے شمار تعریفیں ملتی ہیں۔ مثلاً

1) ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔

2) ترجمہ دو زبانوں کے درمیان ایک اہم رابطہ ہے۔

3) ترجمہ ایک زبان کی لفظیات میں پنہاں خیالات، احساسات اور جذبات کو دوسری زبان کی لفظیات میں منتقل کرتا ہے۔

4) ترجمہ ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے متعارف کراتا ہے۔

تاہم آخر الذکر تعریف کے پس منظر میں مذہبی تراجم کی اہمیت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی بھی تہذیب کی بنیاد کچھ خاص قدروں پر رکھی جاتی ہے اور یہ خاص قدریں عموماً مذہب کی دین ہوتی ہیں۔ جب دو تہذیبوں کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے تو ان میں سماجی ادبی اور مذہبی قدروں کی ادلا بدلی ہوتی ہے اور ادلا بدلی کا یہ عمل ترجمے ہی کے ذریعے طے پاتا ہے۔ مثال کے طور پر دور قدیم میں بدھ مت کے پیروکاروں نے اپنے صحائف کے کچھ حصوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے سے ان کا مقصد بدھ مت کی تبلیغ تھا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہندوستان کی تہذیب، چین کی تہذیب سے یکسر مختلف تھی، اس لیے ان راہبوں نے ترجمے کے لیے اپنے صحائف سے ان ہی حصوں کا انتخاب کیا، جو ہر تہذیب میں مشترک ہوتے ہیں۔ جیسے زہد و تقویٰ، پاکبازی، انسانوں اور جانوروں سے حسن سلوک وغیرہ۔ اس سے ان کا مقصد آسان اور سہل طریقے سے چینی تہذیب میں داخل ہونا تھا اور جب وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے رفتہ رفتہ مذہب کے ان گوشوں کو بھی ترجمے کے ذریعے واضح کرنے کی سعی کی، جو اپنی نوعیت میں ادق اور فسلفیانہ تھے۔

جب مذہب اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تو اہل یورپ کو اس کے بارے میں جاننے کی جستجو ہوئی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن میں کیا باتیں بتائیں گئی ہیں، جن باوصف مسلمان اسے آسمانی صحیفہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا، پھر فرانسیسی میں اور پھر انگریزی میں۔ وہ مذہب، جو عرب کی سرزمین سے اٹھا تھا، وہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتا گیا۔ اس کی تبلیغ و اشاعت میں جو عوامل کار فرما ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ آج قرآن مجید کے ترجمے نہ صرف یورپی زبانوں میں ملتے ہیں بلکہ یہ ترجمے دنیا کی ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔

یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دنیا میں ترجمے کا جس قدر کام ہوا ہے، اس کا نصف سے زیادہ حصہ مذہبی تراجم پر مبنی ہے۔ دنیا کی تاریخ بنانے اور سنوارنے میں مذہبی تراجم نے ایک اہم حصہ ادا کیا ہے۔

14.2 اردو میں مذہبی تراجم کی روایت

اردو میں مذہبی تراجم کی روایت اتنی ہی قدیم ہے، جتنی اردو کی عمر ہے۔ اگر ہم اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں، تو ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دنیا کی دیگر کئی زبانوں کی طرح اردو سماجی ضرورتوں کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی اس قدر مستحکم ہو گئی کہ اس میں علمی اور ادبی کام کرنا ممکن ہو گیا۔ اردو زبان و ادب اور ثقافت کے سفر کے تمام مرحلوں میں ترجموں نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں مسلمان برسرِ اقتدار تھے اور ان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ ان کی فوج میں اور سرکاری محکموں میں مقامی لوگ کام کرتے تھے، جو فارسی سے ناواقف تھے بلکہ وہ اُس دور کی علمی زبان سنسکرت سے بھی نابلد تھے۔ عوام کو حکومت کی پالیسیوں سے واقف کرانے کا کام زیادہ تر ترجمانی سے طے پاتا، مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ ان حالات میں ایک ایسی زبان کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی، جو ہر کسی کو آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ چنانچہ اس احساس اور کوشش کے نتیجے میں اردو نمودار ہوئی۔

14.2.1 اردو کا پہلا مذہبی ترجمہ

اردو کے ابتدائی نثری اور شعری ادب کے مطالعے سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ ادب زیادہ تر عربی اور فارسی کے ادب سے ماخوذ ہے، چناں چہ اس دور میں جو ادبی تحریریں رقم ہوئی ہیں، وہ سب کی سب فارسی اور عربی سے لی گئی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان تحریروں کا اردو میں من وعن ترجمہ کر دیا گیا ہے یا ان کے پلاٹ کو لے کر اردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے یعنی باز تخلیق کی گئی ہے۔

گرچہ دکن میں نثری ادب کی ابتدا چودھویں صدی کے اوائل سے ہو گئی تھی کیوں کہ (1399ء) میں دلی کے مشہور صوفی حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز شمال سے ہجرت کر کے بغرضِ تبلیغ گلبرگہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ جب آپ کے مریدوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو انہوں نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے اردو کو وسیلہ بنایا اور کئی کتابیں اسی زبان میں لکھیں، جن میں قابل ذکر ''معراج العاشقین'' ہے۔ یہ کتاب

1422ء سے قبل تحریر کی گئی تھی۔اس کتاب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ اردو کی سب سے پہلی شائع شدہ کتاب ہے۔اس کتاب میں مذہب اور تصوف سے بحث کی گئی ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ چودھویں صدی کی ابتدا ہی سے اردو میں مذہبی کتابیں لکھی جانے لگی تھیں۔جب کسی زبان میں کتابیں لکھی جانے لگتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب وہ زبان ترجمے کی متحمل ہوسکتی ہے۔

اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اردو میں ترجمہ شدہ وہ کونسی کتاب ہے، جس کو مذہبی ترجمے کی پہلی کتاب کہا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا نام لیا جاتا ہے۔اس کتاب کے مترجم شاہ میراں جی خدانما ہیں۔''تمہیدات ہمدانی'' دراصل عربی زبان کے مشہور و معروف عالم دین ابوالفضائل عبداللہ بن محمد کی کتاب ''تمہیدات عین القضاۃ'' کی فارسی شرح کا اردو ترجمہ ہے۔اس عربی زبان کی کتاب کی فارسی شرح خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے 1421ء میں لکھی تھی۔اس میں تصوف کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ اس اردو ترجمے کا پہلا نسخہ 1603ء میں لکھا گیا تھا۔شاہ میراں جی خدانما بے انتہا عالم و فاضل تھے اور تصوف میں انھیں بدرجہ غایت درک تھا۔ان ہی اوصاف کی وجہ سے انہیں شمس العشاق کہا جاتا تھا۔انہوں نے فارسی اور عربی سے نابلد لوگوں کے لیے اردو میں کئی کتابیں لکھیں جیسے ''شہادۃ الحقیقت''۔''خوش نغز''۔''خوش نامہ'' اور ''شرح مرغوب القلوب'' وغیرہ۔گویا اردو میں مذہبی تراجم کی روایت پندرہویں صدی ہی سے قائم ہوجاتی ہے۔

14.2.2 اردو میں دیگر دو مذہبی تراجم

شاہ میراں جی کے بعد دوسرے مترجم کے طور پر ملا وجہی کا نام لیا جاسکتا ہے جن کا تعلق قطب شاہی دور سے ہے۔ملا وجہی نے شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ''دستور عشاق'' کا ترجمہ ''سب رس'' کے نام سے 1635ء میں کیا۔''دستور عشاق'' میں تصوف کے مشکل مسائل کو مثالوں اور علامتوں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔اس کتاب کے ترجمے میں وجہی نے فارسی، عربی اور سنسکرت کے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں اور انہیں از روئے اردو قواعد استعمال میں میں لائے ہیں۔

دکن میں قطب شاہی دور کے اختتام کے بعد مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔اس دور کے ایک ممتاز ترجمہ نگار شاہ ولی اللہ قادری گزرے ہیں۔انہوں نے 1704ء میں فارسی تصنیف ''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔تصوف کی اس کتاب کے مصنف شیخ محمود ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے پہلے مذہبی ترجمے کا نام بتائیے۔
2. معراج العاشقین کس کی کتاب ہے؟

14.3 مختلف مذاہب کی کتابوں کے ترجمے

ہندوستان ایک کثیر آبادی والا ملک ہے۔جس میں بہ لحاظِ تعداد ہندو سب سے زیادہ ہیں اس کے بعد بالترتیب مسلمان، سکھ اور عیسائی۔اسلام، ہندوازم، سکھ ازم اور عیسائیت کے علاوہ کچھ اور مذاہب بھی ہیں، جن کے ماننے والے بھی ہیں، جیسے بدھ مت کے پیرو، یہودی اور پارسی وغیرہ۔ان مذاہب کی مقدس کتابیں ایسی قدیم زبانوں میں ملتی ہیں، جو ہمارے ملک کی عوامی زبانیں نہیں ہیں، جیسے عربی، عبرانی، سنسکرت وغیرہ۔ان تمام مذاہب کی مقدس کتابوں کے ترجمے اردو میں دستیاب ہیں۔

قرآن مجید کی زبان عربی ہے۔وہ علما جن کی مادری زبان اُردو ہے وہ عموماً عربی زبان سے بھی واقف ہوتے ہیں، اس لیے قرآن مجید کے بیشتر ترجمے راست عربی زبان ہی سے کئے گئے ہیں یہی بات حدیث اور فقہ کے تراجم پر بھی صادق آتی ہے۔سب سے پہلے ہم مذہبِ اسلام سے متعلق تراجم کا جائزہ لیں گے

14.3.1 قرآن مجید کے تراجم

شمالی ہندوستان کے مشہور و مستند عالمِ دین حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند مولانا شاہ رفیع الدین نے 1776ء میں سب سے پہلے قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا۔چوں کہ یہ ترجمہ لفظی تھا اس لیے اردو جملوں کی ساخت عربی جملوں کی ساخت اختیار کرتی گئی، جس کے سبب مفہوم تک رسائی مشکل سے ہو پاتی ہے۔اس ترجمے سے اتنا ضرور ہوا کہ عربی الفاظ کے معنی بیک نظر معلوم ہونے لگے، جیسے انہوں **ذالک الکتاب لاریب فیه** کا ترجمہ یوں کیا۔''یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے''

اس کے علاوہ یہ ترجمہ سلاست اور روانی سے یکسر عاری ہے۔

قرآن مجید کا دوسرا ترجمہ شاہ عبدالقادر کا ہے، جو شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ ترجمہ پہلے ترجمے کے کوئی نو سال بعد 1795ء میں ''مطبع احمدی دہلی'' سے شائع کیا گیا۔ اس ترجمے کی زبان نہایت آسان ہے۔ چنانچہ سورہ فاتحہ کا ترجمہ انہوں نے یوں کیا ہے۔

1) سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا
2) بہت مہربان : نہایت رحم والا
3) مالک انصاف کے دن کا
4) تجھی کو بندگی کریں گے اور تجھی سے مدد چاہیں گے
5) چلا ہم کو راہ سیدھی
6) راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا
7) نہ ان کی جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے

1776ء سے تا حال ہمیں قرآن مجید کے بے شمار تراجم ملتے ہیں۔ جن علماء نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یوں ہیں :

1. مولانا احتشام الدین مرادآبادی
2. مولانا انشاء اللہ خاں
3. مولانا ابوالکلام آزاد
4. مولانا احمد حسن ندوی
5. مولانا احمد سعید
6. مولانا امین احسن گیلانی (1994ء)
7. مولانا ابوالفضل احسان اللہ گورکھپوری
8. مولانا ابراہیم ابن سید مرزا ابوعلی خاں اصفہانی
9. مولانا احتشام الحق تھانوی
10. مولانا ابومحمد مصلح حیدرآبادی (1911ء)
11. مولانا ابراہیم بیگ (1934ء)
12. مولانا افضل محمد اسماعیل قادری (1952ء)
13. مولانا احمد شاہ یادری (1937ء)
14. مولانا احمد شجاع الایوبی
15. مولانا احمد علی لاہوری (1937ء)
16. مولانا احمد عبدالصمد فاروقی چشتی قادری (1968ء)
17. مولانا احمد حکیم نورالدین (1910ء)
18. مولانا احمدی حافظ روشن علی
19. مولانا احمدی عمر میاں معراج الدین
20. مولانا احمدی غلام حسن نیازی پشاوری (1939ء)
21. مولانا احمدی فخرالدین ملتانی (1919ء)
22. مولانا احمدی میر محمد اسحاق
23. مولانا ثناء اللہ امرتسری
24. مولانا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی
25. مولانا خواجہ حسن نظامی دہلوی
26. مولانا سرسید احمد خاں
27. مولانا سید امیر علی
28. مولانا شاہ مراد اللہ انصاری
29. مولانا شاہ مجددی
30. مولانا شمس پیرزادہ
31. مولانا شریف خاں
32. مولانا محمود حسن دیوبندی
33. مولانا محمد علی لاہوری
34. مولانا مرزا حیرت دہلوی
35. مولانا محمد جونا گڑھی
36. مولانا مودودی
37. مولانا عبدالباری فرنگی محلی
38. مولانا عبدالوائم جلالی
39. مولانا عبدالماجد دریابادی
40. مولانا عبدالباری حیدرآبادی
41. مولانا فیروزالدین
42. مولانا کرم شاہ ازہری بریلوی
43. مولانا وحیدالدین خاں
44. مولانا عبدالکریم پاریکھ
45. مولانا محمد ادریس کاندھلوی
46. مولانا عبدالحق دہلوی
47. مولانا فتح محمد جالندھری
48. مولانا محمد احسن
49. مولانا احمد رضا خاں
50. حیرت دہلوی

14.3.2 نمونۂ ترجمہ (سورۃ فاتحہ)

ذیل میں سورۃ فاتحہ کا ترجمہ بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم	ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی	مولانا فیروز الدین	قاری عبدالباری
الحمد للہ رب العالمین (۱)	ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو) تمام جہاں کا پروردگار ہے	سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہاں کا	تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں' جو پروردگار ہے سب جہانوں کا	ہر طرح کی تعریف اللہ کے لئے ہے' جو سارے جہان کا پروردگار ہے
الرحمن الرحیم (۲)	نہایت رحم والا' مہربان	بے حد مہربان' نہایت رحم والا	بڑا مہربان' نہایت رحم والا	بے حد مہربان' نہایت رحم والا
ملک یوم الدین (۳)	روز جزا کا حاکم	مالک روز جزا کا	مالک روز جزا کا	جزا و سزا کے دن کا مالک
ایاک نعبدو ایاک نستعین (۴)	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں	تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں	بارالہا ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں	(اے پروردگار) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔
اھدنا الصراط المستقیم (۵)	ہم کو (دین کا) سیدھا راستہ دکھا	بتلا ہم کو راہ سیدھی	دکھا ہم کو راستہ سیدھا	ہم کو سیدھا راستہ چلا
صراط الذین انعمت علیھم (۶)	ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اپنا) فضل کیا	راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا	راستہ ان کا کہ انعام کیا تو نے ان پر	ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اپنا فضل و کرم) کیا
غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین (۷) ع	نہ ان کا جن پر (تیرا) غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کا	نہ جن پر تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے	نہ ان لوگوں کا تیرا غضب ہوا جن پر اور گمراہوں کا	نہ ان لوگوں کا راستہ' جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہوئے

14.3.3 حدیث کی کتابوں کے اردو تراجم

مسلمانوں کے لیے قرآن اور سنت کی بڑی اہمیت ہے۔ سنت پر عمل کا مطلب ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپ کی بتائی ہوئی باتوں (احادیث) پر سختی سے عمل کرنا' کیوں خود اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ **ما اتاکم الرسول فخنوہ ومانھکم عنہ فانتھوا** (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کریں' اُس سے رک جاؤ)۔ ایک اور جگہ بہت ہی صراحت سے آنحضرت کی اطاعت کی تلقین کی گئی ہے: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جو آپ کی اطاعت کرتا ہے گویا وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے)

اس کے علاوہ قرآن کو صحیح معنی میں حدیث ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن فہمی کے لیے احادیث کا علم ناگزیر ہے۔ احادیث کو مختلف لوگوں نے جمع کیا ان کے بارے میں تصدیق و تحقیق کی اور انہیں کتابوں کی شکل دی۔ جن احادیث کی کتابوں کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا گیا ہے ان کی

تفصیل درج ذیل ہے۔

کتاب کا نام	مصنف کا نام	مترجم کا نام	وضاحت
1. بخاری شریف	ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل	مولانا عبدالحکیم شاہ اختر	
2. تفہیم البخاری	"	1. مولانا ظہور الباری اعظمی 2. مرزا حیرت علی بیگ	یہ بخاری شریف کا سلیس ترجمہ اور تفسیر ہے۔ یہ ترجمہ دس جلدوں پر محیط ہے۔
3. تفسیر الباری	"	علامہ وحید الزماں	صحیح بخاری کا ترجمہ اور تفسیر۔ یہ شرح آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے
4. صحیح بخاری شریف	"	1. مولانا محمد عادل صاحب اور 2. مولانا محمد فاضل صاحب	سلیس اور عام فہم۔ تین جلدیں۔ 2872 صفحات
5. صحیح مسلم	امام مسلم	مولانا نواب وحید الزماں	
6. تفہیم المسلم	"	مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	
7. سنن ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن ضحاک سلمی	مولانا سید نذیر الحق قادری	
8. جائزۃ الشعوذی	"	مولانا بدیع الزماں بن مسیح الزماں	ترمذی کا لفظی ترجمہ اور امام ترمذی کے اقوال کا ترجمہ
9. شمائل ترمذی	"	1. مولانا کرامت علی 2. شیخ الحدیث مولانا زکریا	انوار محمدی کے نام سے شمائل ترمذی کا ترجمہ کیا ہے خصائل نبوی کے نام سے شمائل ترمذی کا ترجمہ و شرح
10. سنن ابوداؤد	امام سلیمان الاشعث ابوداؤد سنجانی	مولانا وحید الزماں حیدر آبادی	یہ ترجمہ تین جلدوں پر مشتمل ہے
11. نسائی	امام نسائی	مولانا وحید الزماں حیدر آبادی	
12. سنن ابن ماجہ	محمد بن یزین بن ماجہ	علامہ بدیع الزماں و علامہ وحید الزماں	
13. مشکوۃ المصابیح	المصابیح ابومحمد بن مسعود الفراء البغوی	1 مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہجہاں پوری 2. مولانا مرزا حیرت علی دہلوی 3. مولانا محمد اسحاق صدیقی 4. مولانا مفتی یار خاں نعیمی اشرفی	اس میں چودہ کتابوں سے لی گئی حدیثوں کا ذخیرہ ہے یہ جدید اردو طرز تحریر میں با محاورہ ترجمہ ہے۔ مرأت المناجیح کے نام سے مشکوۃ المصابیح کا ترجمہ کیا ہے۔
14. ریاض الصالحین	مولانا محی الدین ابو زکریا	1. مولانا عبدالرسول 2. امتہ اللہ نسیم صاحبہ	
15. مشارق الانوار	امام صنعانی	مولانا خرم علی صاحب	
16. مؤطا مالک	امام مالک	1. علامہ وحید الزماں حیدر آبادی 2. اختر شاہجہاں پوری	
17. مؤطا محمد	امام محمد بن حسن صنعانی	حافظ نذیر احمد	

14.3.4 فقہ سے متعلق کتابوں کے اردو تراجم

آئے دن ہم اپنی سماجی زندگی سے متعلق متعدد مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور جب ان مسائل کی نوعیت سنگین ہوتی ہے تو ہمیں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا اٹھایا ہوا قدم کہیں مذہب کے بنائے گئے اصولوں کے خلاف تو نہیں۔ جب ذہن میں اس قسم کا خدشہ پیدا ہوتا ہے تو ہم عالموں سے رجوع کرتے ہیں یا ان مسائل کے حل کے لیے فقہ کی کتابوں کی مدد لیتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اجمالی طور پر ہر مسئلے کے بارے میں لکھا ہوتا ہے۔ علماء ان

ہی کتابوں کی روشنی میں فتویٰ بھی صادر کرتے ہیں جس کی رو سے نزاعی مسائل بخسن وخوبی حل کرلیے جاتے ہیں۔فقہ ایسے ہی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ فقہ کی کئی مستند کتابیں عربی میں لکھی گئی ہیں جن کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے، جو درج ذیل ہیں۔

کتاب کا نام	اردو میں ترجمے کے بعد کتاب کا نام	مترجم کا نام
1. مختصر قدوری	1) اشرف النوری	مولانا حفیظ صاحب
""	2) اصح النوری	مولانا محمد حنیف گنگوہی
2. ہدایہ	1) عین الہدایہ	مولانا سید امیر علی
""	2) اشرف الہدایہ	مولانا جمیل احمد
""	3) اشرف الہدایہ	مولانا محمد یوسف
3. شرح وقایہ	1) اشرف الوقایہ	مولانا عبدالحفیظ
""	2) نورالہدایہ	مولانا وحیدالزماں
4. درمختار	1) غایۃ الاوطار	مولانا خرم علی ومولانا محمد احسن صدیقی
""	2) کشف الاسرار	مولانا ظفیر الدین
5. فتاویٰ عالمگیری	1) فتاویٰ عالمگیری	مولانا احتشام الدین مرادآبادی
""	2) فتاویٰ عالمگیری	مولانا مفتی کفیل الرحمٰن
6. ہدایہ المجتہد	کتاب النکاح والطلاق	مولانا ساجد الرحمٰن صدیقی
7. فتاویٰ یوسف القرضاوی	فتاویٰ معاصرہ	مولانا سید زاہد اصغر فلاحی

اس کے علاوہ اردو تراجم میں تفسیر، سیرت، تاریخ اسلام، خلفاء کے خطوط، اخلاقیات وغیرہ کی کتابیں بھی اچھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں۔

14.3.5 ہندوؤں کی مذہبی ومقدس کتابوں کے اردو تراجم

ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں درج ذیل کتابیں اہم ہیں :

1. وید
2. مہابھارت
3. بھگوت گیتا اور
4. رامائن

1. وید

وید تمام ہندوؤں کے لیے ایک مشترک مقدس کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ زمانہ قدیم میں وید کی مناسبت سے ہندوازم کا نام ''ویدنکا دھرما'' تھا۔ وید کی زیادہ تر تحریریں منتروں کی شکل میں ہیں جن کو سادھو اور سنتوں نے وضع کیا ہے۔ منتروں کے تعلق سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ منتر کے شبد (الفاظ) اپنے اندر ایک غیر مرئی قوت رکھتے ہیں، اس لیے ان منتروں کے جاپ (ورد) سے ایک خاص کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے اور اسی خاص قوت سے انسان میں غیر معمولی روحانی قوت پیدا ہوتی ہے، جس سے وہ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے۔ وید کے چار حصے ہیں۔

i) سمہیتا : (س۔م۔ہ۔ت) اس حصے کو وید کے مرکزی حصے کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے یہ حصہ بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس میں منتر ہوتے ہیں۔

ii) براہمنا (ب۔ر۔ا۔ہ۔م۔ن) وید کا حصہ یہ بتاتا ہے کہ سمہیتا کے منتروں کو کس طرح کارگر طریقے سے استعمال کر کے اس سے روحانی شکتی

(قوت) حاصل کی جاسکتی ہے۔

iii) آرانیکا iv) اپنشد : ان دو حصوں میں زندگی، آتما (روح) پرماتما (خدا) اور ایسے ہی کئی موضوعات پر فلسفیانہ بحثیں ملتی ہیں اور ان میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ آتما کا پرماتما سے کیا رشتہ ہے۔ وید چار قسم کے ہیں جو درج ذیل ہیں :

1- رگ وید 2- سام وید 3- یجروید 4- اتھروید

ان چار ویدوں کے ترجمے اردو میں ہوئے ہیں۔ ان ویدوں کی تلخیص کا ترجمہ منشی کنہیالال نے ''الکھ پرکاش'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اسی طرح اپنشد کا ترجمہ سوریہ نرائن مہر دہلوی نے کیا ہے۔

2. مہابھارت

مہابھارت دراصل ایک ہی خاندان کے افراد کے درمیان مخاصمت اور جنگ و جدل کی کہانی ہے۔ یہ کئی چھوٹی چھوٹی پیچیدہ کہانیوں سے مل کر بنی ہے۔ جو فلسفہ، شانِ خداوندی، مہم جوئی، شجاعت و بہادری اور بے وفائی کے تانے بانے پر مبنی ہے۔ اس کے سبھی کرداروں کو خوبی سے ابھارا گیا ہے۔ چنانچہ ان کرداروں کی عظمت کی جھلکیاں ہندوستان کے فنون لطیفہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مہابھارت کے کئی اردو ترجمے ملتے ہیں۔

مہابھارت اور سمپورن مہابھارت کے ترجمے پنجابی پستک بھنڈار اور دیہاتی پستک بھنڈار، دہلی نے شائع کیے ہیں۔ اس کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

3. بھگوت گیتا

بھگوت گیتا کو مہابھارت کا ایک اہم حصہ (Episode) کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم دراصل ایک قسم کا طویل مکالمہ ہے، جو ارجن اور کرشن کے درمیان ہوتا ہے۔ ارجن راجا دھشٹر کے بھائی ہیں۔ کرشن بھگوان وشنو کے اوتار ہیں اور وہ ارجن کے رتھ کے ''سارتھی'' یعنی کوچوان ہیں۔ یہ سارا مکالمہ جنگ کے میدان میں ہوتا ہے جہاں کوروؤں اور پانڈوؤں کی فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے جارہی ہیں۔ اردو میں اس کے کئی ترجمے ہمیں ملتے ہیں۔ جیسے :

1.	دل کی گیتا۔	مترجم، خواجہ دل محمد (منظوم)
2.	نغمۂ الوہیت	مترجم، ڈاکٹر حسن الدین احمد
3.	بھگوت گیتا	مترجم، محمد اجمل خاں
4.	شری مد بھگوت گیتا المعروف بہ فلسفۂ الوہیت	مترجم، پنڈت جانکی ناتھ مدن
5.	بھگوت گیتا	مترجم، بھگوان داس بھارگو

4. رامائن

رامائن کا شمار پچھلے دو ہزار برسوں سے جنوبی ایشیا کی سب سے اہم اور دلچسپ کتابوں میں ہوتا ہے۔ اِس رزمیہ نظم نے ہندوستانی تہذیب کے کئی پہلوؤں کو متاثر کیا ہے اور اس کا اثر اب تک سیاست، مذہب اور تہذیب پر دیکھا جاسکتا ہے۔ رامائن کی کہانی، والد کی اطاعت، بھائی سے محبت، بیوی کا پیار اور جلاوطنی کی صعوبتوں سے عبارت ہے۔ رامائن کے اردو میں کئی ترجمے ہیں، جن میں منظوم بھی ہیں۔ رامائن کے ترجمے کے ذکر میں پنڈت برج نارائن چکبست کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ ان ہی کے کیے گئے ترجمے بعنوان کا ایک سین سے کچھ بند نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ رام چندر جی کو چودہ سال کے بن باس کا حکم ہوگیا۔ اس حکم کی تعمیل سے قبل اپنی ماں سے ملتے ہیں۔ اس منظر کو چکبست نے نظم کی صورت میں پیش کیا ہے :

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے' یہ ہے شدتِ ملال

تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو' بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

ان مقدس کتابوں کے علاوہ ہندو مذہب کے لٹریچر کے ترجمے بھی اردو میں ملتے ہیں جیسے سوامی وویکانند کی کتاب ''بھکتی اور ویدانت'' کا ترجمہ اردو میں شانتی نرائن نے کیا ہے۔ اسی طرح سے کبیر پنتھی' بھگتی' برہموسماج' دیوسماج' ویدسماج کے ترجمے بھی اردو میں کیے گئے ہیں۔

14.3.6 سکھ مذہب اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں کے تراجم

ہندوستان میں سکھ اور بدھ مت کے ماننے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہے۔ سکھ اور بدھ مت کے ماننے والوں میں اردو ادب کے قابل قلم کار بھی ہیں۔ جنہوں نے اپنی اپنی مذہبی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ جو نثر اور نظم دونوں میں ہے۔ سکھ مذہب کے بانی گرونانک دیو صاحب کے عارفانہ کلام کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح مخمور جالندھری نے گوپال سنگھ کی کتاب ''گرونانک دیو'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ سکھوں ہی کے ایک اور گرو' گرو گوبند سنگھ گزرے ہیں جنہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کے فارسی کلام ''ظفرنامے'' کا ترجمہ شیخ انور حسین نے کیا ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات پر ایک مبسوط کتاب ''دھم پدمہاتما'' لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں گوتم بدھ کے طریقۂ تعلیم پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا منظوم ترجمہ منور لکھنوی نے کیا ہے۔

14.3.7 انجیل کا اردو ترجمہ

یہ کہا جاتا ہے کہ کسی مقدس کتاب کے اگر سب سے زیادہ ترجمے ہوئے ہیں تو وہ عیسائیوں کی مقدس کتاب انجیل ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی

زبانوں کے بارے میں جمع شدہ اعداد و شمار کے لحاظ سے دنیا میں (6500) زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں سے انجیل کا ترجمہ دو ہزار تین سو پچپن (2355) زبانوں میں ہوا ہے۔ جن کی تفصیل یوں ہے :

ممالک	زبانوں کی تعداد
افریقہ	665
ایشیا	585
بحرالکاہل اور قریبی سمندروں کے جزیرے	414
جزائر غرب الہند اور لاطینی امریکہ	404
یورپ	209
شمالی امریکہ	78

دراصل انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اترا ہوا صحیفہ ہے، مگر عیسائی جو انجیل پڑھتے ہیں اس کے لکھنے والے چار مختلف لوگ ہیں۔

1. متی MATHEW
2. مرقس MARK
3. لوقا LUKE
4. یوحنا JOHN

انجیل کا سب سے پہلا اردو ترجمہ بنجمن شلٹز (Benjamin Schultze) نے ''انجیل مقدس'' کے نام سے کیا۔ شلٹز کا تعلق جرمنی سے تھا۔ اس نے اردو ترجمہ 1723ء میں شروع کیا تھا اور اس کی تکمیل 1748ء میں کی۔ اس کے بعد انجیل کے بے شمار اردو ترجمے ہوئے۔ اردو کے اکثر ترجمے یوحنا کی انجیل سے کیے گئے ہیں۔ ترجمے کا نمونہ انگریزی متن کے ساتھ درج ذیل ہے۔ یوحنا کی انجیل کے درج ذیل ترجمے کو پاکستان بائبل سوسائٹی نے 1992ء میں شائع کیا۔

1.1 *In the beginning was the word, and the word was with God, and the word was God.*

ترجمہ۔ ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔

1.2 *The same was in the beginning with God.*

یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا

1.3 *All things were made through Him, and without Him was not anything made that hath been made.*

سب چیزیں اُسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔

1.4 *In Him was life, and the life was light of men.*

اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھی۔

1.5 *And the light shineth in the darkness, and the darkness apprehended it not.*

اور نور تاریکی میں چمکتا ہے اور تاریکی نے اسے قبول نہیں کیا۔

1.6 *There came a man, sent from God, whose name was John.*

ایک آدمی یوحنا نام کا آموجود ہوا، جو خدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔

1.7 *The same came for witness, that he might bear witness of the light, that all might believe through him.*

یہ گواہی کے لیے آیا کہ نور کی گواہی دے تا کہ سب اس کے وسیلے سے ایمان لائیں۔

1.8 *He was not light, but came that he might bear witness of the light.*

وہ خود تو نور نہ تھا مگر نور کی گواہی دینے آیا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. قرآن کا اردو میں سب سے پہلے کس نے اور کب ترجمہ کیا؟
2. حدیث کی جملہ کتنی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں؟
3. فقہ کی جملہ کتنی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں؟
4. ویدوں کی کل تعداد کتنی ہے؟
5. مہابھارت، بھگوت گیتا اور رامائن کس مذہب کی کتابیں ہیں؟
6. دھم پد مہاتما کس مذہب کی کتاب ہے؟
7. انجیل کا سب سے پہلے اردو میں ترجمہ کس نے کیا؟

14.4 مذہبی تراجم کی اہمیت

دنیا کے بیشتر مذاہب بہت قدیم ہیں۔ان میں ہندو مذہب، بدھ مت، عیسائی اور اسلام مذاہب شامل ہیں اور ان مذاہب کی مقدس کتابیں ان کے دور کی رائج الوقت زبانوں میں ملتی ہیں۔جیسے :

وید: سنسکرت میں

انجیل: پہلے عبرانی اور آرامی زبان میں، بعد میں (Old Testament) یونانی میں اور (New Testament) لاطینی میں اور پھر انگریزی میں،

گوتم بدھ کے پیغامات: پالی میں

قرآن: عربی میں

جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے تہذیبیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور اسی طرح زبانیں بھی۔ان کی جگہ نئی تہذیبیں اور زبانیں لے لیتی ہیں۔ترجمہ مذہبی سرمائے کو ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں منتقل کرتا ہے۔اگر انجیل کا ترجمہ عبرانی اور آرامی زبان سے یونانی اور لاطینی زبان میں نہ کیا جاتا تو شاید ہم انجیل سے ناواقف ہوتے۔

فرض کیجیے قرآن کے ترجمے کا کام صرف قطب شاہی دور کی دکھنی زبان میں ہوتا تو آج اس ترجمے کی زبان کو سمجھنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا ملا وجہی کی تحریریں سمجھنے میں ہو رہی ہے۔جن کو شرح کی مدد کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔کسی زبان کے ارتقا کے مرحلے کسی منزل پر ساکت و جامد نہیں ہوتے بلکہ ان میں مسلسل و متواتر تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔اس لیے زبان کے ارتقا کے ہر دور کے لیے ہمیں ایک نئے ترجمے کی ضرورت پڑتی ہے۔چناں چہ مذہبی تراجم کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔قرآن کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔اتنے سارے ترجموں کی ضرورت محض زبان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے لاحق ہوئی۔کہا جاتا ہے کہ ہر سو سال بعد زبان بدلتی ہے اور یہ بات لسانی حقیقت پر مبنی ہے۔

مگر دنیا کی ساری زبانوں میں عربی زبان ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس زبان میں وسعت تو آئی ہے مگر کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔اس بات کو سمجھنے کے لیے قرآن کی زبان کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو زائد از چودہ سو سال قبل کی زبان ہے۔اتنی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس زبان

میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔اس حقیقت کو بہتر طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے :

فرض کیجیے قطب شاہی دور کا کوئی انسان ہم سے دکھنی میں بات کرے یا چاسر کے دور کا آدمی انگریزی میں ہم سے گفتگو کرے تو ہم اس کی زبان سمجھ نہیں پائیں گے اور اگر ہم اسے اپنی زبان میں مخاطب کریں تو شاید وہ یہ کہہ بیٹھے **زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم** ۔مگر چودہ سو سال قبل کا کوئی عرب باشندہ اگر آج کے دور کے عرب سے گفت وشنید کرے تو ان کا مکالمہ بحسن وخوبی آگے بڑھے گا اور وہ دونوں بلا کسی دقت کے گفتگو کا مزہ اسی طرح لیں گے جس طرح عام طور پر لیا جاتا ہے۔

14.4.1 ترجمہ برائے معلومات

آج کے دور میں دنیا سمٹ کر ایک عالمگیر گاؤں (Global Village) کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہے۔دنیا کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں پرنٹ میڈیا (Print Media) یعنی روزنامے، جرائد، رسالے، کتابیں اور الکٹرانک میڈیا (Electronic Media) یعنی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر نے نمایاں اور اہم حصہ ادا کیا ہے۔مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے لوگ ایک دوسرے کے مذاہب اور تہذیبوں سے آگہی ان ہی میڈیا کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ترجمہ ایک اہم رابطے کا کام انجام دے رہا ہے۔

14.4.2 ترجمہ برائے تبلیغ

ہر مذہب کے ماننے والے کا یہ ایقان ہوتا ہے کہ اس کا اپنا مذہب دیگر مذاہب کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور اچھا ہے اور وہ یہ سوچتا ہے کہ کسی انسان کی نجات اس کے اپنے مذہب کو اپنانے میں ہے۔لوگوں کو راہ راست پر لانے کا جذبہ ہی تبلیغ کا باعث بنتا ہے۔تبلیغ کے لیے ترجمہ ناگزیر ہے۔دنیا کئی خطوں میں منقسم ہے اور ہر ایک خطے میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں ان تک ہماری رسائی محض ترجمے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں جیسے قرآن اور انجیل کے ترجمے ہزاروں زبانوں میں ملتے ہیں۔اس لحاظ سے ترجمے کی اہمیت مسلم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کن دو مقاصد کے تحت مذہبی تراجم کیے جاتے ہیں؟

14.5 مذہبی تراجم کے مسائل

مذہبی تراجم کے مسائل ادبی تراجم کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ترجمہ ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں تبدیل کرتا ہے۔ترجمے کے اس عمل (Process) کو درج ذیل خاکے کی مدد سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

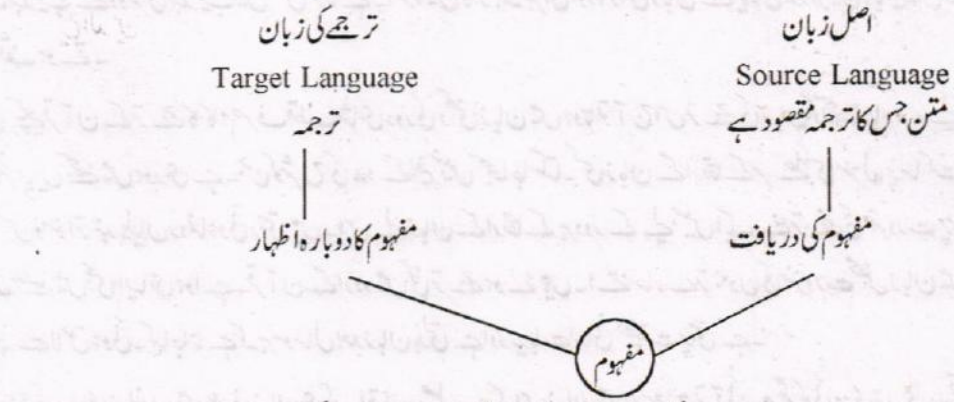

یوں سرسری جائزے سے ترجمے کا عمل بہت آسان لگتا ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ترجمہ نگار اس وقت تک ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس میں درج ذیل خوبیاں نہ ہوں :

1) اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور ہونا چاہیے۔

2) دونوں زبانوں کی لسانی خصوصیت سے واقفیت ہونی چاہیے۔

3) دونوں زبانوں کے خاندانوں اور معیاتی نظام میں فرق کرنے کا علم ہونا چاہیے۔

4) دونوں زبانوں کے تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر سے آگہی ہونی چاہیے۔

ادبی ترجمے ہی کی طرح مذہبی ترجمے کی سب سے بڑی دشواری مناسب الفاظ کا انتخاب ہے۔ اگر ترجمہ نگار مناسب لفظ اور اصطلاح سے صرفِ نظر کرتا ہے تو وہ بے شک ہدفِ تنقید بن جائے گا۔ مناسب الفاظ سے کیا مراد ہے، اس بات کو حسب ذیل مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ **ضالاً** کے عام معنی گمراہی اور بھٹکنے کے ہیں اس لفظ کا استعمال قرآن مجید کی ایک آیت میں ہوا ہے۔

ووجدک ضالاً فھدیٰ۔ پارہ 30۔ سورۃ الضحیٰ۔ آیت (7)

اس آیت کا ترجمہ مختلف ترجمہ نگاروں نے یوں کیا ہے :

مولانا شاہ عبدالقادر	۔	اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی
مولانا شاہ رفیع الدین	۔	اور پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا پس راہ دکھائی
مولانا عبدالماجد دریابادی	۔	آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتایا۔
ڈپٹی نذیر احمد	۔	اور تم کو دیکھا راہِ حق کی تلاش میں بھٹکے بھٹکے پھر رہے ہو تو تم کو دین اسلام کا سیدھا راستہ دکھایا۔
مولانا اشرف علی تھانوی	۔	اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو آپ کو شریعت کا راستہ بتلا دیا۔
مولانا احمد رضا خاں بریلوی	۔	اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔

اس آیت کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی شان مبارک میں عام لفظوں کا استعمال مثلاً ''بھٹکنا''۔ ''راہ بھولا ہوا ہونا''۔ ''بے خبر ہونا''۔ ''بھٹکے بھٹکے پھرنا'' زیب نہیں دیتا۔ **ضالاً** کے لیے ''خود رفتہ پانا'' ایک بہترین اظہار (Expression) ہے، جس میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ حد و ادب کی وہ منزل بھی ہے، جس میں بے انتہا عقیدت کا جذبہ بھی ہے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے :

ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین ۔ پارہ 9۔ سورۃ الانفال۔ آیت (30)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے :

مولانا شاہ عبدالقادر	۔	اور وہ بھی فریب کرتے تھے اور اللہ بھی فریب کرتا تھا اور اللہ کا فریب سب سے بہتر ہے۔
مولانا شاہ رفیع الدین	۔	اور مکر کرتے تھے وہ اور مکر کرتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نیک مکر کرنے والوں کا ہے۔
مولانا محمود الحسن دیوبندی	۔	وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔
مولوی ڈپٹی نذیر احمد	۔	اور حال یہ ہے کہ کافر اپنا داؤ کر رہے تھے اور اللہ اپنا داؤ کر رہا تھا اور اللہ سب داؤ کرنے والوں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے۔
مولانا اشرف علی تھانوی	۔	اور وہ تو اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ میاں اپنی تدبیر کر رہے تھے اور سب سے مستحکم تدبیر والا اللہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت میں مکر یا داؤ کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس لیے مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ سب ترجموں سے بہتر ہے، کیوں کہ انہوں نے ''مکر'' اور ''داؤ'' جیسے معمولی لفظوں سے اجتناب کر کے ان کی جگہ ''تدبیر'' کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذہبی ترجموں میں آداب و مراتب کو ملحوظ خاطر رکھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا چاہیے ورنہ ترجمے کی عظمت داؤ پر لگ جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مذہبی تراجم کرتے وقت مترجم کو کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے؟

14.6 خلاصہ

اس اکائی میں اردو میں مذہبی تراجم کی روایت واہمیت اور مسائل سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اردو میں مذہبی تراجم کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی اردو کی عمر ہے۔ اردو کے سب سے پہلے مذہبی ترجمے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ پھر ان تراجم پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا تعلق ہندو مذہب اور عیسائی مذہب سے ہے۔ اور ہر مذہب کی مقدس کتابوں کے ترجمے بطور نمونے دیے گئے ہیں۔ آخر میں مذہبی ترجموں کی اہمیت اور مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح مناسب لفظوں کا استعمال اور حفظِ مراتب کا خیال مذہبی ترجموں کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔

14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. مذہبی تراجم کی روایت پر نوٹ لکھیے۔
2. مذہبی مواد کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟
3. تفسیر، حدیث اور فقہ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابیں کون سی ہیں اور یہ کس زبان میں ہیں؟
2. عام اور مذہبی ترجمے کے فرق پر روشنی ڈالیے۔
3. مذہبی ترجمے کی کیا اہمیت ہے؟

14.8 فرہنگ

ادق	=	نہایت مشکل، نہایت باریک	وثوق	=	مضبوطی، اعتبار، اعتماد، بھروسہ
مِن وعَن	=	حرف بحرف۔ مفصل۔ واضح	قالب	=	سانچا، ڈھانچہ
غایت	=	غرض، مطلب	درک	=	عقل، سمجھ، تمیز، واقفیت
عاری	=	قاصر، مجبور	تلقین	=	تعلیم دینا، ہدایت
نزاع	=	جھگڑا، فساد، تکرار	رزمیہ نظم	=	وہ نظم جس میں جنگ کو موضوع بنایا گیا ہو
ایقان	=	یقین ہونا			

14.9 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر محمد حمید اللہ — خطبات بہاولپور
2. المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد (ترتیب) — اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ
3. ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل — بخاری شریف
4. سید احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ
5. ڈاکٹر خلیق انجم — فن ترجمہ نگاری

اکائی 15 : انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ۔ چند مثالیں

ساخت

15.1 تمہید

15.2 سُدھامورتی کی ایک کہانی : On Human Foibles

15.3 On Human Foibles کا ترجمہ: ''بشری خامیاں''

15.4 Great Poet Mirza Ghalib کے زیرعنوان غالب کی سوانح عمری کا ایک حصہ

15.5 Great Poet Mirza Ghalib کا ترجمہ : ''عظیم شاعر مرزا غالب''

15.6 Philosophy, Education and Their Inter-Dependence
بی۔ایڈ کی کتاب Education and Society کی اکائی 3 کا ایک حصہ

15.7 Philosophy, Education and Their Inter-Dependence کا ترجمہ : ''فلسفہ، تعلیم اور ان کا باہمی انحصار''

15.8 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کا انگریزی میں صحافتی بیان : "Let's Fight Terror Together"

15.9 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے صحافتی بیان کا ترجمہ

15.10 मौलाना मुहम्मद अमीन : تزکِ جہانگیری کے ہندی ترجمے کا ایک حصہ

15.11 ''مولانا محمد امین'' کے زیرعنوان ہندی متن کا ترجمہ

15.12 خلاصہ

15.13 نمونہ امتحانی سوالات

15.14 فرہنگ

15.1 تمہید

ایک بہت اہم بات ذہن نشین کرنے کی یہ ہے کہ نظریے کے بغیر عمل بے بنیاد ہوتا ہے اور عمل کے بغیر نظریہ لایعنی ہوتا ہے۔ اس فہم کے پیش نظر زیر نظر کتاب کی پچھلی 14 اکائیوں میں ترجمے کے فن کے مختلف پہلوؤں سے نظری بحث کی گئی ہے اور اکائی نمبر 15 میں انگریزی متن کے چار مختلف قسم کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندی متن کا ایک نمونہ دیا گیا ہے۔ جن کے اردو میں ترجمے کیے گئے ہیں۔ آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ زیر نظر کتاب کی پچھلی اکائیوں میں ترجمے کے فن کے مختلف پہلوؤں سے جو نظری بحث کی گئی ہے اس کی روشنی میں نمونے کے ترجموں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ان کا متعدد بار غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اندر سوئے ہوئے مترجم کو جگانے کی کوشش کریں گے نیز نمونے کے ترجموں کی طرز پر مختلف قسم کے موضوع و مواد کے ترجمے کی مشق کرنے کی کوشش کریں گے اور ایک معیاری مترجم بننے کی کوشش میں آپ کی کامیابی ہی میں زیر نظر کتاب کی کامیابی مضمر ہے اس کے ساتھ ہی اطلاعاً یہ عرض ہے کہ سالانہ امتحان میں انگریزی اور ہندی کے اقتباسات اردو میں ترجمے کے لیے دیے جاسکتے ہیں۔

ایک اچھا مترجم بننا نہایت مشکل کام ہے' تاہم ہر مشکل کام میں کامیابی از خود عظیم طمانیت اور معاوضہ ہے۔ ایک اچھا مترجم بننے کا مطلب دو زبانوں پر عبور' دو تہذیبوں پر عبور' دو نثری اور شعری روایتوں پر عبور اور اپنی سرشت میں اصل زبان و مواد' تہذیب اور نثری و شعری روایت کو تحلیل کر کے خمیر اٹھانا اور باز تخلیق کرنا ہے۔ ایک معیاری اور مخلص مترجم کو کسی بھی فن پارے یا تصنیف کا کم از کم تین مرتبہ غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔ پہلی مرتبہ شروع سے آخر تک زیر نظر متن کا غائر مطالعہ کرے۔ دوسری مرتبہ غائر مطالعہ کرتا جائے اور مشکل الفاظ کو نشان زد کرتا جائے۔ تیسری مرتبہ غائر مطالعہ کرتے وقت نشان زد کیے گئے مشکل الفاظ کے لغت میں دیے گئے تمام مترادفات کو حاشیے میں درج کرتا جائے۔ بالکل آخر میں غائر مطالعہ کرتے وقت اس بات کا تعین کرتا جائے کہ کون سا معنی موزوں ترین ہے۔ اس کے بعد بسم اللہ کرے۔ زیر نظر اکائی کے تمام حصوں کا ترجمہ متذکرہ بالا باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔

15.2 سُدھا مورتی کی ایک کہانی : On Human Foibles

Many years ago, I was working as a Chief System Analyst. The job involved a lot of travelling for project work, sometimes to a small village, sometimes to a neighbouring city. Often, work compelled me to travel on holidays too.

One particular Friday, I was looking forward to a long weekend. The coming Monday was a holiday for some festival and taking advantage of the long weakend, we sisters had decided to meet at our grandmother's house in our native Shiggaon.

I was waiting for Friday to end. Sunday was a full-moon night and so a special moonlight dinner had been arranged for us. Moonlight dinners are favourite family occasions for the people of north Karnataka. We were all in a hurry to wind up for the day when I heard someone calling out, "Kulkarni! Can you come to my office."

My heart sank. It was my boss (calling me by my maiden name), and judging by his tone, the matter was urgent. Even though I was on my way out of the office, I stopped to enquire what he wanted.

"Sorry for disturbing you, but your service is required urgently," he said, handing over a letter for me to read. It said that I had to visit a project site within the next two days.

"No problem at all, sir, I shall attend to it," I said. I was used to working throughout the day and throughout the week, so cancelling my travel plans didn't bother met at all. My work gave me more happiness than any celebration or outing.

The next morning, I left for the town where the project was based. By the time I reached the town it was already noon, but it looked as though the day had just begun there. It was a small town. The shops were just opening and folks were setting our to work.

As I was walking from the bus stand, a young lad hurried towards me and said, "Sorry, I am late, ma'am. I was supposed to receive you at the bus stop." He was our client's representative and had come to take me to their office.

We reached the office after a few minutes' walk. It was a small office. Though by no means modern, it was neatly furnished with some old but reconditioned furniture, everything in its right place. They were all waiting for me and I felt nice as I sat down. The cool buttermilk they offered me was most refreshing.

Before beginning my work, I was introduced to a neatly dressed young man who was supposed to coordinate with me. He was quite well-mannered and seemed very confident and bright. I was pleasantly surprised to see the good quality of his work. It had a professional touch. I was told that he was the most well-read man in that town.

He had documented his work very well and efficiently. Because of this, our job was completed sooner than expected. I did not forget to compliment him when I was about to leave. He went pink at my appreciation and insisted that I join him for tea at his residence close by.

His house was also well kept. By tea-time, his conversation had taken on a personal note. He talked about his parents, his early job. He introduced his wife and two-year-old son. He spoke with admiration about his wife's cooking, her beautiful voice, her achievements during her school days. Then he called for his son who immediately came in and stood by my side with folded arms, almost as if he was trained to do so. The moment the father asked him to recite a rhyme, he started to do so in his clear, childish voice.

I acknowledged his recitation by nodding my head. The father did not seem satisfied with such nominal recognition of his son's talents. He asked the child to identify all the letters of the alphabet from an old chart hanging on the wall. These are things that children usually hate to do, yet parents go on forcing them. Poor kids!

The display in my host's house went on for nearly half an hour until the child began displaying signs of restlessness and irritability. The mother, wisely, took the child away to the kitchen, hopefully to reward him with a chocolate or a biscuit.

I realized that the father was expecting to hear some compliment from me about his son. "Your child is very bright for his age," I said.

"Naturally! I have trained him like that from childhood, " he said with pride. It sounded like he had been training his two-year-old child from the day of his birth!

"So you feel that it is only by training that a child can become bright like this?" I asked.

"No, no. heredity and genes also play an important role. My son has taken after me." The man's face shone with pride and I was curious to hear more. After all, I had an hour to spare before my bus departed.

"You must have been a good student in your college days?" I probed.

"Yes, I was. I have always been a first ranker in my school and college days," he replied, clearly appreciative of himself.

"Where did you graduate from?" I was eager to hear more.

"I graduated from BVB Engineering College, Hubli."

I became alert. I knew Hubli. I knew the college. "Which year?" I asked.

"In 1972, with the first rank."

"Did you secure the gold medal also?" I persisted.

"Yes, I did obtain the gold medal for that year," he said glowing with self-satisfaction.

"By this time I was able to size him up quite clearly. And what I saw saddened me.

"May I see your gold medal?" I requested.

Suddenly, the mood in the room changed. "Why? Don't you believe me?" His voice was uncertain.

"No, I just want to see the gold medal you secured in 1972," I repeated.

"It is very precious to me and so I have kept it in a bank locker," he said.

I did not give up. "Which bank?"

"Why should I give you such details?" he demanded, annoyed with my persistence.

Everything was clear by now. I think it was clear to him too. The warmth of hospitality was over. It was time for my bus and time for me to go.

While walking towards the door, I told him, "I don't have to know any of the details about your bank or gold medal. It is none of my business. But I am sure that the medal connot be with you."

"How can you say that? And that too so confidently?" He was quite angry by now.

"Because," I told him sadly, "I secured that gold medal in 1972 and only one gold medal is awarded each year."

He was stunned by this revelation and stared blankly at me. I looked at him and asked gently, "You are bright. You are good in your job. Why do you have to lie? What do you gain?"

The click of the front door shutting behind me was the only reply I received.

(A story from the book "Wise and other Wise" written by Suda Murty)

Check Your Progress

1. Did Kulkarni choose partying or work?
2. What were personal qualities in the host of Kulkarni?

15.3 On Human Foibles کا ترجمہ: ''بشری خامیاں''

برسوں پہلے، میں بطور چیف سسٹم انالسٹ کے کام کر رہی تھی۔ اس ملازمت میں، پروجیکٹ کے کام کے لیے اچھی خاصی مسافت شامل تھی، کبھی ایک چھوٹے گاؤں کا، تو کبھی پڑوس کے شہر کا سفر کرنا پڑتا۔ اکثر کام کا دباؤ چھٹیوں میں بھی سفر کرنے کے لیے مجبور کرتا۔

جمعے کے روز ایک لمبے اختتام ہفتہ (Weekend) کے لیے میں تیار ہو رہی تھی۔ آنے والے دوشنبہ کے دن کسی تہوار کی چھٹی تھی۔ اور لمبے اختتامِ ہفتہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بہنوں نے اپنے آبائی وطن شیگاؤں میں اپنی دادی کے گھر پر ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جمعے کے دن کے اختتام کا میں انتظار کر رہی تھی۔ اتوار پورے چاند کی رات تھی اور اس لیے چاند کی روشنی میں ہمارے لیے ایک خصوصی عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چاند کی روشنی میں عشائیے کا اہتمام شمالی کرناٹک میں اہل خانہ کے اکٹھا ہونے کا پسندیدہ موقع ہوتا ہے۔ ہم لوگ دن کا کام جلدی جلدی ختم کر ہی رہے تھے کہ میں نے سنا کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ ''کلکرنی! کیا آپ میرے دفتر میں آ سکتی ہیں۔''

میرا دل ڈوب گیا۔ یہ میرے آجر (Employer) تھے، جو میرے کنوارے نام سے مجھے بلا رہے تھے اور ان کے لہجے کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ معاملہ فوری توجہ کا متقاضی تھا۔ حالانکہ میں آفس سے باہر نکل رہی تھی لیکن میں رک گئی یہ پتا لگانے کے لیے کہ وہ کیا چاہتے تھے۔

''معاف کرنا تمہیں پریشان کر رہا ہوں لیکن تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے'' ایک خط پڑھنے کے لیے میرے حوالے کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آئندہ دو دنوں کے اندر اندر مجھے ایک پروجیکٹ کے جائے وقوع کو دیکھنے جانا تھا۔

''بالکل کوئی مسئلہ نہیں، حضور والا، میں کروں گی'' میں نے کہا۔ میں پورے دن اور پورے ہفتے کام کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لیے اپنے سفر کے منصوبے کو رد کرنے سے مجھے قطعاً کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ مجھے کسی جشن یا گھر کے باہر تفریحی پروگرام کے مقابلے میں اپنے کام سے زیادہ خوشی میسر ہوتی تھی۔

اگلی صبح، میں اس قصبے کے لیے روانہ ہوگئی، جہاں یہ پروجیکٹ واقع تھا۔ جس وقت میں قصبے میں پہنچی دوپہر ہو چکی تھی، لیکن ایسا لگا کہ جیسے دن ابھی شروع ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ دوکانیں ابھی کھل رہی تھیں اور عوام الناس اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔

بس اسٹینڈ سے میں پیدل چل رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکا میری طرف جلدی سے بڑھا اور کہا۔ ''معاف کیجیے گا مادام مجھ سے تاخیر ہوگئی۔ مجھے بس اسٹاپ پر ہی آپ کا استقبال کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ہمارے گاہک کا نمائندہ تھا اور مجھے اپنے دفتر لے جانے کے لیے آیا تھا۔

کچھ منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم دفتر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا آفس تھا۔ حالانکہ کسی بھی طرف سے ماڈرن نہیں تھا لیکن یہ کچھ پرانے تاہم مرمت کیے ہوئے فرنیچر سے باقاعدگی کے ساتھ آراستہ تھا۔ ہر چیز اپنی صحیح جگہ پر رکھی تھی۔ دفتر کے سبھی لوگ میرا انتظار کر رہے تھے اور وہاں بیٹھتے ہوئے مجھے بڑا بھلا لگا۔ ٹھنڈی لسی جوان لوگوں نے مجھے پیش کی فرحت بخش تھی۔

قبل اس کے کہ میں اپنا کام شروع کروں میرا تعارف صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان سے کرایا گیا جسے میرے ساتھ موثر عمل کے لیے باہم رابطے کا کام کرنا تھا۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا اور بہت پراعتماد اور ذہین لگا۔ اس کے معیاری کام کو دیکھ کر مجھے خوش گوار تعجب ہوا۔ اس کے کام میں پیشہ وارنہ مہارت کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس قصبے میں وہ سب سے زیادہ وسیع المطالعہ آدمی تھا۔

اس نے اپنے کام کی دستاویز بڑی مہارت سے تیار کی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارا کام توقع کے برخلاف جلدی ختم ہوگیا۔ جب میں الوداع کہنے والی تھی تو اس کی تعریف کرنا نہیں بھولی۔ میری تعریف پر وہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے زور دیا کہ میں نزدیک ہی اس کے گھر پر اس کے ساتھ چائے نوش کروں۔

اس کا گھر بھی اچھی حالت میں تھا۔ چائے کے وقت تک اس کی گفتگو ذاتی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ اس نے اپنے والدین اور اپنی شروع کی نوکری کے بارے میں بات چیت کی۔ اس نے اپنی شریک حیات اور دو سال کے بیٹے کا تعارف کرایا۔ اس نے اپنی بیوی کے اسکول کے دنوں کی کامیابیوں، اس کی دل کش آواز اور کھانا پکانے کی مہارت کے لیے تعریفی انداز میں بات کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے کو بلایا جو فوراً اندر آیا اور اپنی بانہوں کو سینے پر باندھ کر میرے بازو میں ایسے کھڑا ہوگیا جیسے اسی طرح کی تربیت دی گئی ہو۔ جوں ہی اس کے باپ نے اس سے نظم سنانے کے لیے کہا اس نے اپنی صاف اور بچکانی آواز میں سنانا شروع کر دیا۔ میں نے اپنا سر ہلا کر اس کی نظم سرائی کا اعتراف کیا۔ باپ اپنے بیٹے کی صلاحیت کے برائے نام اعتراف سے مطمئن نہیں لگا۔ اس نے دیوار سے لٹک رہے پرانے جدول سے تہجی کے تمام حروف کو پہچاننے کے لیے بچے سے کہا۔ یہی چیزیں ہیں جنہیں کرنا بچے عام طور پر سخت ناپسند کرتے ہیں پھر بھی والدین انہیں مجبور کرتے رہتے ہیں۔ لاچار بچے!

میرے میزبان کے گھر میں یہ مظاہرہ تقریباً آدھے گھنٹے تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ بچہ بے چینی اور چڑھ کے آثار ظاہر کرنے لگا۔ ماں ہوشیاری سے بچے کو شاید چوکلیٹ یا بسکٹ بطور انعام دینے کے لیے باورچی خانے کی طرف لے گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ باپ اپنے بچے کے بارے میں مجھ سے کچھ تعریف سننے کی توقع کر رہا تھا۔ ''آپ کا بچہ اپنی عمر کے اعتبار سے کافی ذہین ہے۔'' میں نے کہا۔

''بیشک! میں نے اس کی تربیت بچپن ہی سے اس نہج پر کی ہے۔'' اس نے فخریہ کہا۔ ایسا لگا کہ اس نے اپنے دو سال کے بچے کی تربیت اس کی پیدائش کے دن سے ہی شروع کر دی تھی۔''

''کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ صرف تربیت ہی سے بچے ذہین ہو سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''قطعی نہیں۔ موروثی خصوصیات اور نسبے (Genes) بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ میرا بیٹا مجھ سے مشابہ ہے۔'' اس آدمی کا چہرہ فخر سے چمک اٹھا اور میں مزید سننے کے لیے خواہش مند تھی۔ کیوں کہ میری بس چھوٹنے میں ایک گھنٹے کا وقت تھا۔

''آپ اپنے کالج کے دنوں میں یقیناً اچھے طالب علم رہے ہوں گے؟'' میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں' میں تھا۔ میں نے اپنے اسکول اور کالج کے دنوں میں ہمیشہ پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔'' اس نے جواب دیا' ظاہری بات ہے۔ اس میں اس کی تعریف مضمر تھی۔

''آپ نے ڈگری کہاں سے حاصل کی؟'' میں مزید سننے کی خواہش مند تھی۔''

''میں نے بی وی بی انجینئرنگ کالج ہبلی سے ڈگری حاصل کی۔''

میں چونکی۔ میں ہبلی کو جانتی تھی۔ کالج کو جانتی تھی۔

''کس سال؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی پوزیشن کے ساتھ میں نے 1972 میں ڈگری حاصل کی۔'' کیا آپ نے سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا؟ میں ڈٹی رہی۔

''ہاں' میں نے اس سال کا سونے کا تمغہ بھی حاصل کیا' خود اعتمادی سے تمتماتے ہوئے اس نے کہا۔

اب میں اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں تھی اور جو میں نے دیکھا اس سے میں دکھی ہوئی۔

''کیا میں آپ کا سونے کا تمغہ دیکھ سکتی ہوں؟'' میں نے گزارش کی۔ اچانک کمرے کا ماحول بدل گیا۔ ''کیوں؟ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟'' اس کی آواز غیر یقینی تھی۔

''نہیں۔ میں صرف اس سونے کے تمغے کو دیکھنی چاہتی ہوں جسے آپ نے 1972 میں حاصل کیا تھا۔'' میں نے دہرایا۔

''یہ میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے اور اس لیے میں نے اسے بینک لاکر میں رکھ دیا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے ہار نہیں مانی۔ ''کس بینک میں؟''

''یہ ساری تفصیل میں آپ کو کیوں دوں؟'' اس نے مطالبے کیا' میرے اصرار سے وہ پریشان تھا۔

اب ساری چیزیں واضح ہو چکی تھیں۔ میں سمجھتی ہوں یہ اس پر بھی واضح ہو چکا تھا۔ میزبانی کا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا۔ میری بس کا وقت ختم ہو چکا تھا اور میرے جانے کا بھی وقت ہو چکا تھا۔

دروازے کی طرف چلتے وقت میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے آپ کے بینک یا سونے کے تمغے کے بارے میں کسی تفصیل کو نہیں جاننا ہے۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تمغہ آپ کے پاس نہیں ہو سکتا۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟ اور وہ بھی اتنی خود اعتمادی کے ساتھ؟'' وہ اب بالکل ناراض تھا۔

''کیوں کہ' میں نے اس سے دکھی ہو کر کہا۔ ''1972 میں اس سونے کے تمغے کو میں نے حاصل کیا تھا اور ہر سال صرف ایک سونے کا تمغہ بطور انعام دیا جاتا ہے۔''

اس انکشاف سے وہ دم بخود رہ گیا اور خالی خالی آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور ملائمت سے کہا۔ ''تم ذہین ہو تم

اپنے کام میں اچھے ہو۔تم جھوٹ کیوں بولتے ہو؟اس سے تمہیں کیا حاصل ہے؟"

میرے پیچھے صدر دروازے کے بند ہونے کی آواز ہی واحد جواب تھا جو مجھے ملا۔

(مذکورہ بالا انگریزی کہانی کا "بشری خامیاں" کے عنوان سے ترجمہ)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. 1972ء میں طلائی تمغہ کسے ملا تھا؟
2. اس کہانی سے آپ نے کیا سبق سیکھا؟
3. کیا ادبی ترجمے پر بامحاورہ ترجمے کی تکنیک کا اطلاق ہوتا ہے؟

15.4 Great Poet Mirza Ghalib کے زیرعنوان غالب کی سوانح عمری کا ایک حصہ

Ghalib is universally acknowledged to be one of the giants of Indian literature and can truly be considered as precursor of Indian renaissance. His poetry depicts the best, the most serene and the most exalted emotions of the humanity in general. It also creates a human characters which have the courage of conviction to stand up to society, the powers that be and above all the God.

Mirza Ghalib was born on 27th December, 1797 in a prosperous family of Akbarabad (Agra). During the reign of Shah Alam, his grandfather was granted the area of Pehnasu as Jagir. His maternal grandfather was having several villages in his Jagir. His father Mirza Abdullah Baig Khan was a swordsman par excellence. For a long time, he served under the rulers of Lucknow and Hyderabad and later he joined the army of Bakhtawar Singh, the Raja of Alwar and was killed in a battle while fighting for him. Mirza Abdullah Baig Khan had two sons, Mirza Asadullah Khan and Mirza Yusfu Khan and a daughter, Chhoti Khanam.

Mirza Asadullah Khan (later known as 'Ghalib') was the eldest. When Ghalib was of five, his father left for heavenly abode. So his uncle, Mirza Naseerullah Baig, the Subedar of Agra took him under his care. Unfortunately, his uncle also died, when Ghalib was nine years old. Thus, he was sent to his maternal grandfather's house who owned substantial property in Agra. In recognition of meritorious, services, rendered by late Mirza Naseerullah Baig, his heirs were awarded pension from the government in which Ghalib's share was seven hundred rupees annually. This pension was stopped after the Sepoy Mutiny of 1857.

At the age of thirteen, Ghalib was married to Umrao Jan Begum, the daughter of a Nawab of Delhi, named Illahi Bakhsh Khan 'Maroof". After his marriage, Ghalib settled in Delhi permanently and was popularly known as 'Mirza Naushah'. Legend has it that he was one of the most handsome youth of Delhi of his time.

Traditionally, Ghalib belonged to a family of warriors, but he earned his name and fame through his writings. He had a flair for poetry since his childhood and started writing poems when he was barely tweleve years old. In the beginning, he followed the

poetic style of 'Bedil'. He himself writes, since the age of fifteen, I have been writing prose and poetry just the way the angel and devil note over deeds and misdeeds (Letter to Qadar Bilgrami). At another place, he writes "I started writing at the age of fifteen and wrote whatever came to my mind upto the age of twenty-five. In ten years it piled up to a collection. Finally when realization dawned upon me, I threw away may entire writings except for ten or fifteen couplets to retain as a specimen of my early writings for the present collection" (Letter to Abdur Razzaq 'Shakir'.)

Though Ghalib came to Delhi from Akbarabad but had no permanent source of income except the government pension. In a sense, this income was sufficient for any person with moderate living standard but his aristocratic way of life found it insufficient. It was very difficult for him to change his extravagant way of life. To add to this, his wife also belonged to a benevolent Nawab family like that of Ilahi Bakhsh. Thus, it was very natural, his pension was grossly inadequate to meet their ends. His younger brother, who came with him to Delhi and was very dear to him suffered bouts of insanity and Ghalib had to bear the burden of responsibilities as well.

While struggling with the complexities of proverbial poverty trap, Ghalib was told that he was not getting the full pension from the government, which was rightfully his. So, he went to Calcutta to file a suit regarding his pension and stayed there for two years. But his efforts bore no fruits.

An often quoted incident bears testimony to his characteristic egoistic nature, his self-esteem and the feudal etiquette, which was so dear to him. It is said that on hearing about Ghalib's intellectual capabilities and his legendary command over Persian language, James Thomson, Secretary to British government at that time decided to appoint him as a teacher of Persian in Delhi College. He invited Ghalib at his residence for this appointment. Ghalib went to his bungalow in a Palki and sent the message about his arrival. Thomson immediately sent the word to let him in. But Ghalib remained at the gate in a hope that Saheb himself would come to receive him personally. Knowing the situation, James Thomson came out and explained that a Ghalib had come there for a job, the protocol of the Governor's Durbar did not apply to him. Ghalib said that he was under the impression that the government's job would add to his stature, but it was contrary to his expectations. Thomson argued that he was bound by the procedures. To which Ghalib replied that in this case, he must be excused from this service. By saying this, he turned down the lucrative job of one hundred rupees per month.

Mirza Ghalib lived in an epoch, which was full of strife and political uncertainties. British influence was systematically increasing and the great Mugal power was on the verge of imminent collapse.

The last Mughal emperor, Bahadur Shah Zafar was a leading poet and patron of art and literature. He entrusted Mirza Ghalib upon the responsibility of writing the history of Mughal dynasty and gave him tiltles of 'Najmuddaulah', 'Debeerul Mulk' and 'Nizam-e-Jung' and also fixed a monthly stipend for him. The first volume of this history

entitled, 'Mehr-e-Neemroz' was published in 1857. In the same year, famous poet Sheikh Ibrahim 'Zauq' who was the emperor's mentor for his poetry and was known as 'Ustad-e-Sheh (King's teacher) died. After his death, this position was also awarded to Ghalib. But the second volume of this history for which Ghalib had proposed the name, 'Mah-e-Neem Mah' could not be written due to the changing political scenario. And then the simmering revolution of 1857 erupted, during which the world famous city of Delhi became 'deceased Delhi' in the words of 'Hali'. Ghalib was then at sixty.

The resulting chaos in the aftermath of the struggle of 1857 posed repeated tragic losses to Ghalib, like the stipend from Durbar of Bahadur Shah Zafar was stopped, his pension stopped due to his closeness with the emperor. So he had to bear the brunt of unending poverty and the horror of a bleak future ahead. His miseries were compounded, when there was massacre and bloodbath everywhere after conquest of Delhi by the rampaging British troops. His wife's ornaments and other family valuables were buried in a safe place that after normalcy these could be retrieved. But the victorious sepoys found the treasure and took away everything.

During this interregnum his younger brother Mirza Yusuf died and the grief-stricken Ghalib could not even attend the funeral due to the incessant bloodbath in the city. In the ensuing chaos and anarchy his only sister's eldest son, Mirza Ashoor Baig with his son adolescent grandson became targets of an English man's bullets. Most of his friends and relatives were killed, some were hanged and others followed in the mass exodus. None were left to share his grief and sorrow.

(A part from brief biography entitled "Great poet Mirza Ghalib" published on the occasion of 200th Birth Anniversary)

Check Your Progress

1. What kind of familial background Ghalib had?
2. Was the age of Ghalib full of strife and political uncertainties?

15.5 Great Poet Mirza Ghalib کا ترجمہ : ''عظیم شاعر مرزا غالب''

مرزا غالب کا شمار بلاشبہ ہندوستانی ادب کی عظیم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم انہیں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا نقیب تصور کر سکتے ہیں۔ غالب کا فن نہ صرف یہ کہ بہترین جمالیاتی اقدار کا حامل ہے بلکہ وجدآ گیں صوفیانہ احساسات اور عظیم ترین انسانی جذبوں کا امین بھی ہے ساتھ ہی ساتھ فکرِ غالب ایک ایسے انسانی پیکر کی تخلیق کرتی ہے جس کے اندر نہ صرف سماجی وسیاسی نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے بلکہ خدائی معاملات پر بھی بے باکانہ نظر ڈالنے کا حوصلہ ہے۔

مرزا غالب کی ولادت 27 دسمبر 1797 کو اکبر آباد (آگرہ) کے ایک خوشحال خاندان میں ہوئی۔ ان کے دادا کو شاہ عالم کے زمانے میں پہناسو کا علاقہ جاگیر میں ملا تھا۔ نانا کی جاگیر میں بھی متعدد دیہات تھے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں' صاحب سیف تھے۔ وہ ایک عرصے تک لکھنؤ اور حیدرآباد کی سرکاروں سے متعلق رہنے کے بعد الور کے راجہ بختاور سنگھ کے پاس آ گئے اور ان کی طرف سے ایک جنگ میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ خان کے دو بیٹے (مرزا اسداللہ خان اور مرزا یوسف خان) اور ایک بیٹی (چھوٹی خانم) تھی۔

مرزا غالب بڑے بیٹے تھے۔ والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف پانچ سال تھی لہٰذا ان کی پرورش کی ذمے داری مرزا نصر اللہ بیگ نے قبول کی، جو ان کے حقیقی چچا تھے اور اکبر آباد کے صوبے دار تھے۔ ابھی غالب نو ہی برس کے تھے کہ چچا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اور وہ اپنی ننھیال میں آ گئے۔ ان کے نانا کی آگرہ میں بھی بڑی املاک تھی۔ چچا کے انتقال پر ان کی خدمات کے صلے میں سرکار سے وارثوں کے لیے جو پنشن مقرر ہوئی اس میں غالب کے حصے میں سات سو روپے سالانہ آئے (اور جو 1857ء میں بند کر دیے گئے تھے)۔

تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی امراؤ بیگم کے ساتھ ہوگئی۔ جو دہلی کے ایک خاندانی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ شادی کے بعد مرزا غالب مستقل طور پر دہلی آ گئے اور مرزا نوشہ کہلائے۔ کہتے ہیں یہاں ان کا شمار دہلی کے خوبصورت اور وجیہہ نوجوانوں میں ہوا کرتا تھا۔

غالب کا آبائی پیشہ بیشک سپہ گری تھا لیکن ان کی تمام تر عزت اور مرتبہ کا ذریعے خامہ فرسائی ہی تھا۔ شعر گوئی کا شوق انہیں بچپن ہی سے تھا۔ اپنے وطن اکبر آباد میں انہوں نے گیارہ برس کی عمر میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ پہلے انہوں نے بیدلؔ کی طرز اپنائی۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں (خط بنام قدر بلگرامی)۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس تک کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔ (مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر)۔

غالب اکبر آباد سے دہلی تو آ گئے لیکن پنشن کے علاوہ ان کی آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ ویسے سوچا جائے تو یہ آمدنی اتنی ضرور تھی جس میں آسانی سے گذر بسر کی جا سکتی تھی۔ لیکن غالب کی پرورش اور ذہنی نشو و نما جس جاگیر دارانہ ماحول میں ہوئی تھی اس میں شاہ خرچی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ان موروثی اثرات کا یکلخت زائل ہونا ممکن نہ تھا۔ دوسری طرف ان کی بیوی امراؤ بیگم بھی الٰہی بخش جیسے فیاض نواب کی بیٹی تھیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں صرف پنشن پر گذر اوقات نہیں ہو سکتی تھی۔ شومئی قسمت سے غالب کے چھوٹے بھائی جنہیں وہ اپنے ساتھ دہلی لے آئے تھے اور عزیز رکھتے تھے، دیوانگی کے شکار ہوگئے اور ان کی ساری ذمے داریاں بھی غالب کے سر آ گئیں۔

مرزا غالب اپنی تنگدستی اور مفلسی سے نبرد آزما تھے۔ اسی اثناء میں انہیں یہ پتا چلا کہ گورنمنٹ نے ان کے خاندان کے لیے جو پنشن مقرر کرائی تھی وہ انہیں پوری نہیں ملتی لہٰذا کلکتہ جا کر پنشن کی بابت استغاثہ پیش کیا اور اس سلسلے میں تقریباً دو برس وہاں قیام بھی کیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

مرزا غالب کی خودداری، عزت نفس اور جاگیر دارانہ اقدار کے پاس ولحاظ کے ضمن میں ایک قصہ بہت مشہور ہے وہ یہ ہے کہ غالب کی علمی استعداد اور فارسی دانی کا شہرہ سن کر حکومتِ ہند کے سیکریٹری جیمس ٹامسن نے دلی کالج میں فارسی مدرس کی اسامی پر تقرر کی غرض سے انہیں طلب کیا۔ مرزا غالب پالکی میں سوار کر ان کی جائے قیام پر پہنچے اور اپنی آمد کی اطلاع کرائی تو ٹامسن نے فوراً ہی بلوالیا مگر یہ اس امید پر باہر ہی ٹھہرے رہے کہ صاحبِ موصوف خود ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔ جب ٹامسن کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ باہر آئے اور سمجھایا کہ اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں لہٰذا دربارِ گورنری والے سلوک کے مستحق نہیں، غالب نے کہا میں تو یہ سمجھا تھا کہ گورنمنٹ کی ملازمت میرے اعزاز و توقیر میں اضافے کا باعث ہوگی لیکن یہاں تو معاملہ ہی اس کے برعکس ہے، صاحب نے کہا "ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔" غالب نے معذرت کی، تو بندے کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر سو روپے ماہوار کی ایک بڑی آسامی سے دستکش ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔

مرزا غالب نے ایک ایسے دور میں زیست کی، جو سیاسی اعتبار سے تاریخ ہند کا بے حد نازک اور پر آشوب دور تھا۔ پورے ملک پر انگریزوں کا تسلط دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا اور عظیم مغلیہ سلطنت دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اپنے عہد کے ایک اہم شاعر اور علم و ادب کے قدر دان تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کو خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے کام پر معمور کیا۔ اور "نجم الدولہ"۔ "دبیر الملک"۔ "نظام جنگ" کے خطاب سے سرفراز کیا نیز ان کے لیے ماہوار مشاہرہ بھی مقرر کیا۔ اس تاریخ کا پہلا حصہ "مہر نیم روز" نام سے 1857ء میں منظر عام پر آیا۔ اسی سال شیخ ابراہیم ذوق کی وفات ہوئی جو بادشاہ کے اشعار کی اصلاح کیا کرتے تھے اور استاد شاہ کہلاتے تھے۔ ذوقؔ کے بعد یہ مرتبہ بھی مرزا غالب کو حاصل ہوگیا، لیکن مذکورہ تاریخ کا دوسرا حصہ جس کا نام غالبؔ نے "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا بدلتے

ہوئے سیاسی حالات میں لکھا نہیں جا سکا۔ اور پھر 1857ء کا انقلاب برپا ہو گیا جس نے عالم میں انتخاب شہر دہلی کو حالی کے لفظوں میں ''دہلی مرحوم'' بنا دیا۔ اس وقت غالب کی عمر ساٹھ برس تھی۔

اس انقلاب نے انہیں پے در پے کئی صدمات و مشکلات سے دوچار کیا۔ ایک تو بہادر شاہ کے دربار سے ملنے والا مشاہرہ بند ہو گیا۔ دوسرے شاہی دربار سے تعلق کی پاداش میں پنشن موقوف ہو گئی جس کے نتیجے میں انہیں بے انتہا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب انگریزی افواج کی فتح کے بعد شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو گھر میں بیوی کے جو زیورات اور خاندانی قیمتی اشیا تھیں وہ محفوظ مقام پر اس خیال سے دبا دی گئی تھیں کہ بعد میں کھود کر نکال لی جائیں گی مگر انہیں فتح یاب فوجیوں نے نکال لیا۔

ان ہی دنوں غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا اور غم زدہ غالب اس کے جنازے کو کاندھا بھی نہ دے سکے۔ اسی انقلاب کے دوران غالب کی اکلوتی بہن چھوٹی خانم کا بڑا بیٹا مرزا عاشور بیگ اپنے نوجوان بیٹے سمیت ایک انگریز کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ علاوہ ازیں بے شمار احباب و اقارب مارے گئے، چند ایک پھانسی پر چڑھا دیے گئے اور بہت سے دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ کوئی مونس و غم خوار نہ رہا۔

(عظیم شاعر مرزا غالب کے دو صد سالہ جشن ولادت کے موقعے پر شائع شدہ مختصر سوانح عمری کے ایک حصے کا اردو ترجمہ)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. 1857ء کے انقلاب کا غالب پر کیا اثر پڑا؟
2. غالب کے آخری ایام کس طرح سے گزرے؟

Philosophy, Education and Their Inter-Dependence 15.6

The inter-dependence of philosophy and education is clearly seen from the fact that the great philosophers of all times have also been great educators and their philosophy is reflected in their educational systems. This inter-dependence can be better understood by analyzing the implications of philosophical principles in the field of education. Before analyzing the educational implications of general philosophy, we should know the concept of "Philosophy" and "Education". Each one of us has a personal philosophy, which we apply consciously and unconsciously in our daily life. Each philosophy reflects a unique view of what is good and what is important. In this sense, philosophy is the system of beliefs about life. The literal meaning of philosophy is the love of wisdom which is derived from the Greek word "Philos" (Love) and "Sophia" (Wisdom). Wisdom does not merely mean knowledge. It is a continuous seeking of insight into basic realities - the physical world, life, mind, society, knowledge and values.

Education does not mean mere schooling. To become educated is to learn to become a person. Etymologically, 'education' is derived from "educare" which means 'to lead out' or "to draw out". In a broad sense, education refers to an act or experience that has a formative effect on the mind, character or physical ability of an individual. Education in this sense never ends, we truly learn from experience throughout our lives. Education and philosophy are inseparable because the ends of education are the ends of philosophy i.e. wisdom; and the means of philosophy is the means of education i.e. inquiry, which alone can lead to wisdom. Any separation of philosophy and education inhibits inquiry and frustrates wisdom.

Education involves both the world of ideas and the world of practical activity; good ideas can lead to good practice and good practices reinforce good ideas. In order to behave intelligently in the educational process, education needs direction and guidance, which philosophy can provide. Hence, philosophy is not only a professional tool for the educator but also a way of improving the quality of life because it helps us to gain a wider and deeper perspective on human existence and the world around us.

The chief task of philosophy is to determine what constitutes good life whereas the main task of education is how to make life worth living. So philosophy and education are mutually re-constructive. They give and take from each other. Philosophy deals with the goals and essentials of good life while education provides the means to achieve those goals of good life. In this sense philosophy of education is a distinct but not a separate discipline. It takes its contents from education and its methods from philosophy. The process of philosophizing about education requires an understanding of education and its problems. Hence, we can say that philosophy of education is the application of philosophical ideas to educational problems. It is not only a way of looking at ideas but also of how to use them in the best way. Therefore, it can be said that philosophy is the theory while education is the practice. Practice unguided by theory is aimless, inconsistent and inefficient just as theory which is not ultimately translatable into practice is useless and confusing. In the words of Ross "philosophy is the contemplative side while education is the active side". Philosophy deals with the ends while education deals with the means and techniques of achieving those means. Educational philosophy depends on formal philosophy, because most of the major problems of education are in fact philosophical problems. Like general philosophy, educational philosophy is speculative, prescriptive, critical or analytic.

(A part from the B.Ed. book entitled Education and Society published by IGNOU)

Check Your Progress

1. What is the literal meaning of philosophy?
2. What is the relation between philosophy and education?

15.7 Philosophy, Education and Their Inter-Dependence کا ترجمہ :

''فلسفہ، تعلیم اور ان کا باہمی انحصار''

فلسفے اور تعلیم کا باہمی انحصار اس حقیقت سے بالکل واضح ہوتا ہے کہ ہر زمانے کے عظیم فلسفی عظیم تعلیم و تربیت کار بھی رہے ہیں اور یہ فلسفے ان کے تعلیمی نظاموں میں منعکس ہوئے ہیں۔ اس باہمی انحصار کو ہم تعلیم کے میدان میں فلسفیانہ اصولوں کے ذیلی مفاہیم و اشارے کا تجزیہ کر کے بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ عمومی فلسفے کے تعلیمی ذیلی مفاہیم کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں ''فلسفے اور تعلیم'' کے تصور کا علم ہونا چاہیے۔ ہم میں سے ہر کسی کا ایک ذاتی فلسفہ ہوتا ہے۔ جس کا ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں شعوری یا لاشعوری طور پر اطلاق کرتے ہیں۔ ہر فلسفہ' کیا اچھا ہے اور کیا اہم ہے' کے غیر معمولی خیال کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح سے فلسفہ زندگی کے بارے میں عقائد کا نظام ہے۔ فلسفے کے لفظی معنی عقل و دانش سے محبت ہے' جو یونانی لفظ "Philos" (محبت)

اور "Sophia" (عقل و دانش) سے ماخوذ ہے۔ عقل و دانش سے مراد صرف علم ہی نہیں ہے۔ فلسفہ بنیادی حقیقتوں یعنی طبیعی دنیا' زندگی' دماغ و ذہن' معاشرہ' علم و معلومات اور اقدار میں بصیرت کی مسلسل تلاش کا عمل ہے۔

تعلیم سے مراد صرف اسکولی تعلیم و تربیت ہی نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا مطلب ایک شخص بننے کے لیے سیکھنا ہے۔ لفظ کی اصل یا مادے کی رو سے 'تعلیم' (Educare) سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی برآمد کرنے کے ہوتے ہیں۔ وسیع معنوں میں تعلیم سے مراد ایک عمل یا تجربہ ہوتا ہے' جو دماغ و ذہن' کردار یا فرد کی جسمانی اہلیت پر تشکیلی و تربیتی اثر رکھتا ہے۔ اس معنی میں تعلیم کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔ حقیقتاً ہم اپنی پوری زندگی اپنے تجربوں سے سیکھتے رہتے ہیں۔ تعلیم اور فلسفے کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ کیوں کہ تعلیم کے مقاصد فلسفے کے مقاصد یعنی عقل و دانش ہوتے ہیں اور فلسفے کا ذریعہ' تعلیم کا ذریعہ یعنی تحقیق و تفتیش ہیں جو واحد عقل و دانش تک رہنمائی کر سکتی ہے۔ فلسفے اور تعلیم میں کسی بھی طرح کی علاحدگی' تحقیق و تفتیش کے عمل میں حائل ہوتی ہے اور عقل و دانش کو ناکام بناتی ہے۔

تعلیم میں خیال و تصور کی اور عملی سرگرمی کی دونوں دنیائیں شامل ہوتی ہیں۔ اچھے تصورات و خیالات سے اچھی روایتیں شروع ہوتی ہیں اور اچھی روایتیں' اچھے خیالات و تصورات کو تقویت بخشتی ہیں۔ تعلیمی عمل میں ذہانت کے ساتھ برتاؤ کرنے کے لیے تعلیم کو سمت اور رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان ضرورتوں کی تکمیل فلسفے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا فلسفہ تعلیم و تربیت کار کے لیے نہ صرف پیشہ ورانہ آلہ ہوتا ہے' بلکہ معیارِ زندگی کو بہتر کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہوتا ہے' کیوں کہ اس سے انسانی وجود اور گردونواح کی دنیا کے بارے میں وسیع اور گہرا تناظر حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

فلسفے کا اہم ترین کام اس بات کا تعین کرنا ہوتا ہے کہ وہ کون سے تشکیلی اجزا ہیں' جو اچھی زندگی کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں' جب کہ تعلیم کا اہم کام یہ ہے کہ زندگی کو کس طرح سے قابلِ گزار (Worth-living) بنایا جائے۔ اس لیے فلسفہ اور تعلیم باہمی طور پر بازتعمیری (Re-constructive) ہوتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔ فلسفہ اچھی زندگی کے مقاصد اور بنیادی لوازمات سے بحث کرتا ہے۔ جب کہ تعلیم اچھی زندگی کے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ اس معنی میں تعلیم کا فلسفہ مختلف ہوتا ہے لیکن ایک علاحدہ شعبۂ علم نہیں ہوتا۔ بطور شعبۂ علم کے' تعلیم کا فلسفہ اپنا مواد تعلیم سے حاصل کرتا ہے اور اپنا طریقۂ کار فلسفے سے حاصل کرتا ہے۔ تعلیم کو فلسفیانہ رنگ میں رنگنے کا عمل تعلیم اور اس کے مسائل کی تفہیم کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کا فلسفہ' تعلیمی مسائل پر فلسفیانہ خیالات و تصورات کا اطلاق ہے۔ یہ نہ صرف خیالات و تصورات پر غور و فکر کرنے کا ایک زاویہ ہے' بلکہ انہیں بہترین طریقے سے استعمال کرنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فلسفہ نظریہ ہے جب کہ تعلیم عمل ہے۔ نظریے کی رہنمائی سے محروم عمل بالکل اسی طرح سے لایعنی' بے مقصد' غیر مستقل اور بے اثر ہوتا ہے' جیسے وہ نظریہ جو بالآخر عمل میں نہیں بدلا جا سکتا' بیکار اور حیران کن ہوتا ہے۔ بقول راس (Ross) ''فلسفہ ذکر و فکر کا پہلو ہے' جب کہ تعلیم سرگرم پہلو ہے''۔ فلسفہ' مقاصد سے بحث کرتا ہے' جب کہ تعلیم ذرائع اور انہیں حاصل کرنے کی تکنیک سے بحث کرتی ہے۔ تعلیمی فلسفے کا انحصار رسمی فلسفے پر ہوتا ہے کیوں کہ تعلیم کے بیشتر بڑے بڑے مسائل درحقیقت فلسفیانہ مسائل ہیں۔ عام فلسفے کی طرح تعلیمی فلسفہ قیاس آرائی اور روایت پر مبنی ہوتا ہے' نیز تنقیدی یا تجزیاتی ہوتا ہے۔

(اگنو کی شائع کردہ بی۔ ایڈ کتاب ''تعلیم اور معاشرہ'' کے ایک حصے کا اردو ترجمہ)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. کیا علمی ترجمے کی قسم میں فلسفے اور تعلیم کے ترجمے کو رکھا جا سکتا ہے؟
2. کیا علمی ترجمے کے دوران سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے؟

15.8 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کا انگریزی میں صحافتی بیان : "Let's Fight Terror Together"

Special Correspondent

New Delhi : Prime Minister Manmohan Singh on Thursday asked the members of the

South Asian Association for Regional Cooperation to fight terrorism together.

"We have a collective stake in ensuring peace and security in the SAARC region because no investor will come to this region if there is no assurance of peace and security," he said, inaugurating the first SAARC Business Leaders' Conclave here.

"To imagine that anyone of us can pursue what economists call 'beggar-thy-neighbour' policies and thereby prosper is to delude oneself," Dr. Singh said, underlining that the SAARC business community had a vital stake in regional security and in victory in the war on terror.

"We must join hand to put our collective house in order as peace in the region will benefit all. Terrorism anywhere will hurt us all," he said. Business and trade would flourish in a secure environment.

"Terrorism by whatever name, has no place in civilized societies and its basic goal is to cause insecurity," Dr. Singh said.

In an interconnected region and a globalised world, the consequences of both poverty and insecurity were indivisible. "No country in this region can be secure when others are insecure and no country can insulate itself from the consequences of poverty and terrorism in any other country."

As envisioned at the 13th SAARC summit, the member countries would forge stronger links on the basis of renewed people-to-people ties, to help strengthen the region-wide partnership for prosperity, he said.

The Prime Minister allayed fears that free trade agreement could hurt smaller countries and called upon the SAARC leaders to move rapidly to meet the deadline for the South Asian Free Trade Agreement (SAFTA).

Dr. Singh said the need for implementing SAFTA could not be overemphasized. It was expected that its implementation would enhance trade in the region to $ 14 billion from $ 6 billion in the next two years.

Citing the high growth of bilateral trade between India and Sri Lanka, he said it dispelled fears on both sides that free trade would hurt business in smaller countries.

"This free trade agreement is a win-win agreement for both the countries and could be a model for similar agreements in the region," he said.

The Prime Minister hoped that the free trade agreement would help move towards the eventual goal of the South Asian Economic Union. "I do believe that just as regional integration is not antithetical to globalisation, it also does not hurt the broader interest of any member of a regional group."

Dr. Singh said all the member states were committed to an early resolution of outstanding issues under SAFTA and hoped that the ongoing negotiations would ensure that it was operationalised from January 1 next.

He also focused on the need for expanding the ambit of SAFTA to include trade in services, in addition to widening the scope of trade in goods, for it to emerge as an effective vehicle for growth and regional integration.

Voicing his concern that SAARC had not succeeded in exploiting the immense economic potential of the region, he said that even after two decades, "Intra-SAARC exports are a mere five per cent of the total exports of the region. By comparison intra-E.U. exports are 55.2 per cent, intra-NAFTA exports are 51.7 per cent and intra-ASEAN exports are 20.4 per cent."

Noting that misgivings among corporate entities in each of the member-countries were not rooted in reality and spread out among businessmen, the Prime Minister said change required adaptation and movement from status quo.

Dr. Singh laid emphasis on stepping up investments in the region to build infrastructure and said that as a first step, India had on a reciprocal basis announced measures to move towards an open skies regime and was working for greater liberalization of the visa regime to benefit all areas of cooperative interaction.

India decided to increase the number of visas to leading businessmen of SAARC states, he said and urged the member-nations to extend transit facilities to third countries. This would help to connect the region to the ongoing economic miracle in Southeast and East Asia.

He termed the recent SAARC summit in Dhaka a milestone, saying it showed the continuing relevance of the group.

(A statement of Prime Minister Dr. Manmohan Singh given on the occasion of SAARC summit published in The Hindu on 18-11-2005)

Check Your Progress

1. What is the full form of SAARC and SAFTA?
2. What is the crux of Prime Ministre's press statement?

15.9 وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے صحافتی بیان کا ترجمہ ''اب ہم دہشت کا مقابلہ مل جل کر کریں''

خصوصی نامہ نگار

نئی دہلی: جمعرات کو وزیراعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے سارک کے ممبروں سے ایک ساتھ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے کہا۔

انہوں نے سارک ملکوں کے کاروباری قائدین کے پہلے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ'' سارک ممالک میں امن و آشتی اور تحفظ کو یقینی بنانے میں ہمارا اجتماعی مفاد ہے' کیوں کہ اگر امن و آشتی اور تحفظ کی یقینی صورت حال نہیں پیدا ہوئی تو سرمایہ کار اس خطے میں سرمایہ کاری نہیں کریں گے۔''

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ یہ تصور کرنا کہ ہم میں سے کوئی بھی 'خودغرضانہ' (Beggar-thy-neighbour) پالیسیاں اپنا سکتا ہے اور ان کے ذریعے پھل پھول سکتا ہے تو یہ سوچ اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے مترادف ہوگی۔ ڈاکٹر سنگھ نے زور ڈالتے ہوئے مزید یہ کہا کہ علاقائی تحفظ اور دہشت کے خلاف جنگ میں کامیابی میں سارک ممالک کی کاروباری برادری کا بھاری مفاد ہے۔

''ہمیں اپنے اجتماعی گھر کو منظم کرنے کے لیے آپس میں ضرور ہاتھ ملانا چاہیے' کیوں کہ اس خطے میں امن و آشتی سے ہم تمام کو فائدہ پہنچے گا۔ انہوں نے کہا کہ جہاں کہیں بھی دہشت گردی ہو اس سے ہم تمام کو نقصان پہنچے گا۔'' کاروبار اور تجارت کا فروغ محفوظ ماحول میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ'' دہشت گردی کو جو بھی نام دیں مہذب معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے اور اس کا بنیادی مقصد معاشرے میں عدم

تحفظ کا احساس پیدا کرنا ہوتا ہے۔'' ایک باہم مربوط خطے اور عالمگیر دنیا میں غربت اور عدم تحفظ دونوں کے نتائج قابل تقسیم نہیں ہیں۔'' اس خطے میں کوئی بھی ملک اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک کہ دوسرے ممالک عدم تحفظ کے شکار ہوں گے اور کوئی بھی ملک دوسرے ملک میں برپا غربت اور دہشت گردی سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔''

انہوں نے کہا کہ تیرھویں چوٹی کانفرنس میں جیسا کہ وژن تیار کیا گیا تھا کہ سارک ممالک ترقی اور خوش حالی کی خاطر پورے خطے میں باہمی شراکت کو مضبوط کرنے کے لیے اس پورے خطے کے عوام کے درمیان نئے رشتوں کی بنیاد پر مضبوط تعلقات قائم کریں گے۔

وزیراعظم نے اس خدشے کو دور کیا کہ کھلی تجارت کے معاہدے سے خطے کے چھوٹے ملکوں کو نقصان پہنچے گا اور سارک کے قائدین سے جنوبی ایشیائی کھلی تجارت کے معاہدہ (South Asian Free Trade Agreement - SAFTA) کو مقررہ وقت کے اندر اندر مکمل کرنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ SAFTA کے نفاذ پر ضرورت سے زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی ضرورت و اہمیت جگ ظاہر ہے۔ اس بات کی توقع ہے کہ SAFTA کے نفاذ سے آئندہ دو برسوں کے دوران تجارت میں 6 بلین ڈالر سے 14 بلین ڈالر کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہندوستان اور سری لنکا کے درمیان باہمی تجارت کی بہت زیادہ ترقی کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس حقیقت سے دونوں ملکوں میں پائے جارہے اس خدشے ' کہ کھلی تجارت سے چھوٹے ملکوں میں کاروبار کو نقصان پہنچے گا' کا ازالہ ہو پائے گا۔

انہوں نے کہا کہ '' کھلی تجارت کا یہ معاہدہ دونوں ملکوں کے لیے یکساں طور پر فائدے مند ہوگا اور جو اس خطے میں اسی طرح کے معاہدوں کے لیے نمونے کا کام کرسکے گا۔''

وزیراعظم نے توقع ظاہر کی کہ کھلی تجارت کا معاہدہ جنوبی ایشیائی معاشی یونین (South Asian Economic Union) کے حتمی مقصد کی طرف گامزن ہونے میں مدد کرے گا۔ وزیراعظم نے کہا کہ '' مجھے پورا یقین ہے کہ ٹھیک جس طرح سے علاقائی ارتباط (Regional Integration) عالم کاری (Globlisation) کے برخلاف نہیں ہے' اسی طرح سے ایک علاقائی گروپ کے کسی ممبر کے وسیع مفادات کو اس سے نقصان بھی نہیں پہنچتا۔''

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ SAFTA کے تحت تمام ممبر ممالک اہم مسائل کے فوری حل کے لیے پابند ہیں اور توقع ظاہر کی کہ معاہدے کے لیے جاری گفت وشنید اس بات کو یقینی بنائے گی کہ آئندہ جنوری سے اس پر عمل آوری ہوسکے۔

انہوں نے ساز وسامان کی تجارت کے دائرے کو وسیع کرنے کے علاوہ خدمات کی تجارت کو شامل کرنے کے لیے ''جنوبی ایشیائی کھلی تجارت کے معاہدے'' (SAFTA) کے دائرے کو وسیع کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا' تاکہ نشوونما و ترقی اور علاقائی ارتباط کے لیے SAFTA ایک موثر ذریعے کے طور پر منظر عام پر آئے۔

اس بات پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہ سارک علاقے کی غضب کی معاشی مضمر قوتوں کا استعمال کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے' انہوں نے کہا کہ دو دہوں کے بعد بھی '' سارک ملکوں کے درمیان برآمدات' علاقے کی بحیثیت مجموعی برآمدات کا صرف پانچ فیصد ہے۔ اس کے مقابلے میں یوروپین یونین کے ملکوں کے درمیان برآمدات 55.2% ہے' شمال امریکی کھلی تجارت معاہدہ (North American Free Trade Agreement - NAFTA) کے ملکوں کے درمیان 51.7% ہے اور اسوسی ایشن برائے جنوبی شمالی ایشیائی ممالک (Association for Southeast Asian Nations - ASEAN) کے درمیان برآمدات 20.4% ہے۔''

اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ ممبر ملکوں کے کاروباری اجتماعی اداروں اور کاروباریوں میں پھیلی ہوئی بدگمانیاں بے بنیاد ہیں' وزیراعظم نے کہا کہ حسب ضرورت تبدیلی اور موجودہ صورت حال سے نکل کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سنگھ نے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے علاقے میں سرمایہ کاری بڑھانے پر کافی زور دیا اور کہا کہ ابتدائی قدم کے طور پر ہندوستان نے کھلے آسمان کے نظام (Open Skies Regime) کی طرف گامزن ہونے کے لیے باہمی تعاون کی بنیاد پر اقدامات کا اعلان کیا ہے۔ اور باہمی تعاون کے تمام تعاملی میدانوں کے فائدے کے لیے ویزا نظام (Visa Regime) کے وسیع کھلے پن کے لیے کام کررہا ہے۔

انہوں نے کہا کہ ہندوستان نے سارک ممالک کے اہم کاروباریوں کے لیے ویزوں کی تعداد میں اضافے کا فیصلہ کیا ہے اور تیسرے ممالک کے لیے نقل وحرکت کی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ممبر ممالک سے گزارش کی ہے۔ اس سے جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا میں جاری حیرت انگیز معاشی ترقیوں سے اس خطے کو جوڑنے میں مدد ملے گی۔

انہوں نے حال ہی میں ڈھاکہ میں منعقد سارک چوٹی کانفرنس کو میل کے پتھر کے طور پر تصور کیا' کیوں کہ سارک نے مسلسل اپنی معنویت و افادیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. صحافتی ترجمے کے دوران ترجمے کی کس تکنیک کا عموماً سہارا لیا جاتا ہے؟
2. صحافتی ترجمے میں مفہوم اور وقت کی کیا اہمیت ہے؟

15.10 मौलाना मुहम्मद अमीन : تزکِ جہانگیری کے ہندی ترجمے کا ایک حصہ

मौलाना मुहम्मद अमीन

सव्वाल मास की १ तारीख को मैं मौलाना मुहम्मद अमीन से भेंट करने गया वह शेख महमूद कमानगर (धनुष निर्माता) का एक शिष्य था। शेख महमूद अपने समय का एक महापुरूष था। बादशाह हुमायूं उस पर पूरा भरोसा करता था। यहां तक कि वह महमूद के हाथ धुलाया करता था। उपरोक्त मौलना का स्वभाव उत्तम है। सांसारिक मामलों में व्यस्त रहने पर भी उसका ढंग फकीरों जैसा है। उसकी संगति में मुझे बड़ा आनन्द आया। मैंने उससे कहा कि मेरे मन में कुछ व्यथायें घुसी हुई हैं। मैंने उसकी नेक सलाह और अनुकूल शब्द सुने जिससे मेरे हृदय को बड़ी सांत्वना प्राप्त हुई। मैंने निर्वाह के लिए उसको १000 बीघा भूमि और १हजार नकद देकर उससे विदा ली ।

आगरे की ओर - रविवार को जब एक पहर व्यतीत हो चुका था तो मैं लाहौर से आगरे के लिए रवाना हुआ। मैंने किलिच खां को सूबादार, मीर कलामुद्दीन को दीवान, शेख युसुफ को बख्शी और जमालुद्दीन को कोतवाल नियुक्त किया और प्रत्येक को उसके पदानुकूल खिलअत दी । फिर मैं अपने इष्ट मार्ग की ओर चला। २७ तारीख को सुल्तानपुर के पास नदी पार करके मैं २ कोस आगे जाकर नकोदर ठहरा। मेरे पूज्य पिता ने अबुलफजल को २० हजार रूपये का सोना देकर आदेश दिया था कि इन दो परगनों के बीच एक बांध बनाकर जल प्रपात बनाया जावे। वास्तव में वहां ठहरने का स्थान मझे अत्यन्त सुखद प्रतीत हुआ। मैंने नकोदर के जागीरदार मुइजुल-मुल्क को आदेश दिया कि वहां एक इमारत खड़ी की जाय और इस बांध के

एक ओर बाग लगाया जावे। जिसे देखकर आने-जाने वाले लोग प्रसन्न हो जाएं। रविवार १० जीकदा बजीर-उल-मुल्क जो मेरे राज्याभिषेक से पहले मेरा सेवक था और मेरे लवाजमे का दीवान था अजीर्ण रोग से मर गया। उसके जीवन के अन्तिम समय में उसके एक भाग्यहीन पुत्र हुआ। उसके जन्म के ४० दिन बाद ही उसके माता पिता की मृत्यु हो गई। और वह स्वयं भी २,३ वर्ष का होकर मर गया। मुझे विचार आया कि वजीर उल-मुल्क का खानदान समूल नष्ट नहीं होना चाहिए। मैंने उसके भाई मन्सूर को एक पद प्रदान किया। वास्तव में उसने मेरे प्रति कोई प्रेम प्रकट नहीं किया।

शेर का शिकार - सोमवार तारीख १४ को मैंने मार्ग में सुना कि पानीपत ओर कर्नाल के बीच में दो ऐसे शेर हैं जो यात्रियों को बड़ा दुख देते हैं। मैंने हाथी रवाना किये। जब मैं उन शेरों के स्थान पर पहुँचा तो एक हथनी पर सवार हुआ और आदेश दिया गयाकि हाथियों द्वारा शेर को घेरकर कमारगाह बना दिया जावे। अल्लाह के अनुग्रह से मैंने दोनों शेरों को बन्दूक से मार डाला और इस प्रकार दोनों शेरों को जिन्होंने अल्लाह के बन्दों का मार्ग बन्द कर रखा था समाप्त कर दिया।

दिल्ली में - बृहस्पतिवार तारीख १८ को मैंने दिल्ली में उस स्थान पर ठहरा जो सलीम खां अफगान ने अपने शासनकाल में बनाया था। यह जमुना नदी के बीच में बना हुआ है और सलीमगढ़ कहलाता है। मेरे पूज्य पिता ने यह स्थान मुर्तेजाखां को दे दिया था। जो पहले दिल्ली का ही निवासी था। इस खान ने नदी के तट पर एक चबूतरा बनाया था जो अत्यन्त सुखद और रमणीय प्रतीत था। इस इमारत के नीचे जल के समीप एक चबूतरा या चौखण्डी बनी हुई थी, जिसमें हूमायूं के आदेश से चमकदार और चिकने टाइल लगे हुये थे। ऐसे सुखद वायु वाले स्थान बहुत कम थे। जिन दिनों में स्वर्गीय हुमायूं दिल्ली को सुशोभित करता था तो वहां वह अपने घनिष्ठ मित्रों के साथ जाया करता था और अपने दरबारियों में बैठा करता था। मैंने यहां अपने दरबारियों और मित्रों के साथ ४ दिन व्यतीत किये और मद्य गोष्ठियां की। मोअज्जम खां ने जो दिल्ली को फौजदार था भेंटे प्रस्तुत की। जागीरदार और नागरिक भी भेंटे लाये। मैं पालम के परगने में कमारगाह बनवाकर शिकार करना चाहता था। पालम दिल्ली के निकट है। परन्तु मुझसे कहा गया कि आगरे में प्रवेश करने का समय सन्निकट है। और ऐसा शुभ मुर्हूत दुबारा शीघ्र आने वाला नही है इसलिए मैंने शिकार का इरादा त्याग दिया और एक नाव में बैठकर आगरे के लिए रवाना हो गया इस मास की २० तारीख को चार लड़के तीन लड़कियां जो मिर्जा शाहरूख के थे लाये गये। शाहरूख ने मेरे पिता से इन बच्चों का उल्लेख नहीं किया था। मैंने लड़कों को अपने विश्वसनीय सेवकों के सुपुर्द कर दिया और लड़कियों को अन्तपुर की दासियों के हवाले करके आदेश दिया कि उनकी भली-भांति संभाल की जावे। २१ जीकदा को राजा मानसिंह रोहतास के दुर्ग से मेरे पास आया। यह दुर्ग पटना और बिहार के प्रान्त में है। मानसिंह को मैंने छः सात बार बुलाया तब आया।

मानसिंह भी खान आज़म की भांति एक मिथ्याचारी है और इस राज्य के पुराने भक्षकों में गिना जाता है। इन लोगों ने मेरे साथ क्या किया है और मैंने उनके साथ क्या किया है। इसकों ईश्वर ही जानता है क्योंकि वही सब भेदों का ज्ञाता है। शायद ऐसा दृष्टांत दूसरा नहीं मिलेगा। १०० हाथी मेरे भेंट किये जिनमें एक भी ऐसा नहीं था जो शाही तबेले में रखा जा सके। इस राजा पर मेरे पिता की बड़ी कृपा थी इसलिए मैंने उसके सामने उसके अपराधों का उल्लेख नहीं किया और उसकी पदोन्नति की।

15.11 ''مولانا محمد امین'' کے زیرعنوان ہندی متن کا ترجمہ

یکم شوال کو میں مولانا محمد امین سے ملاقات کرنے گیا وہ محمود کمان گر کا شاگرد تھا۔ شیخ محمود اپنے وقت کا ایک عظیم شخص تھا۔ بادشاہ ہمایوں اس پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ محمود کے ہاتھ دھلایا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا مولانا کا مزاج بہت اچھا ہے۔ دنیاوی معاملات میں مصروف رہنے کے باوجود بھی اس کا ڈھنگ فقیروں جیسا ہے۔ اس کی صحبت میں مجھے بڑا لطف آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے من میں کچھ پریشانیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے اس کی نیک صلاح اور موافق باتیں سنی۔ جس سے میرے دل کو کافی راحت ملی۔ میں نے گزر بسر کے لیے اس کو ایک ہزار بیگھا زمین اور ایک ہزار نقد دے کر اس سے وداع لی۔

آگرے کی سمت۔ اتوار کو جب ایک پہر گزر چکا تھا تو میں لاہور سے آگرے کے لیے روانہ ہوا۔ میں نے قلیچ خاں کو صوبیدار، میر کلام الدین کو دیوان، شیخ یوسف کو بخشی اور جمال الدین کو کوتوال مقرر کیا اور ہر ایک کو اس کے عہدے کے مطابق خلعت دی۔ پھر میں اپنے مطلوبہ راستے پر چل پڑا۔ 25 تاریخ کو سلطان پور کے پاس ندی پار کرکے میں نے دو کوس آگے جا کر نکودر میں قیام کیا۔ میرے والد بزرگوار نے ابوالفضل کو بیس ہزار روپے کا سونا دے کر حکم دیا تھا کہ ان دو پرگنوں کے بیچ ایک باندھ بنا کر پانی دستیاب کرایا جائے۔ حقیقت میں وہاں ٹھہرنے کی جگہ مجھے بہت زیادہ راحت بخش لگی۔ میں نے نکودر کے جاگیردار معز الملک کو حکم دیا کہ وہاں ایک عمارت کھڑی جائے اور اس باندھ کے ایک طرف باغ لگایا جائے۔ جسے دیکھ کر آنے جانے والے لوگ خوش ہو جائیں۔ اتوار 10 ذیقعدہ کو وزیرالملک، جو میری تخت نشینی سے پہلے میرا خدمتگار تھا اور میرے لوازمے کا دیوان تھا، بدہضمی سے مر گیا۔ اس کی زندگی کے آخری وقت میں اس کے ایک بدقسمت بیٹا پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے چالیس دن بعد ہی اس کی والدہ اور والد کی موت ہوگئی اور وہ خود بھی دو تین سال کا ہو کر مر گیا۔ مجھے خیال آیا کہ وزیرالملک کا خاندان پوری طرح سے تباہ و برباد نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اس کے بھائی منصور کو ایک عہدے پر فائز کیا۔ حقیقت میں اس نے میرے لیے کوئی محبت نہیں جتائی۔

شیر کا شکار۔ دوشنبہ 14 تاریخ کو میں نے راستے میں سنا کہ پانی پت اور کرنال کے بیچ میں دو ایسے شیر ہیں جو مسافروں کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں نے ہاتھی روانہ کیے۔ جب میں ان شیروں کی جگہ پر پہنچا تو ایک ہتھنی پر سوار ہوا اور حکم دیا کہ ہاتھیوں کے ذریعے شیر کو گھیر کر قمرغہ بنا دیا جائے۔ اللہ کے رحم و کرم سے دونوں شیروں کو بندوق سے مار ڈالا اور اس طرح سے دونوں شیروں کو، جنہوں نے اللہ کے بندوں کا راستہ بند کر رکھا تھا، ختم کر دیا۔

دلی میں۔ بدھ وار 18 تاریخ کو میں نے دلی میں اس مقام پر قیام کیا، جسے سلیم خاں افغان نے اپنے دور حکومت میں بنایا تھا۔ یہ جمنا ندی کے بیچ واقع ہے اور سلیم گڑھ کہلاتا ہے۔ میرے والد بزرگوار نے یہ مقام مرتضیٰ خان کو دے دیا تھا، جو پہلے دہلی کا ہی رہنے والا تھا۔ اس خان نے ندی کے کنارے پر ایک چبوترہ بنایا تھا، جو بے حد راحت بخش تھا اور دلکش لگتا تھا۔ اس عمارت کے نیچے پانی کے نزدیک ایک چبوترہ بنایا ہوا تھا، جس میں ہمایوں کے حکم سے چمکدار اور چکنے ٹائل لگے ہوئے تھے۔ ایسے خوشگوار ہوادار مقام بہت کم تھے، جن دنوں میں جنت مکانی ہمایوں دلی میں رونق افروز تھے تو وہاں وہ اپنے عزیز دوستوں کے ساتھ جایا کرتے تھے اور اپنے درباریوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے یہاں اپنے درباریوں اور دوستوں کے ساتھ چار دن گزارے اور محفلِ شراب نوشی آراستہ کی۔ معظم خاں نے جو دلی کا فوجدار تھا تحائف پیش کیے۔ جاگیرداروں اور رعایا نے بھی تحفے پیش کیے۔ میں پالم کے پرگنے میں قمرغہ بنوا کر

شکار کرنا چاہتا تھا۔ پالم دلی کے نزدیک ہے لیکن مجھ سے کہا گیا کہ آگرے میں داخل ہونے کا وقت عنقریب ہے اور ایسی نیک ساعت دوبارہ جلدی آنے والی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے شکار کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک کشتی میں بیٹھ کر آگرے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسی مہینے کی 20 تاریخ کو چار لڑکے اور تین لڑکیاں جو مرزا شاہ رُخ کے تھے لائے گئے۔ شاہ رخ نے میرے والد سے ان بچوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے لڑکوں کو اپنے بھروسے مند خادموں کے سپرد کر دیا اور لڑکیوں کو حرم کی باندیوں کے حوالے کر کے حکم دیا کہ ان کی اچھی طرح دیکھ ریکھ کی جائے۔ 21 ذیقعدہ کو راجہ مان سنگھ روہتاس کے قلعے سے میرے پاس آیا۔ یہ قلعہ پٹنہ اور بہار کے صوبے میں ہے۔ مان سنگھ کو میں نے چھ سات بار بلایا تب وہ آیا۔ مان سنگھ بھی خان اعظم کی طرح دھوکے باز تھا اور اس صوبے کے پرانے بدخواہوں میں گنا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے اور میں نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔ کیوں کہ وہی سبھی بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ شاید ایسی نظیر دوسری نہیں ملے گی۔ سو (100) ہاتھی مجھے پیش کیے گئے' جن میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے شاہی اصطبل میں رکھا جا سکے۔ اس راجہ پر میرے والد کی کافی مہربانی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے سامنے اس کے جرموں کو بیان نہیں کیا اور اس کے منصب کو بڑھایا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنا کیوں آسان ہے؟
2. ہندی اور اردو میں دو سب سے بڑی مماثلتیں کیا ہیں؟

15.12 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے چار مختلف قسم کے موضوعات سے انگریزی متون کے تراجم کا مطالعہ کیا اس کے علاوہ ایک ہندی متن کا بھی آپ نے مطالعہ کیا۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہاں آپ کو لفظی ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور کہاں بامحاورہ ترجمہ کرنا پڑتا ہے اور کہاں آزاد ترجمے کی تکنیک کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظی' بامحاورہ اور آزاد ترجمے کی تینوں تکنیکوں کا استعمال ہر قسم کے متن کے ترجمے کے دوران ہوتا ہے۔ لیکن اگر علمی ترجمہ ہو تو غالب تکنیک لفظی تکنیک ہوگی۔ اور اگر ادبی ترجمہ کر رہے ہیں تو بامحاورہ ترجمے کی تکنیک استعمال ہوگی۔ اور اگر صحافتی ترجمہ کر رہے ہیں تو آزاد ترجمے کی تکنیک استعمال ہوگی۔

آخر میں ہندی کا ایک تفصیلی اقتباس دیا گیا ہے۔ جس کے مطالعے کے دوران آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہندی کے متن اور اردو ترجمے میں بہت زیادہ فرق نہیں دکھائی دیتا۔ کیوں کہ دونوں زبانوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ بالخصوص دونوں زبانوں کی نحوی ساخت کم و بیش ایک جیسی ہے اور دونوں کی لفظیات بھی مشترکہ ہیں۔ تیسری مماثلت یہ ہے کہ دونوں زبانیں آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور دونوں کی پیدائش کے علاقے ایک ہیں اور عہد بھی ایک ہی ہے۔ نیز دونوں کے تہذیبی عناصر میں بھی کچھ نہ کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ جن کے باوصف ہندی سے اردو میں ترجمہ کرنا بامقابل دیگر زبانوں کے کافی آسان ہے۔

15.13 نمونہ امتحانی سوالات (نوٹ: سالانہ امتحان میں انگریزی اور ہندی کے اقتباسات اردو میں ترجمے کے لیے دیے جا سکتے ہیں)

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اپنی پسند کی کسی انگریزی کہانی کا اردو میں ترجمہ کیجیے
2. اخبار کے کسی کالم کا اردو میں ترجمہ کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔